رنگ محل

بار اوّل	۱۹۶۰ء
تعداد	۱۱۰۰
قیمت	چھ روپے

ناشر

ظفر ادیب

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دلّی

علی منزل۔ کوچہ پنڈت

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

الہ آباد پریس دہلی

رنگ محل

صمیرہ سلطان

مَعنونْ

دِلّیٔ مرحوم کے نام

پیش لفظ

آپ بیتی کہنے، جگ بیتی سُننے اور دہرانے کا شوق انسان کو اُسی وقت ہوا، جب اُس نے ہوش سنبھالا اور شعور حاصل کیا۔ اس شوق کو جنم دینے میں جاننے اور بتانے کا جذبہ بھی تھا۔ اسی سے قصّہ گوئی کی ابتدا ہوئی اور بعد میں نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی گئیں۔ جب تک انسان نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا، یہ قصّے خواہ نثر میں تھے یا نظم میں، زبانی دہرائے جاتے تھے۔ اور اسی طرح ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی کو منتقل ہو جاتے تھے لیکن لکھنا اور پڑھنا سیکھنے کے بعد انسان نے ان قصّوں کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا جو اسے اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملے تھے۔ جیسے جیسے انسان کا شعور ترقی کرتا گیا قصّہ گوئی کے طریقوں میں تراش و خراش شروع ہوئی اور نئے نئے طریقے پیدا ہوتے گئے۔ اس تبدیلی نے قصّوں، کہانیوں، حکایتوں، داستانوں، ناولوں اور مختصر افسانوں کا فن پیدا کیا۔ ان میں سے قصّہ گوئی کا سب سے مکمل فن ناول کو کہا جا سکتا ہے۔

اردو میں سب سے پہلی کہانی انشاء اللہ خاں انشاؔ نے "رانی کیتکی" لکھی۔ اس کے بعد لکھنؤ اور فورٹ ولیم میں قصّے لکھے گئے یا دوسری زبانوں سے ترجمے کئے گئے۔ یہ اردو ادب کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے بعد قصّہ گوئی ترقی کرتی ہوئی موجودہ افسانوں تک پہنچی۔

اردو افسانوں کو آج دُنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان کے افسانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ کہ اگر دوسری زبانوں کے افسانوں سے بہتر نہیں تو کمتر بھی کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ کم سے کم ایک درجن اردو افسانہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے فن اور تکنیک میں نئے نئے تجربے کئے ہیں اور ان کی تخلیقات سے اردو ادب مالا مال ہے۔ ان کے نام دُنیا کے بڑے افسانہ نگاروں کے ساتھ لئے

جا سکتے ہیں۔ اگر ان کی تخلیقات کا ترجمہ دُنیا کی دوسری زبانوں میں ہو جائے تو پھر عالمی ادب میں اُن کی قیمت مقرر ہو سکتی ہے۔ البتہ اردو کے جو افسانے اب تک ملکی یا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں وہ بے حد مقبول ہوئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ افسانہ نگاروں کی نئی پود بھی افسانوی ادب میں قابلِ قدر اضافہ کر رہی ہے اور اچھے افسانوں کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اردو ناول نگاری اب تک کم و بیش اسی نقطے کے گرد گھوم رہی ہے، جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ حالانکہ اردو میں ناول نویسی پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس کے اسباب کیا ہیں، اس پر ایک طویل بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اردو ناول نویسی کا آغاز بُرا نہیں تھا بلکہ بعد میں یہ زوال پذیر ہوئی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ حالانکہ کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں جنھوں نے صرف ناول لکھنا ہی اپنا ادبی مشغلہ بنا لیا ہے۔ اور برابر لکھ رہے ہیں لیکن اب تک کوئی ایسا ناول نہیں لکھا جا سکا جسے قابلِ قدر اضافہ کہا جا سکے۔

اردو میں سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ناول لکھے۔ جو اس وقت بے حد مقبول ہوئے۔ ناول کے ابتدائی نمونوں کے طور پر ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ان کے ناولوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی دلّی کی بڑی اچھی تصویریں ملتی ہیں۔ ان ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا پتہ بھی چلتا ہے، جن میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان مبتلا تھے۔ لیکن نذیر احمد کا مقصد ناول نویسی کے فن کو ترقی دینے سے زیادہ مسلمانوں کی اصلاح تھا۔ وہ مسلمانوں سے ان برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے جو اُن میں پیدا ہو گئی تھیں اور ان خطرات کی طرف سے متنبہ کرنا چاہتے تھے، جن کا انھیں اندیشہ تھا۔ نذیر احمد بہت اچھے واعظ بھی تھے۔ اور ان کے نزدیک ناول لکھنا بھی ایک وعظ کے برابر تھا۔ اگر ان کا اصلاحی نقطۂ نظر ان کے فن پر حاوی نہ ہو جاتا تو ان کے ناولوں کی جگہ ادب میں اور بھی اونچی ہوتی۔ پھر بھی

نصوح، کلیم اور ظاہر دار بیگ کے کردار اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ تینوں کردار دراصل اس وقت کے تین نمائندے ہیں۔ اگر نذیر احمد کے کردار وعظ کے بوجھ تلے نہ دبے ہوتے تو اور بھی زیادہ جاندار ہوتے۔ پھر بھی اردو ادب کی تاریخ میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اور وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

نذیر احمد کے بعد ناول نویسی اور بھی رو بہ انحطاط ہوئی۔ بعد کے ناول نگاروں نے سماجی حالات اور ان سے مرتب ہونے والے اثرات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ نذیر احمد کی قائم کی ہوئی روایت کو بھی باقی رکھتے تو یہ فن اس طرح زوال کا شکار نہ ہوتا۔ بعد کے ناول لکھنے والوں نے صرف عشق و محبت کو ناول کا موضوع بنایا۔ اور ناول صرف "محبت کی کہانی" کا نام پڑ گیا۔ اس کا مقصد ذہنی تعیش سمجھا جانے لگا۔ اور یہ گراوٹ اس حد تک پہنچی کہ اور تو اور عبدالحلیم شرر بھی اس سے نہ بچ سکے۔ جنہوں نے سر والٹر اسکاٹ کی پیروی میں تاریخی ناول لکھے۔ اور اسلامی تاریخ کو ناولوں میں پیش کرنا اپنی ساری کاوشوں کا مقصد قرار دیا تھا۔ شرر کے ناول کہنے کو تو تاریخی ہیں، اور ان کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ ان کے کرداروں کے نام بھی اسلامی تاریخ سے لئے گئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سارے کردار محبت کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں ان کرداروں کا جو بھی رول رہا ہے اس کا ذکر بھی کم ہے۔ اور اس کا وزن بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" ایسا ضرور ہے جو توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس میں ایک اچھے ناول کے سارے عناصر ترکیبی موجود ہیں۔ لیکن بعد کے لکھنے والوں نے اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور ناول نویسی عشق و محبت کی کہانی کے گرد چکر لگاتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے تک بڑے بوڑھے اس کا خیال رکھتے تھے کہ ان کے گھروں میں ناول نہ پڑھے جائیں۔ اس کی اچھائی

اور بُرائی سے بحث نہیں۔ واقعہ یہی ہے۔

منشی پریم چند نے اردو ناول نویسی کو حقیقت نگاری کی طرف لانے کی کوشش کی اور یہ بھی سچ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں انھوں نے اچھے ناول لکھے۔ لیکن ان کے ناولوں کو بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے بعد کے لکھنے والوں نے جن میں بعض مشہور اہلِ قلم شامل ہیں، ناول لکھے تو ضرور، لیکن ان میں کوئی بھی قابلِ ذکر نہیں ہے۔

موجودہ دَور کو اردو ناول نویسی کا تاریک ترین دَور کہا جا سکتا ہے۔ جب ناول کے نام پر بہت سی گندگیاں ادب میں داخل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جاسوسی، رومانی، تاریخی اور نہ جانے ناولوں کے کون کون سے سلسلے شائع ہو کر مقبول ہو رہے ہیں۔ ان سارے سلسلوں کا مقصد ادب میں اضافہ نہیں، بلکہ نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنا اور روپیہ کمانا ہے۔ اِن ناولوں کا شمار بھی کرنا ناول کے فن کے ساتھ ظلم ہے۔ ناولوں کے یہ تجارتی سلسلے اردو ادب کے جسم پر برص کے داغ کی طرح نمایاں رہیں گے۔

کچھ خواتین نے بھی اچھے معاشرتی ناول لکھے۔ اس سلسلے کی اہم ترین کڑی حمیدہ سلطان کا ناول "رنگ محل" ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے "ثروت آرا" لکھا تھا جس نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اور اب تک لوگوں کی یادوں میں محفوظ ہے۔ حمیدہ سلطان اب ناول نگار سے زیادہ اردو کی بے لوث خدمت گزار کی حیثیت سے مشہور ہیں اور اب لوگ انھیں اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔

"رنگ محل" دراصل ان کی یادوں کے نقوش ہیں۔ خالص فنی لحاظ سے یہ ناول ہمارے تقاضوں کو پورا بھی نہیں کرتا اور نہ ذہنی سطح پر کسی طرف کوئی واضح اشارہ ہی کرتا ہے۔ سامنے کا سارا ناول حمیدہ سلطان کی ان یادوں سے مرتب ہے جو انھیں بہت عزیز ہیں۔ اس لئے انھوں نے کاٹ چھانٹ بھی نہیں کی۔ سارے ناول میں

ان کی کوشش رہی ہے کہ ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے کانوں نے جو کچھ سنا ہے وہ اس میں محفوظ ہو جائے۔ خفیف سے خفیف جزئیات بھی انھیں عزیز ہیں۔ اور وہ انھیں چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ حالانکہ اگر وہ ان جزئیات کو حذف کر دیتیں تو ناول کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بلکہ اکثر جگہوں پر حُسن پیدا ہو جاتا۔

سارا ناول دلّی کے ایک معزز شریف گھرانے اور اس کے متعلقہ افراد پر مشتمل ہے۔ سکندر زمانی بیگم رنگ محل کی مالکہ اور ناول کا مرکزی کردار ہیں۔ انھیں سے ناول شروع ہوتا ہے، انھیں کے گرد گھومتا ہے اور ان کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ رنگ محل کی روح یہی سکندر زمانی بیگم ہیں۔ دراصل وہ ایک عہد کا نشان ہیں جو گزر گیا۔ اور جو سکندر زمانی بیگم کی طرح کبھی واپس نہیں آئیگا۔ رنگ محل آج سے چالیس پچاس سال پہلے کی دلّی کے شرفاء اور دولت مند گھرانوں کی تصویر ہے۔ جسے محلوں سے باہر کے رہنے والے اس وقت بھی کم جانتے تھے۔ اور اب تو وہ زندگی مٹ ہی چکی ہے۔ اس کی جگہ ایک ملی جلی تہذیب ہے اور آئندہ تبدیلیوں کے ساتھ اور نہ جانے کیا کیا شکلیں اختیار کرتی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت بھی زندگی آج ہی کی طرح طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس طبقاتی تقسیم میں بہت سی خرابیاں بھی تھیں، لیکن خوبیاں بھی تھیں، جو اب بالکل مٹ چکی ہیں اور اب تک سماجی تبدیلیوں نے ان کا بدل نہیں دیا ہے۔

شرافت کے ماحول میں ایک خاص قسم کی بے فکری تھی۔ گھٹن تھی۔ شریف بی بیاں محلوں کے اندر عیش و آرام بھی کرتی تھیں اور گھٹ گھٹ کر دم بھی توڑ دیتی تھیں۔ اس محبت کے لئے ساری زندگی ترستی رہ جاتی تھیں جو اُن کا حق تھا۔ وہ محلوں کے اندر عیش و عشرت کا سامان لئے بیٹھی رہتی تھیں اور ان کے مرد اکثر حالتوں میں دوسری جگہ دادِ عیش دیا کرتے تھے۔ اور وہ عیش و عشرت کے سارے سامان مہیا ہونے

کے باوجود کڑھ کڑھ کر زندگی کے دن پورے کرتی تھیں۔ اور ان کے دل کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہ تھا۔

ان محل سراؤں میں امیرزادیوں کے علاوہ ماما ئیں، انائیں، مغلانیاں اور خواصیں تھیں۔ جن کی حیثیت کچھ نہ تھی۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد ان امیرزادیوں کی خدمت تھی جو دن رات بے فکری کے ساتھ گزارتی تھیں۔ ان کی زندگیاں محرومیوں کی مسلسل داستان تھیں۔

حمیدہ سلطان نے "رنگ محل" کو دیدہ و دانستہ پھیلایا نہیں۔ اور نہ اُسے ایک ماہر فنکار کی طرح ایک جگہ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس طرح نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے وعظ کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اسی طرح حمیدہ سلطان نے ناول نویسی کے تمام تقاضوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف اس زندگی کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن کی یادوں میں محفوظ ہے۔ جسے وہ بار بار یاد کرتی ہیں۔ اور آج کی نیم میکانکی زندگی سے اس کا مقابلہ کرتی ہیں جو لوگ حمیدہ سلطان کو قریب سے جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ اس عہد میں بھی وہ اس عہد کے قصے کس دلچسپی کے ساتھ بیان کرتی ہیں جو انھوں نے اپنے بچپن میں دیکھے اور سُنے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اب وہ زندگی قصّے سے زیادہ کچھ نہیں مگر انھیں یہ قصّے بے حد عزیز ہیں۔ اگر وہ چاہتیں تو ناول کو سمیٹ کر فن کا مظاہرہ کر سکتی تھیں لیکن اُنھیں یہ پسند ہی نہیں۔

رنگ محل کے سارے کردار خیالی نہیں ہیں۔ اس وجہ سے مصنفہ کو قدم قدم پر احتیاط برتنی پڑی۔ جانے پہچانے کرداروں کو پیش کرتے وقت یہ دقّت ہر مصنف کے سامنے آتی ہے۔ حمیدہ سلطان نے سارے کرداروں کو بڑی احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ کسی کے ساتھ زیادتی یا بے انصافی نہ ہو۔ اور اس فرض کو انھوں نے

بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے ۔ سارے واقعات کو پیش کرنے کے بعد حمیدہ سلطان نے پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا ہے کہ اپنے ذوق اور شعور کی رہنمائی میں نتیجے اخذ کریں۔ سماج کے اندر متحرک طاقتوں کو تلاش کریں اور اپنی بصیرت کے مطابق کوئی تعبیر کریں۔

سکندر زمانی بیگم عجیب و غریب خاتون ہیں۔ نیک سیرت ۔ سیر چشم اور دریا دل ۔ ان کی مثال ایک سمندر کے اندر ٹاپو کی ہے جس سے بہت سی موجیں ایک ہی وقت میں آکر ٹکراتی ہیں۔ ان کا پورا خاندان ہے ۔ وہ ماں بھی ہیں اور دادی بھی۔ سب کی خوشی ان کی خوشی ہے اور سب کا رنج ان کا رنج ہے ۔ وہ سارے ہنگاموں میں مضبوط چٹان کی طرح رہتی ہیں ۔ نرم و نازک موجیں بھی ان کے پاس سے ہو کر گزر جاتی ہیں اور تند و تیز بھی ۔ وہ ہر ایک کو برداشت کرتی جاتی ہیں۔ لیکن اندر اندر یہ چٹان کھوکھلی ہوتی جاتی ہے اور قیصر مرزا کی موت کا جھٹکا برداشت نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس دُنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔

جنرل صاحب ہیں جو نیم قدامت پسند ہیں ۔ نیم روشن خیال ۔ قیصر مرزا ہیں، لاڈوں کے پالے ہوئے اور زندگی کی شدتوں کی طرف سے بالکل بے پرواہ ۔ وہ اپنے لئے ایک روش چن لیتے ہیں اور ساری زندگی اسی پر چلتے رہتے ہیں۔ اور ناکام زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔ قیصر دلہن ہیں جو ساری زندگی شوہر کی بے اعتنائیوں کا شکار رہتی ہیں ۔ لیکن کبھی شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہیں لاتیں۔ اور نہ شوہر کی محبت میں کمی پیدا ہونے دیتیں ۔ وہ اس دَور کی شریف خواتین کا مکمل نمونہ ہیں ۔

رنگ محل کا سب سے زیادہ دلچسپ کردار خالہ فیفو ہیں ۔ وہ بڑھاپے میں بھی جوان ہیں ۔ بدصورتی کے باوجود خوبصورت تھیں اور دل پھینک بھی ۔ دراصل خالہ فیفو نفسیاتی مریض تھیں اور اسی لئے امیر زادیوں کی تفریح کا سبب تھیں۔ جب بھی

وہ آجاتی تھیں تو تفریح کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ خالہ ضیفو کا کردار ایک مستقل ناول کا مستحق تھا۔ افسوس کہ حمیدہ سلطان نے اسے پورے طور پر نہیں اُبھارا۔ جس طرح خالہ ضیفہ رنگ محل کے اندر ایک ضمنی کردار تھیں، اسی طرح اس ناول میں بھی ان کی حیثیت ضمنی سی ہے۔

سارے ناول کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ حمیدہ سلطان نے رنگ محل کو ناول نویسی کے موجودہ فن کے معیار پر لانے کی کوشش کی اور نہ تکنیک کا استعمال کیا۔ انھیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے اس زندگی کی تصویر کو مکمل طور پر پیش نہیں کر سکیں گی۔ جیسے وہ پیش کرنا چاہتی تھیں۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حمیدہ سلطان نے وہی زبان لکھی ہے۔ جو بچپن میں انھوں نے سیکھی تھی اور اب تک بولتی ہیں۔ یہ زبان دلّی کی زبان ہے۔

"رنگ محل" ایک دل کش تصویر ہے ان رنگا رنگ اقدار کی، اس تہذیب کی جو اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

سہیل عظیم آبادی

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غالب

۱

ماہِ مارچ کی سہانی صبح تھی، سورج نے ابھی مشرق کے دریچے سے جھانکا ہی تھا لیکن رنگ محل میں چہل پہل پورے عروج پر تھی۔ مامائیں اور مغلانیاں چائے ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ انائیں، دداا ور دائیاں ہر ایک دُلہن اور صاحبزادی کو جگا کر بچوں کے منہ بہلا کر دُھلا رہی تھیں۔ رنگ محل کی مالکہ سکندر زمانی بیگم نواب غضنفر علی خاں کی لاڈلی بیٹی تھیں ۱۸۵۷ء کے عالمِ آشوب میں بیگم صاحبہ چھوٹی سی ناسمجھ بچی تھیں لیکن اس زمانے میں جو ان کے خاندان اور دلی والوں پر بپتا پڑی وہ اِن کو یاد تھی۔ امن ہونے کے بعد نواب صاحب کو ان کی جائداد اور وہ آبائی جاگیر بھی جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے سے تھی ایک انگریز کرنل اور اُس کی بیوی کی جان بچانے کے صلہ میں واپس مل گئی۔ بارہ سال کی عمر میں سکندر زمانی بیگم کی شادی اپنے ماموں زاد بھائی مرزا احمد علی خاں سے ہو گئی۔ مگر بیگم صاحبہ نے ابھی اپنی عمر کی بائیس منزلیں بھی پوری نہ کی تھیں کہ چاہنے والا شوہر بھری جوانی میں داغِ جدائی دے گیا۔ مرزا صاحب شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑے اور دماغ میں سخت چوٹ آجانے کے باعث گرنے کے چند گھنٹے بعد ہی ختم ہو گئے۔ بیگم صاحبہ

جواں مرگ شوہر کی یادگار تین ننھے بچوں کو کلیجے سے لگائے بُت کی مانند بیٹھی رہ گئیں نواب صاحب کو بیٹی کے رانڈ ہونے کا بڑا قلق تھا لیکن سکندر زمانی بیگم نے جو دل پر گذری اس کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیا اور خود کو بچوں کی تعلیم و تربیت میں کھو دیا میاں کے بعد ایسی سفید پوشی اور سادگی اختیار کی کہ دوپٹے میں بیل ٹنک نہ لگاتی تھیں۔ اسی طرح جوانی سے بڑھاپا آگیا۔ اب بیگم صاحبہ کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ تھی مگر اس بڑھاپے میں بھی ان کے دلکش خدوخال میدا اور شہاب رنگ ہر کس و ناکس کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ تینوں لڑکے اب خدا رکھے شادی شدہ اور بال بچوں والے تھے، بڑے صاحبزادے اکبر علی خاں نے بڑی بے نیاز فطرت پائی تھی تمام دن دیوان خانے میں بیٹھے بے فکرے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے۔ یا فکر شعر میں غرق رہتے۔ اس لاپرواہی کی بدولت اُن کی اپنی بیگم سے بھی نہ بنتی تھی جو سگی پھوپی کی بیٹی تھیں۔ دوسرے صاحبزادے اصغر علی خاں نیک گھریلو طبیعت کے معتدل مزاج آدمی تھے۔ جاگیر و جائداد کے حساب کی دیکھ بھال بھی کرتے اور ریاست جودھ پور میں پرائیوٹ سیکریٹری کے عہدے پر ممتاز تھے۔ شادی ان کی بھی خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ چھوٹے صاحبزادے مظفر علی خاں حیدر آباد میں جنرل تھے۔ انہوں نے دلیری اور بلند حوصلگی اپنے مرحوم باپ سے ترکے میں پائی تھی۔ جنرل صاحب کی شادی حیدر آباد کے ایک بڑے جاگیردار کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ دلہن بیگم بھاری بھرکم جہیز کے ساتھ ساتھ امیرانہ نخوت اور خود سر فطرت بھی لائی تھیں جو ایسے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ تھیں بھی بہت حسین اور نازک اندام۔ ان کے دلربائی و نزاکت کی تمام دلی میں دھوم تھی۔

منجھلے اور چھوٹے صاحبزادے سال میں دو تین مرتبہ ہی ماں پاس آتے

تھے۔ لیکن بہوئیں اکثر ساس پاس ہی رہتی تھیں۔ رنگ محل کے پچھلے حصّے والے دو کمرے بڑی بہو صاحب کے قبضے میں تھے اور منجھلی بہو صاحب کے پاس چبوترے کے اوپر والے دالانے حصّے کی دونوں سہ دریاں اور کمرے تھے۔ چھوٹی بہو صاحب کا کارخانہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے بڑے دالان اور بائیں رُخ کا تمام حصّہ اُن کے لئے تھا۔ بیگم صاحبہ نے چھوٹے صاحبزادے کی شادی کے بعد بالا خانے والے کمروں کی درستی کرا کر وہیں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان کی چہیتی لونڈیاں شمشاد اور مبارک قدم منہ چڑھا خانہ زاد گلزار اور مصاحب عزیز خانم مغلانی بیگم جان' غرضیکہ پورا عملہ اوپر ہی رہتا تھا۔

بیگم صاحبہ صبح کی نماز کے بعد ابھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں اور ان کی نماز کی چوکی کے پاس ہی بیٹھی مصاحب عزیز خانم تسبیح ہلا رہی تھیں۔ مغلانی بیگم جان نے نماز پڑھ کر پہلے پان کھایا۔ پھر دونو لونڈیوں کو جگایا۔ "اری کمبختو! دیکھو سورج بھی نکل آیا تم ابھی تک پڑی سو رہی ہو۔"

بیگم صاحبہ نے پنجسورے کو جزدان میں رکھ کر عینک اُتاری ہی تھی کہ تینوں بہوؤں نے آکر آداب کیا انہوں نے ہر ایک کو بوڑھ سہاگن ہونے کی دعا دی۔ پھر بڑی بہو سے پوچھا۔ "کیوں آفتاب دُلہن صالحہ کا خط آیا تھا یا نہیں؟ اب فریدہ کا جی کیسا ہے؟ ان کی ماں اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس گئی ہوئی ہیں بچی تھلیاں[۱] رکھ رہی ہے۔ اس لئے آئے دن اس کا جی اُکتا رہتا ہوگا۔ یاں ہوگی تو تم دیکھ بھال کروگی صالحہ ابھی بچے پالنا کیا جانیں۔

---

[۱] تھلیاں رکھنا دلّی کی بیگماتی اصطلاح میں دانت نکلنے سے پہلے بچے کے مسوڑھے پھولنے کو کہا جاتا تھا۔

بڑی بہو صاحب "ابھی تو صالحہ کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے پرسوں اُن کو یہاں آنے کی تاکید لکھ دی ہے اور زرتاج دُلہن نے بھی بتن کے نواسے کا بلاوا کل بھیجدیا ہے۔"

منجھلی بہو صاحب بولیں۔ "اماں جان کل شام کو امراؤ خانم پھر محمد مرزا کے لڑکے کا پیغام لائیں تھیں۔"

سکندر زمانی بیگم نے کہا۔ "مہتاب دُلہن تو تمہاری پوتی ہے تم کو اختیار ہے مگر آنکھوں دیکھے مکھی کیسے نگل لی جائے۔ تم کو تو معلوم ہے محمد مرزا کی نانی نواب زادی تو تھیں مگر خواص کے پیٹ سے تھیں۔ اس لئے ہی کسی برابر والے سے اُن کی شادی نہ ہو سکی۔ محمد مرزا کے نانا دلدار مرزا تھے کھرے مغل، مگر اہل شہر میں سے تھے۔ یوں سُنا ہے مسعود بہت اچھا لڑکا ہے اور اب تو ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گیا ہے مگر یہ نقص جو ہے۔"

منجھلی بہو صاحب:۔ "اس لئے ہی میں نے امراؤ خانم سے صاف کہدیا کہ یہ رشتہ نہ ہو سکے گا اور بھابی بیگم نے تو اُن کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بول بھی نہ سکیں۔"

بڑی بہو صاحب۔ "مجھے تو ممانی جان امراؤ خانم کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔ ایسے لوگوں کا پیغام ہمارے ہاں لائیں جن کا نسب ٹھیک نہ پشتینی نواب لڑکا ڈپٹی کلکٹر ہو گیا ہو ا ہمارے برابر کے تو وہ ہو نہیں سکتے۔"

سکندر زمانی بیگم۔ بڑا چاہے وہ لکھ پتی کیوں نہ ہوں۔ اگر ذات میں نقص ہو تو میں تو رشتہ کرنے کی صلاح نہیں دوں گی۔"

چھوٹی بہو صاحب بولیں۔ اماں جان بتن کو خیر سے نواں مہینہ کل لگ جائے گا نواسے کی تاریخ کیا رکھی جائے۔

سکندر زمانی بیگم اب کے جمعہ کو رکھ لو۔ تاریخ بھی اچھی، دن بھی مبارک چلو بن کو دیکھنے میں خود چلتی ہوں۔ شمشاد کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ کھڑی ہو گئیں۔

بن بی جنرل صاحب کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ ان سے چھوٹی دو بہنیں تین بھائی اور تھے۔ منجھلے صاحب کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑے صاحب کے ہاں اولاد ہوئی نہ تھی۔ اس لئے بڑی بہو صاحب نے منجھلے دیور کی بڑی لڑکی صالحہ بیگم کو ہوتے ہی گود لے لیا تھا۔ بڑے چاؤ چونچلوں سے ان کو پالا تھا اور خوب دھوم سے ان کی شادی کی تھی۔

بیگم صاحبہ نے بن بی کے کمرے میں قدم رکھا۔ بن بی جاگ تو گئی تھیں مگر الکساہٹ کے مارے پڑی کروٹیں بدل رہی تھیں۔ دادی کے پیچھے ماں اور پھپھیوں کو آتا دیکھ کر گھبرا کر وہ جلدی سے اٹھی اور دوپٹہ اوڑھ کر آداب کے لئے جھک گئی۔ سکندر زماں بیگم نے پوتی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔ "جیو دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" بن جی تو اچھا ہے۔

بن لجا کر بولی۔ طبیعت تو میری بالکل ٹھیک ہے رات کو دیر تک بھابی منور دلہن کے ساتھ پچیسی کھیلتی رہی۔ اس لئے ذرا دیر سے آنکھ لگی۔ سکندر زمانی بیگم نے کہا۔ تم کو اپنے آرام کا پورا خیال کرنا چاہیئے۔ بن رات گئے تک نہ کھیلا کرو۔

(بن بی نے شرما کر سر جھکا لیا) منجو بی نے آکر پہلے دادی اور پھپھیوں کو آداب کیا۔ پھر ماں سے کہا۔ بھابی اماں! ناشتہ تیار ہے۔

چھوٹی بہو صاحب:۔ اماں جان آج تو آپ بھی میرے ساتھ چلئے پی لیجئے۔ چلئے بھابی جان۔ بھابی بیگم آپ چائے تو پیتی نہیں خیر دسترخوان

پر تو بیٹھ جایئے۔"

بڑی بہو صاحب۔ دُلہن تم بسم اللہ کرو۔ میں تو ابھی ٹھنڈائی پی کر آ رہی ہوں۔ رات کو بھی کھانے کے بعد دیر تک دھڑکن ہوتی رہی۔ نہ جانے نگوڑے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا سی کوئی ثقیل یا گرم چیز منہ میں ڈالی اور دھڑکنے لگا۔

سکندر زمانی بیگم (مسکرا کر) اے آفتاب دُلہن تم وہم بھی بہت کرتی ہو۔ اور کچھ نہیں تو ایک پیالی دودھ ہی پی لینا۔ نہار منھ رہنا دوپہر تک اچھا نہیں۔"

بڑی بہو صاحب۔ بہت اچھا موانی جان۔

سکندر زمانی بیگم۔ شمشاد میری چاء کی کشتی پیچھے ہی لے آؤ۔

چھوٹی بہو صاحب۔ اے ہے اماں جان آپ کی ایک پیالی کیا مجھ پر دوبھر ہے۔ جو آپ کشتی منگوا رہی ہیں۔

سکندر زمانی بیگم۔ اچھا دُلہن تمہاری خوشی۔ شمشاد تو صرف منقا بادام ہی لے آ۔ اور ہاں مونگ کی پینڈیاں بھی لیتی آئیو۔ بیٹی کو بہت پسند ہیں۔

منجھلی بہو صاحب۔ میں ابھی آتی ہوں دُلہن۔ ذرا سکندر اور ستارہ کو دیکھ آؤں۔ اُن کی ماں تو حسبِ معمول ابھی سو رہی ہوں گی۔

چھوٹی بہو صاحب۔ ساس اور بڑی جٹھانی کو لے کر ناشتہ کے دسترخوان پر بیٹھیں۔ منجو بی سب کو چائے کی پیالیاں بنا کر دے رہی تھیں اور بین بی دادی اور چچی کے سامنے ناشتے کی چیزیں رکھ رہی تھیں۔ منجھلی بہو صاحب بھی تھوڑی دیر بعد آگئیں ان کے ساتھ ہی منور دلہن اور بنو بی بھی آگئیں۔

منجھلی بہو صاحب کی مغلانی نسبتی بیگم اور ماما گلشن چاء اور ناشتے کی

کشتیاں سنبھالے ان کے پیچھے پہنچیں۔

چھوٹی بہو صاحب۔ اللہ بھابی آپ بھی کتنا تکلف کرتی ہیں۔ یہاں اتنا سب کچھ تو ہے پھر آپ نے اور کیوں منگا لیا۔

منجھلی بہو صاحب۔ اے ہے تکلف کاہے کا یہ ناشتہ بھی تو تیار ہو چکا تھا چھوٹی بہو صاحب کی مغلانی محمدی خانم اور خاصہ کھلانے والی عائشہ بی بیٹھی چوہری ہلا کر مکھیاں اُڑا رہی تھیں اور دونوں حبشن کنیزیں لیلا اور عنبر گرما گرم کچوریاں باورچی خانے سے لا کر دے رہی تھیں۔

قیصر دلہن کی چاء کی کشتی اُن کی کنیز چمپا ان کی خواب گاہ ہی میں لے گئی وہ اُٹھ تو گئی تھیں لیکن ابھی چھپر کھٹ پر بیٹھی انگڑائیاں جمائیاں لے رہی تھیں۔

سکندر زمانی بیگم نے ادھر اُدھر نظر ڈال کر کہا۔ دلہن چھمّو کہاں ہے کیا ابھی تک سو رہی ہے۔

منجو بی بولیں۔ اُٹھ تو گئی شوخی کر رہی تھی ابھی میں نے گھرک کرمانی کے ساتھ منھ دھونے بھیجا ہے۔

سکندر زمانی بیگم۔ منجو تم چھمّو کو زیادہ نہ گھرکا کرو ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچے شریر اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ ابھی اس کی بساط ہی کیا ہے پانچویں سال میں تو ہے بڑی ہو گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔

منجو۔ دادی اماں میں تو چھمّو جب بہت شرارت کرتی ہے جبھی کچھ کہتی ہوں۔

چھوٹی بہو صاحب۔ ہم اور منجو بھی تو کبھی چھوٹی تھیں اماں جان مگر یہ لڑکی تو آفت ہے۔ اس کی شرارت سے سب نالاں ہیں۔ ایک منٹ نچلی نہیں

بیٹھتی۔ کل رات کو خدا جانے کیسے باورچی خانے میں جا گھسی۔ باورچی کی نظر بچا قورمے میں مٹھی بھر نمک جھونک دیا۔ بھری پتیلی قورمے کی یونہی پھکی کسی سے منہ پر بھی نہ رکھا گیا۔" وہ ابھی یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ شریر چھمّو اپنی پیاری دادی کے گلے میں آکر لٹک گئی۔ چھوٹی بہو صاحب (چھمّو کو تیز نظر سے دیکھ کر)۔ دیکھ لیجئے کیسی بدتمیز لڑکی ہے نہ آداب نہ سلام جنگلی لگتی ہے بالکل سکندر زمانی بیگم۔ تم کچھ نہ کہو دلہن۔ میں خود سمجھا لوں گی (پیار بھرے لہجہ میں) کیوں چھمّو تم کب تک شوخیاں کرو گی۔ اب تو بڑی ہوتی جاتی ہو آؤ میرے پاس بیٹھو۔

چھمّو پھدک کر دادی کے پہلو میں جا گھسی اور بنو بی کو اپنا سا منہ لے کر وہاں سے کھسکنا پڑا۔

ناشتے پر اس وقت انڈوں کا خاگینہ۔ کچوریاں بسکٹ اور موسمی پھل تھے۔ دیورانی کے بہت اصرار سے بڑی بہو صاحب نے ایک بسکٹ کھایا اور آدھی پیالی دودھ کی پی۔ وہ بڑی وہمن تھیں۔ انڈے سے ان کو گرمی کا خدشہ تھا تو سیب انار سے زکام ہو جانے کا۔ کچوریاں ثقیل تھیں اور رنگترے ترش۔ چھوٹی بہو صاحب کھانے کے معاملہ میں اور بھی گئی گزری تھیں۔ آئے دن پیٹ سہلاتی رہتی تھیں۔ انہوں نے ایک انار کے دانے کھائے اور سیب کی دو قاشیں لیں۔ منجھلی بہو صاحب میٹھا اس کی شوقین تھیں انہوں نے صرف پینڈی کھائی۔ سکندر زمانی بیگم تو چائے کے ساتھ ہمیشہ منقہ بادام کھایا کرتی تھیں۔ بہو کے بہت اصرار سے انہوں نے ایک کچوری لے لی۔ البتہ منّو دلہن اور لڑکیوں نے دسترخوان پر رکھی ہوئی ہر چیز کو چکھا۔ چھمّو نے اپنی کو کا کلثوم کے لئے دو بسکٹ اور ایک کیلا اٹھایا اور کودتی ہوئی چل دی۔ ناشتہ کا دسترخوان بڑھتے ہی

چھوٹی بہو صاحب کی مغلانی نے مینو بی کے جہیز کے جوڑی گلبدن کے فرشی پاجامے کے لئے سبز ساٹن کے نیچے پر دھنک سے جو دیکھت نمبوں کا نمونہ ڈالا تھا وہ لاکر دکھایا۔ سکندر زمانی بیگم نے اس میں جو نقص رہ گیا تھا مغلانی کو بتایا۔ پھر منجھلی بہو سے کہا۔ مہتاب دُلہن اب تو کے دوپٹے میں تار بھرنے کے لئے سب کو بٹھا دو۔ وہ بولیں۔ اماں جان بستی بیگم اور اصغری خانم کو تو میں نے بٹھا دیا ہے۔ تو کی آنا ماندی ہو رہی ہے۔ ورنہ وہ بھی لگ جاتی بڑی بہو صاحب نے کہا۔ میں شمسی خانم کو بُلا دیتی ہوں۔ اور شمشاد کو بھی بٹھا دو۔ چار جنیاں مل جائیں گی تو دوپہر شام تک ہو جائے گا۔ دن کافی بڑا ہے۔

آنا چھوٹے اختر کو لے کر آ گئی۔ بچے کی ناک بہتے دیکھ کر بیگم صاحب نے کہا۔ دُلہن تم بچے کا خیال نہیں رکھتیں۔ ابھی صبح و شام کافی ٹھنڈ ہوتی ہے موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ اس کو آج نہلوانا نہیں۔ تمہارے میاں تو گوروں فرنگیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے پورے صاحب بن گئے ہیں۔ تم کو تو خیال چاہیئے۔

چھوٹی بہو صاحب مسکرا کر بولیں۔ اماں جان میں نے تو کل بھی اس کو نہیں نہلوایا صرف ہاتھ منہ دھلوا کر کپڑے بدلوا دیئے تھے۔ یہ آنا کی غلطی ہے اس نے پرسوں شام کو سر دھویا بچے کو ٹھنڈ لگ گئی۔

آتوں جی کی آواز سہ دری سے آئی۔ دیکھئے بیگم صاحب چھوٹی بنو بی کو ستا رہی ہیں اور خود بھی یہ نچلی بیٹھ کر نہیں پڑھتیں۔ بیگم صاحب نے پکار کر کہا چھمو! تم بہت شوخ ہو رہی ہو اچھا میں ابھی لکڑی لے کر آتی ہوں۔

اور شریر چھمو نے سپارے کا سبق پڑھنے کے بجائے اُردو کا قاعدہ بے کر فراٹے سے پڑھنا شروع کر دیا۔ آتوں جی اس شریر لڑکی کی ذہانت سے مرعوب تھیں۔ اس لئے طرح دے جاتی تھیں

دھوپ اب رنگ محل کے منقش مرمریں ستونوں کو جگمگا رہی تھی۔

لیکن قیصر دُلہن نے ابھی تک نہ اس غم میں بال سنوارے تھے نہ کپڑے تبدیل کئے تھے۔ کہ ان کے رنگین مزاج شوہر دادی اماں سے روپے لیکر کل شام سے پھر غائب تھے "خدا جانے وہ کہاں رنگ رلیاں منا رہے ہیں" اس خیال سے قیصر دلہن کھسیانی ہو کر پان پر پان کھا رہی تھیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھیں۔

مِتّن بی اپنے دولہا کو خط لکھنے میں مصروف تھیں۔ اور مشّو دلہن سنگاردان کے سامنے بال سنوارتے ہوئے یہ خیال کرکے مسکرا رہی تھیں کہ میاں آئندہ ہفتہ تو ضرور ہی آئیں گے۔

منجو بی۔ ابّا جان کا وہ خط جو پرسوں بھابی امّاں کے نام آیا تھا چھپ کر پڑھ رہی تھیں۔ جنرل صاحب نے لکھا تھا۔ "منجو کی شادی کا ذکر ابھی بس تین سال تک سُننا نہیں چاہتا۔ بنی کے لئے تو میں یوں مجبور ہو گیا کہ تمہارے بھتیجے کی بات تھی۔ دوسرے بنی کی صحت اتنی اچھی ہے کہ وہ اپنی عمر سے بڑی لگتی ہے مگر منجو تو تمہاری طرح دھان پان ہے" نجو بی پالتو طوطے کی طرح سپارے کے سبق کو رٹ رہی تھیں۔ چھبو تختی لکھ رہی تھی اور نجو بی کے پڑھنے کی نقل بھی اتارتی جاتی۔

بڑی بہو صاحب اپنی جاکٹ کی جالی پہ تار شمار بنا رہی تھیں۔ اور منجھلی بہو صاحب ستارہ کی انا پر خفا ہو رہی تھیں۔ سکندر زمانی بیگم بنی بی کے نواسے پر بلائے جانے والی بیگمات کی فہرست لکھوا چکی تھیں۔ کہ گھنٹے نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ اور وہ یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ "اے لو بوا یہ وقت ہو گیا اور میں یہیں بیٹھی ہوں۔ اچھا دلہن اب جو بات پوچھنی ہو شام کو پوچھ لینا۔ چھوٹی بہو صاحب

بولیں۔ اب تو آپ کھانا کھا کر ہی اوپر جائیے گا۔

بیگم صاحب۔ نہیں بی۔ تم سب تو مزدوروں کی طرح ایک بجے کھانا کھاتے ہو میں تو بارہ بجے تک کھا کر لیٹ بھی جاتی ہوں۔ دیر ہو جاتی ہے تو پھر اٹھتے اٹھتے ظہر کی نماز کا وقت تنگ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی بہو صاحب ساس کو پہنچانے زینے تک آئیں۔ مجّو نے جو دادی کو جاتے دیکھا تو ماں سے یہ کہہ کر ان کی انگلی پکڑ کر چلدی۔ کہ میں آج دادی اماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گی اور وہیں دوپہر کو سو جاؤں گی۔

(۲)

بنّن بی کا ناسہ بہت دھوم سے ہوا۔ چھوٹی بہو صاحب نام و نمود کی بہت شوقین تھیں ....

چاہتی تھیں کہ ہر تقریب اتنے بڑے پیمانہ پر ہو کہ سارے خاندان والے عش عش کرتے رہ جائیں۔ دو دن مہمانداری کی۔ پورا محل مہمان خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دلّی کی ڈومنیوں کے تمام طائفے موجود تھے۔ گانے بجانے چیخ و پکار میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی چہیتی کنیزیں لیلا اور عنبر دو دن بیمار ہو گئیں۔ بیگمات کے ساتھ آنے والی مامائیں کھانے کے ساتھ نکا بیان بھی ہمیشہ کرتی گئیں اور بڑی بہو صاحب کو اختلاج کا ایسا دورہ پڑا کہ دل کسی طرح نہ سنبھلا آخر حکیم اجمل خاں کو بلایا گیا۔ پہلے داروغہ جی ان کو لینے گئے مگر انہوں نے آکر کہہ دیا کہ حکیم صاحب کو دم مارنے کی فرصت نہیں۔ سارے لیڈر اُن کے یہاں جمع ہیں۔ میٹنگ ہو رہی ہے۔ چھوٹی بہو صاحب نے اپنی مغلانی حمیدی خانم سے کہا۔ یہ داروغہ جی تو کہنے نام کے مرد ہیں باہر سے بیٹھ کر چلے آئے ہوں گے۔ حکیم صاحب تو بڑے بھائی جان کو اُستاد کہتے ہیں۔ ان کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ اگر بھابی بیگم کی علالت کی خبر اُن کو دے گی تو فوراً آ جائیں گے۔

مغلانی نے پان کھا کر برقعہ سنبھالا اور جوتیاں گھسیٹتی ہوئی چلی گئیں۔

حکیم صاحب کا گھر رنگ محل سے ایک آنہ ڈولی تو تھا ہی۔ کچھ ہی دیر بعد مغلانی بڑبڑاتی واپس آگئیں۔

چھوٹی بہو صاحب۔ اے بی منھ ہی منھ میں کیا کہہ رہی ہو، صاف کہو نا۔

مغلانی سر سے برقعہ اتار کر: غضب ہوگیا بیوی! میرے تو اوسان ایسے گئے کہ دروازے سے خبر سن کر بھاگ آئی۔ مارے ہول کے پیٹ میں سانس نہیں سما رہا۔ حکیم صاحب کے دشمنوں کا تو کچھ سر پھر گیا ہے۔

منجھلی بہو صاحب۔ اے ہے یہ کیوں۔ بات منھ سے سوچ کر تو نکالو۔ انگریز ڈاکٹر تک حکیم اجمل خاں کی حکمت کو مانتے ہیں۔

مغلانی نے پہلے اپنی لڑکی کو آواز دی۔ اری چھٹیا دو گھونٹ پانی پلا جو اوسان درست ہوں۔ پھر پٹاری کھول پان بناتے ہوئے بولیں۔ بیوی مردوں کے غٹ کے غٹ حکیم صاحب کے دروازے پر جمع ہیں اور اندر سنا ہے مٹن ہو رہی ہے۔

تبصر دلہن (ہنس کر) مٹن نہیں میٹنگ کہو۔

مغلانی (ناک بھوں چڑھا کر) اے دلہن بیوی ہم کیا جانیں۔ انگریزی تو نگوڑ ماری جناتی زبان ہے۔ منھ پر چڑھتی ہی نہیں۔

بڑی بہو صاحب نے لیٹے لیٹے آہستہ سے پوچھا۔ ہوا کیا۔

مغلانی۔ باہر کھڑے مردوے یہ کہہ رہے تھے حکیم صاحب نے بادشاہ کا دیا ہوا خطاب اور تمغہ واپس کر دیا ہے۔

بن بی۔ مسکرا کر بولیں۔ مغلانی تمغہ کہہ دو تو کیا ہرج ہے اور مغلانی نے سر پہ ہاتھ مار کر کہا۔ اب میں نگوڑی مدرسے میں پڑھنے سے رہی۔

منجھلی بہو صاحب۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ حکیم صاحب کے دشمن دیوانے

ہو گئے

مغلانی۔ اے تو میں نے کیا غلط کہا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بادشاہ کا دیا ہوا خطاب واپس کر دیا۔ ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی جانے کون کون بڑے لوگ سب ہی جمع ہیں۔ پوری گلی مردوں سے بھری پڑی ہے۔ سب یہ ہی کہہ رہے تھے کہ حکیم صاحب بھی گرفتار ہو جائیں گے۔ ہائے ہائے ان کو سرکار کا بھی ڈر نہیں۔ یہ موئے فرنگی کہیں مسلمانوں سے بدلہ نہ لیں۔ میں نے جیسے اپنی اماں سے غدر کا حال سنا ہے نگوڑوں سے جی کانپتا ہے بڑی موذی قوم ہے فرنگیوں کی۔

صالحہ بیگم (جن کے میاں ایک بڑی ریاست کے دیوان تھے اور گورنمنٹ آف انڈیا میں ان کا بڑا رسوخ تھا۔) بگڑ کر بولیں۔ بس کرو مغلانی بے چارے انگریزوں کو کیوں کوستی ہو۔ ہندوستان میں اب تو ہر طرف امن و امان ہے اور ایک سے ایک نئی چیز ہمارے آرام کے لئے آ رہی ہے۔ جب کوئی حکومت پلٹتی ہے تو مار دھاڑ ہوتی ہے۔

منجھلی بہو صاحب۔ مغلانی، درد خہ جی سے کہو۔ حکیم چھوٹے میاں کو لے آئیں۔ ذکیہ کی طبیعت بھی رات سے ٹھیک نہیں ہے۔ کئی دست آ چکے ہیں۔ ان کو بھی دکھانا ہے۔

چھوٹی بہو صاحب۔ اے ہے۔ ذکیہ کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتیرا دھان پان لڑکی ہے۔ جاؤ منجو اپنی چھوٹی آپا بیگم کو یہیں لے آؤ حکیم صاحب آنے والے ہیں۔

منجو جانے کے لئے اٹھی تھیں کہ ذکیہ بیگم آ گئیں۔ ان کا سرخ و سپید رنگ اس وقت دھوئے کپڑے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ نرگسی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے لیکن اس عالم میں بھی پری وش ذکیہ پر پیازی رنگ کا شبنم کا دوپٹہ لاکھ لاکھ بناؤ

دے رہا تھا۔ طاؤسی رنگ کی تاوئز کے فرشی پاجامے کے پائنچے سنبھالے ایک خواص ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔ چند منٹ بعد حکیم چھوٹے میاں آ گئے۔ بیگمات پردے میں ہو گئیں۔ حکیم صاحب نے پردے کے پیچھے سے دونوں بیگموں کی نبض دیکھی۔ نسخے لکھے اور پان کھا کر چلے گئے۔

چونکہ مہمان داری ہوئی تھی۔ اس لئے پورا محل الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ بڑی بہو صاحب کے کمروں میں سوائے صالحہ بیگم کے اور کسی کا گذر نہیں ہو سکتا تھا۔ سب ان کے مزاج سے ڈرتے تھے۔ اس لئے وہاں تو ابتری نہ تھی۔ باقی سارا محل انجولی اور منور دلہن نے صاف کرا کے ہی دم لیا۔ مرمریں چبوترے پر پان کی پیکوں سے شوقین عورتوں نے خاصی گلکاری کر دی تھی۔ دو مہتروں نے ایک گھنٹے تک اس کو رگڑ رگڑ کئی مشکوں سے دھلوایا تب جا کر صاف ہوا۔ بارہ کی توپ چلتے ہی کھانے کی دھوم مچی۔ دوپہر کا کھانا چھوٹی اور منجھلی بہو صاحب ساتھ ہی کھاتی تھیں اندر کے بڑے دالان میں پہلے چھڑا بچھایا گیا اور پھر دسترخوان۔ خاصہ کھلانے والیوں نے جلدی جلدی کھانا چن دیا اور بی مغلانی تھال ظروف کی سینی لے کر پانی پلانے کے لئے بیٹھ گئیں۔ قیصر مرزا۔ منور مرزا کے لئے مغلانی نستی بیگم نے دو خوان بستنی میں کس کر دیوانخانے میں بھجوا دیئے۔

دوپہریں اب کافی گرم ہونے لگی تھیں۔ سب بیویاں تھکی ہوئی تھیں۔ کھانا کھاتے ہی سو گئیں۔ چھوٹی بہو صاحب تو ایسی بے خبر سوئیں کہ ظہر کی نماز بھی قضا ہو گئی اور سب نے بھی کچھ ناوقتی نماز پڑھی۔ عصر کی نماز پڑھ کر سب بیگمات باہر چوکیوں پر بیٹھیں۔ مغلانی مہری خانم نے بہت رازداری کے لہجے میں چھوٹی بہو صاحب سے کہا۔ بیوی میری تو سمجھ میں آتا نہیں۔ اب یہ کانگریس کیوں نکلی ہے اور ہندو مسلمان کیوں ہنگامہ کر رہے ہیں۔ فرنگیوں نے جو ظلم کرنے تھے پہلے کر لئے۔ اب تو جب سے ملکہ صاحبہ

کا راج ہوا ہے سب چین کی بنسی بجاتے ہیں۔

چھوٹی بہو صاحب۔ بوا ملکہ کو مرے تو مدت ہوئی اب ان کا پوتا بادشاہ ہے

مصاحب لاڈو جان:۔ اے بوی میں نے تو سنتا ہے جرمنی اور اس کا بھائی روس دونوں مل کر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ بنّن بی ہنس کر واہ خالہ روس اور جرمنی الگ الگ ملک ہیں وہ بھی کیا انسان ہیں جو بھائی بھائی ہو گئے۔

لاڈو جان:۔ صاحبزادی ہم جاہلوں کو کیا خبر جو سنا سو کہہ دیا۔

شمسی خانم:۔ چھالیا کاٹتے ہوئے بولیں۔ جرمنی کا بادشاہ قیصر مسلمان ہے اگر وہ ہندوستان پر قبضہ کرلے تو اچھا ہے۔ اپنے دین مذہب کا بادشاہ ہوگا تو مسلمانوں کی قدر کرے گا۔ مجھے ان فرنگیوں سے بہت ڈر لگتا ہے کیسے لال لال رنگ ہوتے ہیں بندروں کے سے گوڈوں کے۔

بنّن بی۔ سلانی بوا۔ تم سے کس نے کہا کہ قیصر مسلمان ہے وہ بھی فرنگی اور عیسائی ہے۔ جرمنی کے بادشاہ کا خطاب قیصر ہوتا تھا۔ اب تو خیر وہاں بادشاہ ہی نہ رہا۔ اور لڑائی ختم ہوئے ابھی پورے چار برس نہیں ہوئے پھر تم لڑائی کرانے کی فکر میں ہو۔ انگریز لڑے تو خود نقصان ہندوستان کو پہنچا۔ یہاں کا بہت روپیہ گولہ بارود بنانے میں ضائع ہو گیا۔ گرانی بڑھ گئی۔ ہزاروں جوان اپنے ملک سے دور مارے گئے اور بہت اپاہج ہو کر واپس آئے۔

قیصر دلہن۔ ہیں انگریز خوش قسمت، جرمن والے بہت بہادری سے لڑے مگر جیت انگریزوں کی ہوئی۔

مصاحب لاڈو جان۔ یہ تو بتاؤ بیوی کہ ملکہ صاحب کیسے بادشاہ ہو گئی تھیں۔ ہمارے ہاں تو عورتوں کی حکومت نہیں ہوتی۔

قیصر دلہن۔ اب ہندوستان تو ایک غلام ملک ہے ورنہ کبھی یہاں بھی عورتیں

حکمرانی کرتی تھیں۔ ان عورتوں میں ایک جھانسی کی رانی بھی شامل ہے۔ جو ۱۸۵۷ء میں اپنے ملک کے لئے انگریزوں سے لڑتے لڑتے مر گئی۔ جھانسی کے قریب کی ریاست بھوپال پر اب بھی بیگم کی حکومت ہے۔

منجھلی بہو صاحب :۔ سچ تو یہ ہے ملکہ کے راج میں امن و امان رہا اس کے مرتے ہی خاک سی اڑنے لگی۔

چھوٹی بہو صاحب۔ ہاں بڑی قسمت والی عورت تھی۔

مصاحب لاڈو جان۔ (سرد آہ بھر کر) کوئی بادشاہ ہوا کرے دلی بیچاری تو رنڈیا ہے گی۔ اس کے سرتاج تو بہادر شاہ تھے۔ میری اماں خدا بخشے کہتی تھیں۔ جب جہاں پناہ کو انگریز دلی سے لے گئے تو ان کے ارد گرد گوروں کی فوج تھی۔ بادشاہ سلامت کی آنکھوں سے آنسو گر کر داڑھی پر بہہ رہے تھے اور دلی والے سب دھاڑیں مار مار کر جہاں پناہ کے ساتھ رو رہے تھے اور اس دن کسی گھر میں چولھا نہیں جلا تھا۔ ہائے دلی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی جو یوں اجڑ گئی۔

چھوٹی بہو صاحب نے تھوک کر کہا۔ بس کر لاڈو جان دونوں وقت مل رہے ہیں۔ وقت دیکھو نہ موقع الٹی سیدھی باتیں کرنے سے مطلب۔

چھوٹی بہو صاحب کے سامنے کسی کے مرنے یا تباہی اجڑنے کا ذکر کوئی کر دیتا تو اس کی شامت آجاتی۔ عجب دماغ تھا ان کا بھی۔ کسی بچے کا پنڈا بھی پھیکا ہو جاتا تو نذر و نیاز اور خیرات و صدقے کی بھرمار کر دیتیں۔ منگل کے منگل تیل ماش تو بچوں کے اوپر سے ضرور ہی اترتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی صدقے بیلے نذر گزر کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس وقت بھی انہوں نے کئی دفعہ تھوکا اور کلیاں بھی کیں جب جا کر اطمینان ہوا۔

(۳)

بن بی کے ہاں ولادت کا زمانہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا چھوٹی بہو صاحب کی پریشانی اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ رات کو کئی کئی دفعہ اُٹھ کر بے خبر سوئی ہوئی بتن کو دیکھتیں اور اس پر دم کر دیتیں۔

جنرل صاحب بھی قمر اور انور کے سالانہ امتحان ختم ہوتے ہی دونوں کو لیکر دلّی آ گئے۔ انھوں نے لیڈی ڈاکٹر کو بُلا کر بتن بی کا معائنہ کرایا۔ خاندانی دائی تو نو ماسے کے بعد سے روزانہ رات کو یہیں سوتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر بھی دوسرے تیسرے دن آ کر بتن بی کو دیکھ جاتی۔ جنرل صاحب کے آنے کے نویں دن بتن بی کی طبیعت خراب ہوئی۔ فوراً لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو جنرل صاحب نے بلوا لیا اور منجھلی بہو صاحب سے کہا کہ بتن کے کمرے میں لیڈی ڈاکٹر، نرس اور آپ کے علاوہ صرف اس کی آنا رہے اور زیادہ مجمع نہ ہو۔ سکندر زمانی بیگم پوتی کو دیکھنے کے لئے چند منٹ کے لئے آئیں۔ پھر چلی جاتیں چھوٹی بہو صاحب کے پیٹ میں مارے ہول کے سانس نہیں سما رہا تھا۔ وہ سجدے میں پڑی ہوئی بیٹی کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

بڑی بہو صاحب کا دل تو بہت ہی کمزور تھا۔ وہ چبوترے پہ ٹہلتی پھر رہی

تھیں۔ اور سب بیویاں بھی زچہ اور بچہ کی جان کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھیں خدا خدا کرکے چھبیس گھنٹے کی تکلیف کے بعد صبح نور کے تڑکے تن بی کے ہاں لڑکا تولد ہوا۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی بچے کے رونے کی آواز کان میں پڑی۔

چھوٹی بہو صاحب صبح کی نماز اور شکریہ کے نفل پڑھ کر بیٹی کے پاس گئیں۔ منجھلی بہو صاحب نے بچے کو دیورانی کی گود میں دے دیا۔ ماشاءاللہ بہت خوبصورت اور تندرست بچہ تھا۔ جنرل صاحب کو بچہ ہونے کی خبر فوراً پہنچائی گئی انہوں نے دو نجومیوں کو بٹھا رکھا تھا۔ جنم پتری سب بچے کی وہ بنانے لگے۔ رنگ محل کے باہر کے پھاٹک پر نوبت رکھ دی گئی جو نے والیاں اور ڈومنیاں اندر اور ڈیوڑھی پر بیجڑے اور بھانڈ زچہ گیریاں بیہائیاں گانے لگے۔ مگر جنرل صاحب کے ڈر کے مارے تن بی کے کمرے میں کوئی نہ گھس سکتا تھا۔ وہاں ان کے چھپر کھٹ کے قریب نرس بیٹھی رہتی اور بچے کے پالنے کے پاس تن بی کی انّا اور مغلانی محمدی خانم رہتی تھیں۔ بڑی بہو صاحب اور منجھلی بہو صاحب بھی صبح سے رات گئے تک باری باری زچہ خانہ میں آکر بیٹھتیں۔ چھوٹی بہو صاحب کو البتہ مبارکباد دینے والی عورتوں سے باتیں کرنے اور بھانڈ بھگتیوں کو انعام دینے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اور وہ بس کھڑے کھڑے آتیں۔ بیٹی اور نواسے کو دیکھ کر چلی جاتیں۔ سکندر زمانی بیگم اشراق کی نماز پڑھ کر دیکھنے آتیں اور عصر کی نماز کے بعد واپس اوپر جاتیں۔ لڑکا ہونے کا تار پاکر تن بی کے دولھا اکرم جاہ بمعہ چھوٹی بہن فرخندہ کے آگئے۔ گیارہویں دن چھٹی نہلائی گئی۔ اس موقع پر چھوٹی بہو صاحب نے حسب عادت خوب مہمانداری کی۔ سارے کنبے اور ملنے والوں میں کٹورا بٹا تھا۔ چھمّو کی ان دنوں موج تھی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ سارا دن دھما چوکڑی مچاتی رہتی۔ ماماؤں، مغلانیوں کی لڑکیوں کو میوہ بانٹتی پھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کا بہت ملال تھا کہ مجھے

بچے کو اس کو کوئی ہاتھ بھی نہ لگانے دیتا تھا۔ کتنی حسرت تھی اُسے گڈو سے بچے کو گود میں لینے کی۔ لیکن جہاں وہ قریب گئی ماں اور تتھیاں چیخیں۔ "اے ہے چھمو بچے کو ہاتھ نہ لگانا۔ بس یونہی پیار کرو۔" چھمو کھسیانی ہو کر بغیر پیار کئے بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی جاتی۔

تجن بی کے بیٹے کا چلّہ نہاتے کے دوسرے روز صبح منجھلی بہو صاحب سر گندھوا رہی تھیں کہ ایک عورت سر پر کسا وا یا ندھے۔ ٹخنوں تک لمبا کرتے پہنے آئی دوسری عورت سر پر صندوقچہ اُٹھائے تھی۔ یہ دونوں سلام علیکم کہہ کر منجھلی بہو صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر پھسکڑا مار کر سامنے بیٹھ گئیں۔ صندوقچہ کھول کر بی تجن نے مدینہ شریف کی کھجوریں دیں اور مکہ معظمہ کی تسبیح بھی۔ آب زمزم بھی پلایا اور خاک شفا بھی دی۔ منجھلی بہو صاحب ویسے تو سمجھدار بیوی تھیں مگر قیصر مرزا کی رنگین مزاجی اور ذکیہ بیگم کی آئے دن کی بیماری اور کمزوری سے پریشان رہتی تھیں۔ اس لئے تجن بی کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ ذکیہ اس وقت بھی نڈھال سی لیٹی ہوئی تھیں۔ تجن نے ان پر دم کیا کمزوری دور کرنے کے لئے الائچیاں پڑھ کر دیں اور قیصر دلہن کے سر پہ ہاتھ پھیر کر سُرمہ کی تھیلی ہاتھ میں دے کر بولیں لے یہ سرمہ اور لگا لیا کرنا۔ تیرا میاں انشاء اللہ خیال کرے گا اور نو مہینے بعد چاند جیسا لڑکا تیرے ہاں ہوگا اس کا نام عوادان محمد رکھنا۔

قیصر دلہن یہ مژدہ سنکر تجن کی توجہ سے میاں اُن کے ہو جائیں گے ایسی خوش ہوئیں کہ جھٹ پٹ بٹوے سے پانچ روپے نکال ان کے ہاتھ پر رکھے۔ منجھلی بہو صاحب نے ململ کا دوپٹہ اور گیارہ روپے دیئے۔ چھوٹی بہو صاحب غسل کر کے نکلیں تو ان کے پاس بھی تجن بی پہنچیں مگر ان کو بچے کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے ان کی طرف توجہ نہ دی اور زچہ خانہ میں کوئی غیر عورت گھس نہ سکتی تھی۔

بڑی بہو صاحب کسی انجان عورت کو منہ نہ لگاتی تھیں۔ بیگم صاحب نیچے اُتریں تو انہوں نے ان کو دیکھ کر تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ بوا بس معلوم ہے کہ تم اللہ والی ہو۔ جاؤ باہر جاؤ۔ دربان سے پوچھا کہ ایک غیر عورت کو اندر کیوں آنے دیا۔ جگن بی نے سمجھ لیا یہ جہاں دیدہ بڑی بی اب میری دال نہ گلنے دیں گی۔ اس لئے چلتی بنیں۔ منجھلے صاحب جب گھر میں آئے اور یہ قصہ سنا تو کہا کہ اس عورت کو پکڑنے کے لئے اعلان اخباروں میں ہو چکا ہے کئی بیوقوف عورتیں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اپنا زیور دے چکی ہیں۔ گورمنٹ نے اس مکار عورت کو پکڑنے کے لئے انعام مقرر کر دیا ہے۔ منجھلی بہو صاحب کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا وہ خواہ مخواہ مکار اور بنی ہوئی جگن کو بھر مٹھی روپیہ دے بیٹھی تھیں۔

جگن بی، سوا مہینہ کا چلہ نہاتے ہی چھوٹی بہو صاحب حیدر آباد جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ گرمی کے تین مہینے وہ ہمیشہ حیدر آباد میں گزارتی تھیں۔ دلی کی سخت گرمی اُن سے برداشت نہ ہو سکتی تھی۔ جنرل صاحب تو دونوں لڑکوں کو لے کر پہلے ہی جا چکے تھے۔ مکرم جاہ بیوی اور ساس کی وجہ سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ صالحہ بیگم بھی سسرال چلی گئی تھیں۔ ذکیہ بیگم، ابھی سفر کرنے کے قابل نہ تھیں ان کو چھٹا مہینہ لگا تھا۔ جب سے دلی آئی تھیں ان کا علاج برابر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ وہ بے حد کمزور ہیں۔ ولادت تک ان کو دلی رہنا چاہیئے۔ منور دلہن کے پہلوٹھی کی لڑکی ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ ان کی چھٹی تک چھوٹی بہو صاحب کو اور ٹھہرنا پڑا۔ مئی کے آخری ہفتے میں وہ حیدر آباد سدھاریں۔ چھمو اس سے تو خوش تھی کہ اپنے پیارے ابا جان اور بھائیوں پاس پہنچ گئی۔ مگر ذکیہ بیگم کی بڑی لڑکی انجم سے جدا ہونے کا اس کو رنج تھا۔ چھمو اور انجو کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ جب تک ذکیہ بیگم دلی رہتیں دونوں ساتھ ساتھ رہتیں۔ بنو بی سے انجو کو

خدا واسطے کا بیر تھا اور پھتّو بھی اس کند ذہن لڑکی کو بیوقوف بناتی رہتیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں بیچاری بتّو بی کی شامت رہتی۔ کبھی اس کی کتاب چھپا دیتیں کبھی تختی۔ وہ گھنٹوں دونوں کی خوشامد کرتی رہتی تو بمشکل دیتیں۔ بتّن بی کو سسرال بھیجتے وقت چھوٹی بہو صاحب نے وہ دو ہزار روپے بھی دے دیئے جو ان کی ساس نے زچہ خانہ کے خرچ کے لئے بھیجے تھے۔ بتّن بی بچاری بھر کم چھٹی لے کر سسرال سدھاریں بچے کا عقیقہ ہوا اور خرم جاہ نام رکھا گیا۔ بتّن بی ابھی اٹھارہ سال ہی کی تھیں۔ امیر گھر کی بیٹی اور نواب کی بہو۔ ناز و نعم میں پرورش پائی ہوئی بالکل الھڑ، بھلا بچے کو کیا رکھتیں۔ اُن کے اپنے ذاتی کام کے لئے دو عورتیں تھیں۔ بچے کے لئے انّا تو تھی ہی جنرل صاحب نے ایک عیسائی ادھیڑ عمر نرس اور رکھ دی۔

---

(۴)

سالانہ بچہ ہونے کی وجہ سے نازک اندام ذکیہ کی صحت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ ویسے تو وہ کچھ بیمار نہ تھی لیکن جوں جوں ایام ولادت قریب آتے جاتے تھے طبیعت نڈھال ہوتی جاتی تھی' دھان پان تو ذکیہ ہمیشہ ہی کی تھیں۔ ہر زچگی کے بعد مہینے دو مہینے بیمار بھی ضرور رہتی تھیں۔ مگر اس مرتبہ تو ان کا کچھ عجیب حال تھا۔ پھول سا چہرہ کملایا ہوا تھا اور دل ہر وقت ڈوبا ڈوبا سا رہتا تھا۔ ولی عہد پھول پور اپنی چہیتی بیوی کو دیکھنے کے لئے دو چار دن کے لئے آتے اور چلے جاتے۔ منجھلی بہو صاحب ذکیہ کی کمزوری کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں سہمی جاتی تھیں۔ بچے تو سبھی ماں کو پیارے ہوتے ہیں۔ لیکن ذکیہ سب میں چھوٹی اور نیک طینت ہونے کی وجہ سے ماں کو بہت پیاری تھیں۔ وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتی تھیں۔ چھوٹی بہو صاحب کے سدھارنے کے بعد رنگ محل میں سناٹا تھا۔ بڑی رونق تو جھبو ہی کی تھی' وہ ہر وقت گاتی' گنگناتی' تالیاں بجاتی ادھر سے ادھر تیتری کے مانند گھومتی رہتی۔ چھوٹی بہو صاحب کو ملنے ملانے کا بھی بہت شوق تھا۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ ان کی ملنے والیاں نہ آتیں اس لئے ان کے سامنے محل میں بہت چہل پہل رہتی۔

اب ذکیہ بیگم کے دل بہلانے کے لئے اپنی ایک رشتہ کی بہن بستی بیگم کو منجھلی بہو صاحب

نے ان کی سسرال سے بلوا لیا تھا۔ یہ بڑی زندہ دل اور ہنسوڑ تھیں۔ سینکڑوں کہانیاں پہیلیاں اور لطیفے ان کو یاد تھے اور گاتی تو ایسا اچھا تھیں کہ ایک سماں بندھ جاتا۔

خالہ فیفو بھی یہاں براجمان تھیں۔ خالہ کی ہستی بھی دلی میں تاریخی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا شجرہ نسب یا تو خدا جانے یا وہ جانیں۔ کون تھیں۔ کیا تھیں کہاں سے آئی تھیں؟ لیکن اب تو شہر کے سارے بڑے گھرانوں میں ان کا آنا جانا تھا اور ہر گھر کی بزرگ بیویاں ان کی خالہ پھپی یا ممانی تھیں۔ جوان بیگمیں بھاوجیں اور بہنیں۔ لڑکیاں بھانجیاں اور بھتیجیاں "کپڑے لتے گہنے پاتے کا خالہ فیفو کو بہت شوق تھا۔

پچھتر برس کی عمر کی آبنوسی رنگ والی یہ بڑھیا اپنے آپ کو جوان جہان کہتی اور ہمیشہ شوخ رنگ کے بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔ ہاتھوں میں مہندی کا رچائے کانوں میں پھولوں کی بالیاں پہنے عطر سے بسی ہوئی خالہ فیفو ہمیشہ چوتھی کی دلہن بنی رہتیں جہاں کسی گھر میں شادی ٹھیری یا بچہ تولد ہونے کی خبر ملی۔ خالہ فیفو اپنی پھپی پٹاری سنبھال کر پہنچ جاتیں۔ اور ان کی شادی خانہ آبادی کے تذکرے چھڑ جاتے۔ زندہ دل بیگموں کے لئے وہ چلتا پھرتا تفریح کا مشغلہ تھیں۔ ان دنوں رنگ محل میں بھی خالہ فیفو کی بدولت خوب رونق رہتی۔ رات کے بارہ ایک بجے تک ان کی شادی کا ذکر ہوتا رہتا۔ سہاگ گیت گائے جاتے اور خوب قہقہے لگتے رہتے۔

ذکیہ بیگم نے طے کیا تھا کہ جب سوا مہینے کا چلّہ نہاؤں گی تو عطن کی بسم اللہ بھی کر دوں گی۔ عطن کا جوڑا منجھلی بہو صاحبہ نے بہت بھاری پہلے ہی تیار کرا لیا تھا اس موقع پر پہننے کے لئے ذکیہ بیگم اپنے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ کاہی رنگ کے بھاری

بنارسی فرشی پائجامے پر کچے گوکھرو کے چنبیلی کے جال کا ٹھپا بنوا کر لگوایا اور عباسی رنگ کے جالی کے دوپٹے پر گوکھرو کے گچھے کی ڈلوائی۔ دوپٹے کے ہم رنگ جالی کی واسکٹ پر بھی چنبیلی کے جال کا ٹھپا لگوایا۔ دوپٹے پر اب صرف کرن آنچل لگنے باقی تھے کہ ذکیہ بیگم کی طبیعت یکایک خراب ہوئی۔ لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو منجھلی بہو صاحب نے بلوالیا شام کو چار بجے ذکیہ بیگم کی طبیعت خراب ہوئی تھی رات کو بارہ بجے خوبصورت تندرست لڑکا پیدا ہوا

ذکیہ بیگم مضمحل تو تھیں مگر اور کوئی بات تشویش کی نہ تھی۔ آرام سے سوگئیں منجھلی بہو صاحب نے بیٹی کے بخیر فارغ ہو جانے پر شکریے کے نفل پڑھے۔

پھول پور لڑکا تولد ہونے کی اطلاع تار سے بھیج دی گئی۔

ذکیہ بیگم کی طبیعت صبح اٹھ کر ایسی نڈھال تھی کہ آنکھ مارے نقاہت کے کھلتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر تو رات سے یہیں تھی۔ منجھلی بہو صاحب نے گھبرا کر اپنے خاندانی معالج ڈاکٹر حکیم حیدر حسین کو بھی بلوالیا۔ دوپہر کو طبیعت زیادہ بگڑی اور شام ہوتے ہوتے ذکیہ بیہوش ہوگئی۔ منجھلے صاحب نے گھبرا کر پے در پے تین ڈاکٹروں کو اور دکھایا اور منجھلی بہو صاحب کے بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اوسان جاتے رہے ڈاکٹر مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اور خون ذکیہ کے ناتوان جسم میں پہنچاتے رہے لیکن موت کے چنگل سے ذکیہ نہ بچ سکی اور بچہ پیدا ہونے کے پورے چوبیس گھنٹے بعد ختم ہوگئیں۔ ولی عہد پھول پور بچے کی ولادت کا تار پاکر چلے تھے۔ اس وقت پہنچے جب بیوی پر عالم سکرات طاری ہوچکا تھا اور وہ اس دنیا میں کچھ دیر کی مہمان تھی۔ انہیں امید تھی کہ گھر میں شادیانے بج رہے ہوں گے۔ یہاں محل پہ موت کی وحشتناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور بیوی بستر مرگ پر پڑی تھی مرنے سے چند منٹ قبل ذکیہ نے آنکھ کھولی، ولی عہد بیوی کو ہوش میں دیکھ

خوش ہوئے اور محبت بھرے لہجے میں اس پر جھک کر کہا۔ "بیگم، شاید وفا تمہاری بیوی کا دم شوہر کو دیکھنے کے لئے اٹکا ہوا تھا۔" آہستہ سے اس کے لب ہلے، دو ہچکیاں آئیں اور ذکیہ کی پاکیزہ روح جنت کو سدھار گئی۔ عبد سبحان پھر گھٹ کر رہ گیا۔

ذکیہ کی موت ایسی ویسی نہ تھی۔ اس کی حسین جوانی نے اپنی عمر کی پچیس منزلیں بھی پوری نہ کی تھیں۔ رنگ محل کے درودیوار سے ماتم کی صدا چلی آتی تھی۔ منجھلی بہو صاحب پیٹتے پیٹتے بیہوش ہو چکی تھیں اور منجھلے صاحب پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ ولی عہد بھول پور جوان مرگ بیوی کی پائنتی بیٹھے ہوئے صدمے کے مارے تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برس رہا تھا۔

سکندر زمانی بیگم بڑے حوصلے والی اور صابر بیوی تھیں۔ روتی بھی جاتیں اور پرسے کو آنے والیوں سے باتیں بھی کر رہی تھیں اور تجہیز و تکفین کا سامان بھی ۔ یہ المناک رات یونہی گذر گئی۔ صبح ذکیہ کے غم میں دامن چاک کر کے نکلی۔ ولی عہد بھول پور کو اُن کے بھائی باہر لے گئے۔ منجھلی بہو صاحب کو ہوش ابھی تک نہ آیا تھا۔ اور منجھلے صاحب کبھی بدحواس ہو کر بیوی کو آواز دیتے کبھی حسرت بھری نظروں سے آخری نیند سونے والی بیٹی کو دیکھتے۔ خدا خدا کر کے صبح آٹھ بجے کے قریب منجھلی بہو صاحب کو ہوش آیا۔ لیکن وہ اپنے آپے میں اب بھی نہ تھیں۔ سکندر زمانی بیگم نے بہو کو گلے سے لگا کر کہا۔ "بس کرو مہتاب دلہن، ذکیہ تو اب اس طرح واپس آنے سے رہی، تم خود کو سنبھالو، میاں کی حالت دیکھو۔ مرد کا غم بہت بُرا ہوتا ہے آخر ذکیہ ان کی بھی تو اولاد تھی۔"

منجھلی بہو صاحب کو پہلی مرتبہ اس کا خیال آیا کہ میرے میاں پر بھی اس حادثہ کا اثر ہوگا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو بُت کی مانند وہ بیٹی کے پلنگ کے پاس کھڑے،

تھے۔ اور اُن کے منھ کا رنگ فق تھا۔ سکندر زمانی بیگم نے پیار بھرے لہجے میں بہو سے کہا۔
"جاؤ دُلہن تم اور منجھلے میاں کمرے میں جاؤ، میں اپنی ذکیہ کے آخری سفر کی تیاری کر دوں۔"

منجھلے صاحب بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں چلے گئے اور دونو میاں بیوی ایک ساتھ مل کر اپنی چہیتی بیٹی کی موت پر آنسو بہانے لگے۔

سکندر زمانی بیگم نے جلدی جلدی تیاری کروا کے آتون جی اور مغلانی سے ذکیہ کو نہلوایا۔ وہ خود کلمے پڑھ کر دیتی جاتی تھیں، دس بجے جنازہ تیار ہوگیا۔ ذکیہ کی حسین صورت مرنے کے بعد بھی دلکش لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی پری بال بکھرائے لیٹی ہے۔ خوبصورت پیشانی پر چھڑکا ہوا کافور افشاں کی مانند چمک رہا تھا اور لبِ لعلیں پر اب بھی ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ یہ منہ بولتی صورت اپنوں پرایوں کو رُلا رہی تھی۔

منجھلی بہو صاحب نے رخصت ہونے والی بیٹی کا آخری دیدار کیا تو پھر پٹنے لگیں گیارہ سال پہلے ذکیہ کو دُلہن بنا کر سسرال وداع کیا تھا اور آج جوانمرگ ذکیہ ہمیشہ کے لئے اِن سے رخصت ہو رہی تھی، یہ دل خراش منظر غمزدہ ماں کا دل خون کئے دیتا تھا۔ لیکن مرنے والی سبز کارچوبی دوشالہ اوڑھے ابدی نیند سو رہی تھی۔

جنازے کے ساتھ منجھلی بہو صاحب بین کرتی ہوئی ڈیوڑھی تک چلی گئیں۔ ماں نے بمشکل اُن کو سنبھالا۔ پلنگ محل سے باہر آیا، خاندان والوں اور جاننے والوں کا جم غفیر ساتھ چلا۔ دو پیش خدمت آگے گلاب پاشی کرتے جاتے تھے۔ جلا لوبان، کافور اور گلاب کی خوشبو سے بسی ہوئی بوجھل ہو رہی تھی۔

قدم شریف میں نازک اندام ذکیہ کو سپردِ لحد کر کے جانے والے ظہر کے وقت واپس آ گئے۔ شام کو قیصر دُلہن کے بنگلے سے کھانا آیا، کھاتا تو کون۔ ہاں کہنے سننے سے دو چار نوالے سب نے زہر مار کر لئے اور منھ لپیٹ کر پڑ رہے۔ منجھلی بہو صاحب کو تو بخار ایسا چڑھا تھا کہ تن بدن کا ہوش نہیں تھا اور ذکیہ کے غم کو بھول کر سب ان

کی خیر منا رہے تھے۔ محل تمام خواتین سے اور دیوان خانہ مردوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ صبح نواب پھول پور معہ بیگم کے آ گئے، بڑی بہو صاحب روتی پیٹتی شام کو پہنچیں۔ صالحہ بیگم زچہ خانے میں تھیں وہ ان کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ جنرل صاحب معہ بیوی کے پھولوں کی شام کو پہنچے 'حیدرآباد دور ہی اتنا ہے' چھوٹی بہو صاحب کو راستہ کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ذکیہ جنرل صاحب کی بہت چہیتی بھتیجی تھی۔ رنج کے مارے ان کا بھی عجیب حال تھا۔ اپنے کو بہت سنبھالتے تھے مگر دل بھرا آتا تھا۔ اسٹیشن پر ہی منجھلے بھائی سے لپٹ کر رونے لگے۔ گھر پہنچے تو بھاوج کی غم زدہ صورت کو دیکھ کر اُن کی ہچکی بندھ گئی۔ چھوٹی بہو صاحب بھی جٹھانی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر دہاڑیں مار کر رو دیں۔

چھوٹی ان سب کو روتا دیکھ کر بسورنے لگی اور انجو کے ساتھ مل کر کچھ دیر آنسو اُس نے بھی بہائے۔ مگر ان دونوں کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ باقاعدہ غم کرتیں۔ کچھ دیر بعد ہی انجو نے اپنی گڑیاں نکال لیں، اور دونوں کھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔

منجھلی بہو صاحب پر جوان مرگ بیٹی کی موت سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ مرنے والی کو روئیں یا اس کے نوزائیدہ بچے کو سنبھالیں۔ ان بن ماں کے بچوں کی دیکھ بھال کریں جو کمسنی میں ماں کی آغوش محبت سے محروم ہو گئے۔ غم زدہ داماد کی دلجوئی کریں۔ یا اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھالیں۔

وہ بہت وضعدار بیوی تھیں۔ ہر وقت کنگھی چوٹی سے درست رہا کرتی تھیں لیکن ذکیہ کے انتقال کے بعد ان کو کپڑے بدلنے کا ہوش رہا تھا نہ بال سنوارنے کا ساس کے بہت کہنے سننے سے غسل کر لیتیں یا کپڑے بدل لیتیں تو سر دو دو دن کھلا پڑا رہتا۔ کھانا برائے نام رہ گیا تھا وہ تھیں اور ذکیہ کا غم —

پھول پور والے تو سب پھولوں کے بعد چلے گئے، ساس رہ گئی تھیں۔ وہ بھی چالیسواں کر کے چلی گئیں۔ ولی عہد چہلم تک رہے۔ وہ صبح بیوی کی قبر پر چلے جاتے

مٹھائی اور موسمی پھل غربا کو تقسیم کرتے اور پھولوں کی چادر چڑھا کر دوپہر کو بارہ بجے تک واپس آتے تھے اپنی حسین اور نوجوان بیوی کے غم میں واقعی وہ گم ہو گئے تھے۔

پھر چہلم پر نواب آئے تو بیٹے انجو۔ عطن اور شاپور کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ بڑا لڑکا شارخ مرزا تو ہمیشہ ہی دادی کے پاس رہتا تھا۔ نومولود منجھلی بہو صاحب کے پاس رہا۔ اس کی دیکھ بھال میں اُن کا کافی غم غلط ہوتا تھا۔ تنہا بھی وہ اپنی مرحومہ ماں کی تصویر۔ اس کو گلے سے لگائے منجھلی بہو گھنٹوں رویا کرتی تھیں۔

---

(۵)

سدا خوشی کے دن رہتے ہیں نہ غم کے۔ ولی عہد بیوی کی چھ ماہی کے فاتحہ پر جو دلّی آئے تو واپسی پر بہت اصرار سے ساس کو اپنے ہمراہ پھول پور لے گئے۔ منجھلی بہو صاحب کو بھی نواسیوں کا خیال تھا۔ اس لئے چلی گئیں۔ انجم اُن سے بہت مانوس تھی اور برابر ساتھ چلنے کے لئے ضد کر رہی تھی۔ لیکن پھول پور میں ان کے سامنے ہر وقت مرنے والی کی صورت رہتی تھی۔ اس لئے ایک مہینہ جوں توں کر کے کاٹا اور پھر جلدی واپس آنے کی تیاری کر لی۔ روانگی سے ایک دن پہلے کی شام کو نواب پھول پور چھوٹی بھاوج سے ملنے آئے تو انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔ فریدوں بخت نواب دُلہن کے بعد سے ہر وقت افسردہ اور کھویا ہوا سا رہتا ہے، انشا تو در کنار میں نے اس کو چھ مہینے میں مسکراتے بھی نہیں دیکھا۔

منجھلی بہو صاحب۔ (سرد آہ لے کر) بولیں۔ "ہاں آغا صاحب ذکیہ کی موت نے فریدوں میاں کا گھر اُجاڑ دیا اور میاں بیوی میں جہاں اتنا اتفاق ہو وہاں ایسا ہوتا ہی ہے، خدا ان کے دل کو چین دے، مرنے والی تو اب آنے سے رہی۔" نواب صاحب جلدی سے بولے "یہی تو میں کہتا ہوں، بھاوج! کہ فریدوں کے گھر بسانے کا فکر ہمیں کرنا چاہیئے۔ ان کی ہر وقت کی اُداسی سے مجھے یہ خیال ہے

خدانخواستہ کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ اس عمر کا غم بہت بُرا ہوتا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں شادی ہوئی۔ اس لئے فریدوں پانچ بچوں کے باپ بن گئے ورنہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔"

منجھلی بہو صاحب کے دل پر اس ناگوار تذکرے سے بڑا اثر ہوا۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ تھیں بہت صابر بیوی' دل سنبھال کر بولیں۔ "آپ کا فرمانا درست ہے۔ فریدوں میاں کی شادی ضروری ہے اور جلدی ہو جانی چاہیئے۔ بچے بدنصیب تو بن ماں کے ہو گئے ان کو تو ماں ملنے سے رہی۔ مگر فریدوں میاں کا گھر تو بس جائے گا۔"

نواب صاحب نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ایسی لڑکی سے رشتہ طے کیا جائے جو ان بچوں کا خیال کچھ تو کر سکے۔"

منجھلی بہو صاحب اشک آلود لہجے میں بولیں "میرا تو دماغ کام نہیں کرتا آپ ہی کچھ بتایئے۔"

نواب صاحب نے کہا۔ "ادھر اُدھر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے' جنرل کی لڑکی منجو کنبہ کی بیٹی ہر طرح اچھی اور تمہاری بھانجی ہے۔"

منجھلی بہو صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "بھلا آقا صاحب۔ آپ نے بھی کہاں خیال دوڑایا۔ جنرل تو سرے سے چھوٹی سی عمر کی شادیوں کے خلاف ہیں منجو ابھی پندرھویں میں لگی ہے۔ تمن کی شادی انہوں نے بڑی مشکل سے کی تھی۔ زرتاج دلہن نے میاں سے لڑ جھگڑ کر اپنے بھتیجے سے شادی کی' جنرل بالکل رضامند نہ تھے۔ پھر وہ اپنی نازو نعم میں پلی لڑکی کو پانچ بچوں پر کیوں دینے لگے۔ وہ پیغام اب بھی بہت اچھے منجو کے آئے ہوئے ہیں۔ لیکن جنرل رضامند ہیں نہ دلہن کی مرضی ہے اور آپ میری دیورانی کے مزاج سے تو واقف ہیں' تمن کی شادی میں خود بھی

بے تحاشہ روپیہ صرف کیا اور بھائی کا بھی اٹھوایا۔ بھلا آپ اپنے بیٹے کے نکاح کے موقع پر اتنے چاؤ چونچلے کیسے کر سکیں گے۔"

نواب صاحب "خیر میں لکھتا تو ہوں جنرل کو۔ آپ بھی جا کر اپنی دیورانی کو سمجھائیں۔"

منجھلی بہو صاحب نے بیدلی سے کہا۔ "اچھا" اور مغرب کی نماز کے لئے اٹھ گئیں ان کے دل میں غم کی جو چنگاری سلگ رہی تھی اس کو اس ذکر نے بھڑکا دیا۔ نماز پڑھ کر وہ بہت دیر تک سجدے میں پڑی روتی رہیں اور رات کو کھانا بھی انہوں نے نہیں کھایا۔ دوسرا دن اُن کا جوں توں کٹا' رات کو نو بجے والی ٹرین سے روانہ ہو کر وہ تیسرے دن شام کو دہلی پہنچ گئیں' نواب صاحب کا خط یہاں بھی پہنچ چکا تھا۔ چھوٹی بہو صاحب نے چھوٹتے ہی سلام کے بعد جیٹھانی سے کہا۔ "بھابی جان آپ نے بھی اپنے سمدھی کو منع نہ کیا۔ ان کا حوصلہ کیسے ہوا' کہ انہوں نے میری بچی کا نام لیا' میں ایسی سات ریاستیں قربان کر دوں اپنی منجو پر سے — ذکیہ بھی تو ہماری بیٹی ہی تھی۔ آپ کے دیور اس کو بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ کیا ہم ایسے گئے گذرے ہیں کہ ذکیہ نہ رہے اور ہم اپنی بیٹی دیں۔ پھول پور والوں میں تو انسانیت نام کو نہیں۔ ابھی مرنے والی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا' اور ان کو شادی بیاہ کی پڑ گئی" پھر وہ دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھنے لگیں۔

غم نصیب منجھلی بہو صاحب کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ وہ دیورانی کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ جب ذرا دل ٹھہرا تو بولیں۔ "دلہن میری کوئی سنتے بھی۔ میں نے تو آکا نواب صاحب کو منع کیا تھا۔ مگر وہ نہ مانے۔

چھوٹی بہو صاحب بولیں۔ "آپ تو اس سے واقف ہیں کہ صاحب تو ابھی منجو

بنو کی شادی کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتے۔"

منجھلی بہو صاحب (رومال سے آنسو صاف کرکے) "ہاں دُلہن مجھے سب معلوم ہے مگر میرا معاملہ ایسا ہے کہ میں سختی سے ان کو منع نہیں کرسکتی تھی، بن ماں کے بچوں کا خیال دامنگیر تھا۔ جنرل آپ ہی انکار کردیں گے، مجھے یا تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

جنرل صاحب نے اِن دونوں کے خیال کے مطابق نواب فضل پور کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ مگر نواب صاحب کو بیٹے کا گھر بسانے کی دُھن سوار ہوگئی تھی۔ وہ مع ولیعہد کے دہلی آدھمکے اور دو تین اچھے گھرانوں میں پیغام بھیجا۔ مگر بھلا کوئی برابر والا کیسے پانچ بچوں پر اپنی لاڈلی بیٹی دے دیتا۔ آخر کئی دن کے غور وفکر کے بعد قیصر مرزا کی لڑکی بنو پر ان کی نظر ٹھیری اور نواب صاحب نے یہ تجویز منجھلی بہو صاحب کے سامنے رکھ دی، وہ ان کے خیال کی اس پرواز پر بھونچکا ہو کر رہ گئیں۔

بنو بی نے ابھی اپنی عمر کے گیارھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ یہ کمسن بچی بھلا ابھی ولیعہد بیگم بننے کے کب قابل تھی۔ اور یہی عذر انہوں نے کیا۔ لیکن نواب صاحب نے مطمئن لہجے میں کہا، "بھاوج، بچوں کی بہتری کے خیال سے یہی بہتر ہے کہ بنو سے فریدوں بخت کا نکاح کردیا جائے، وہ تمہاری پوتی بھی ہے اور کمسن بھی۔ کوئی غیر زیادہ عمر کی لڑکی آئے گی تو بچو اور علطن کے ساتھ اس کی بنھنی مشکل ہے۔"

منجھلی بہو صاحب کو دل تھام کر بچوں کے خیال سے پوتی کو دینے کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ منجھلے صاحب کو تار دے کر نواب صاحب نے جودھ پور سے بلالیا۔ سکندر زمانی بیگم کی بھی صلاح بنو کو دینے کی بالکل نہ تھی۔ مگر نواب صاحب نے ممانی کے قدموں پہ ٹوپی ڈال دی اور وہ مجبور ہوگئیں۔ منجھلے صاحب حیران تھے اور خاموش۔ معاملہ ایسا تھا کہ ہاں کہتے بن پڑتی تھی نہ نا ـــــ

قیصر مرزا کو بیوی سے دلچسپی تھی، نہ اولاد سے ــــ مگر بظاہر وہ بھی کچھ خوش نہ تھے، بزرگوں کے سامنے ان کی چلتی بھی کیا۔ نواب صاحب کو پھول پور واپس جانے کی جلدی تھی، بات ٹھیرتے ہی دو دن بعد جمعہ کی شام شہر بانو بیگم عرف بنو بی کا نکاح بعوض سوا لاکھ سکہ چہرہ شاہی مرزا فریدوں بخت ولی عہد پھول پور سے ہو گیا۔

کمسن بنو لڑکی سے دُلہن بن گئی اور پانچ بچوں کی ماں بھی۔ لیکن آغاز و انجام سے بے خبر یہ ننھی منی دلہن اپنے سرخ زرکار لباس اور بے انتہا زیور کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ مگر رنگ محل کے در و دیوار آج بھی ذکیہ بیگم کا ماتم زبانِ حال سے کر رہے تھے اور ماحول غمگین تھا۔ نہ پھاٹک پر نوبت بج رہی تھی، نہ اندر ڈومنیاں گا رہی تھیں نہ مہمان بیگمات کا ہجوم تھا نہ چہل پہل۔

منجھلی بہو صاحب اپنے کمرے میں پڑی جوانمرگ بیٹی کی یاد میں آنسو بہا رہی تھیں۔

صالحہ بیگم کا بہن کی یاد میں دل بھر آتا تھا۔ لیکن بھاوج کے خیال سے دل پہ جبر کرکے نکاح کے وقت بھتیجی کو گود میں لیکر وہی بیٹھیں۔ بنّن اور منجو نے بنّو کے مہندی لگائی اور اس کو سنوارا بھی لیکن قیصر دلہن کی نظر بچا کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بھی صاف کرتی جاتیں۔ چھوٹی بہو صاحب کبھی بنّو کے پاس آتیں اور کبھی جیٹھانی کی دلجوئی کرتیں اور خود بھی آہیں بھرتی جاتیں۔ بڑی بہو صاحب سب سے الگ تھلگ، اپنے دالان میں خاموش بیٹھی تھیں۔ البتہ سکندر زمانی بیگم نے آج بھی اپنے استقلال کا پورا ثبوت دیا۔ بڑی مستقل مزاج بیوی تھیں۔ ان کی تیوری پر بل تھا نہ ہونٹوں پر آہ۔ نکاح کے بعد بنو کی پیشانی چومی۔ اس کی چٹا چٹ بلائیں لیں۔ قیصر دُلہن کو مُبارکباد دی اور روتی ہوئی منجھلی بہو کو گلے لگا کر بولیں۔ ”دلہن یہ شگون کا وقت ہے دل کو سنبھالو، خدا کا شکر ہے، بنّو اچھے گھر گئی۔ پھولے پھلے

خوش رہے۔"

قیصر دلہن بُرا سا منہ بنائے بڑبڑاتی پھر رہی تھیں۔ "میرا میاں بھی اچھا ہوتا تو میری بچی کو صدقے کا بکرا کیوں بنایا جاتا۔ ہائے یہ ننھی سی جان پانچ بچوں کو کیسے بھگتے گی۔"

انجو اور بھیّو ان جھگڑوں سے دور اپنی گڑیوں کی شادی رچائے بیٹھی تھیں، نکاح کے دو دن بعد ہی نواب صاحب بیٹے کو لیکر بھوپال چلے گئے۔

نجو کا نکاح ولی عہد سے ہونا تھا کہ قیصر دلہن کے دن پھر گئے۔ میاں نے ان کو کبھی نہ پوچھا تھا۔ خسران کا پورا خرچ اٹھاتے تھے۔ کھانا کپڑا تو ان کا بچوں سمیت ساس کے ساتھ ہی تھا۔ اوپر کے خرچ کے لئے وہ بہو کو پچاس روپے ماہوار دے دیا کرتی تھیں سوتیلی ماں کی وجہ سے میکے میں قیصر دلہن کی زیادہ نہ بنتی تھی۔ اب مہینے کے مہینے دو سو روپے بنّوبی کے پاندان خرچ کے آتے تھے اور ولی عہد جب بھی دلی آتے۔ میوہ مٹھائی تحفے لاتے۔ ٹھہرتے وہ اب بھی بھوپال ہاؤس ہی میں تھے۔ لیکن دوپہر کا کھانا روز رنگ محل ہی میں کھاتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ منجھلی بہو صاحب کو سلام کرکے قیصر دلہن کے کمرے میں گھس جاتے۔ پھر کھانے کے وقت ہی باہر نکلتے۔ بنّوبی کے نکاح کے بعد سے انجو اور عظمیٰ نانی کے پاس تھیں عظمیٰ تو بہت چھوٹی تھیں۔ انجو کو ماماؤں اور مغلانیوں نے یہ بتا دیا کہ بنّوبی اب صرف تمہاری ماموں زاد بہن نہیں سوتیلی ماں بھی ہیں کھیل کود میں ان کے ساتھ شوخی نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے لئے بُرا ہوگا۔

گو انجو پہلے ہی ضدی لڑکی تھی مگر ماں کی بے وقت موت نے اس کے ننھے دل میں اور بھی غم کی تلخی بھر دی تھی۔ اور اس کا مزاج بہت بگڑ گیا تھا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ بنّو کو ستاتی تھی۔ کبھی اس کا منہ چڑاتی۔ کبھی کتاب پھاڑ دیتی اور کبھی

ریشمی چندری کا گوٹا نوچ لیتی۔ چھو اور انجو غریب تنو کو بعض اوقات ایسا ستاتیں کہ وہ بیچاری رو دیتی۔

قیصر دُلہن کو چاہیئے تھا کہ انجو کی طفلانہ شوخیوں کو نظر انداز کر دیتیں لیکن وہ بہت چھچھلے مزاج کی عورت تھیں۔ انہوں نے داماد سے انجو کی شرارتیں تفصیلی طور پر بیان کیں۔ اور ولی عہد نے نئی دلہن کے خیال میں مگن ہو کر انجو کو خوب ڈانٹا۔ منجھلی بہو صاحب کو یہ بہت ناگوار گزرا لیکن بہو کو کچھ نہ کہہ سکتی تھیں نہ داماد کو انہوں نے اپنا غصہ انجو پر اُتارا اُس کے دو تھپڑ مار کر بولیں۔ "بدنصیب تو یہ نہیں سمجھتی کہ تیری ماں مر چکی ہے۔"

انجو ہمیشہ سے نانی کی لاڈلی تھی۔ غصہ میں آکر اور بھی شرارتیں کرنے لگی۔ پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ آتون جی کی ایک نہ سنتی، دن بھر واہی تباہی ماری ماری پھرتی۔

تنو کا عقد ہوئے اب سات مہینے ہو چکے تھے بھلا کب تک ولی عہد اپنے محل کو سونا رکھتے اس مرتبہ وہ وداع کی تاریخ مقرر کرنے آئے تھے۔ قیصر دلہن سے مشورہ کیا وہ تو خدا سے چاہتی تھیں کہ تنو جلدی سے وداع ہو جائے اور وہ اس کے ساتھ جا کر رہیں اور خود مختار زندگی بسر کریں۔ انہوں نے جھٹ پٹ منظوری دیدی

نواب پھول پور ایسے ضعیف تو نہ تھے کہ کاروبار ریاست انجام نہ دے سکتے ہوں۔ مگر انہوں نے روپیہ اپنی غیر معمولی فیاضی اور کچھ رنگین طبیعت کے باعث ایسا اڑایا تھا کہ ریاست بہت مقروض ہو گئی تھی، فریدوں بخت اپنے باپ سے بہت مختلف تھے انہوں نے انتظام ہاتھ میں لیا۔ تو ریاست پر سے کافی قرضے کا بار اُتر گیا۔ اس لئے ریذیڈنٹ بہادر کا مشورہ تھا کہ نواب صاحب فریدوں بخت کو باقاعدہ نواب بنا دیں اور خود دست بردار ہو جائیں۔ نواب صاحب نے

پینتیس سال خوب دھوم سے حکومت کی تھی۔ دل کھول کر داد عیش دی تھی۔ اس عالم میں الگ ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ دسہرے کے دربار پر کرسمس کی تعطیلوں میں مرزا فریدوں بخت کی مسند نشینی کا اعلان کر دیا اور اس سے قبل بیگم کا محل میں آجانا ضروری تھا۔ اس لئے قیصر دلہن نے رخصتی کی تاریخ نومبر میں دے دی۔ بھ چھوانے کو دلیعہد صاحب نے منجھلی بہو صاحب سے کہا کہ نومبر میں کوئی اچھی تاریخ بیگم کے پھول پور جانے کی ٹھہرا دیں۔"

انہوں نے کہا۔ "میاں، اب وہ تمہاری ہو چکی، جب چاہو لیجاؤ، اس کی ماں سے کہو، اماں جان سے پوچھو۔"

سکندر زمانی بیگم سے حجاب کی وجہ سے ولی عہد خود کچھ نہ کہہ سکے، باپ کو لکھا انہوں نے مومانی کو لکھ کر تاریخ طے کر لی، اور سکندر زمانی بیگم نے بہو سے مشورہ کر کے رجب کی اکیس تاریخ مقرر کر دی۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا۔

بیوی کا جہیز جس دن سے نکاح ہوا تھا، قیصر دلہن چپکے چپکے تیار کر رہی تھیں۔ منجھلی بہو صاحب نے جو پوتی کے لئے دس جوڑے پہلے تیار رکھے تھے بس وہی رکھے تھے۔ اب تو ذکیہ کے غم میں وہ خود کو بھولی ہوئی تھیں۔ قیصر دلہن اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ مرحوم ماں نے ان کو انگارول جہیز دیا تھا۔ میاں کی لاپرواہی کے باعث اُن کا دل ایسا پژمردہ ہو گیا تھا کہ شادی کے بعد پانچ سات برس جو پہنا سو پہنا۔ جب سے بیوہ سانی ہوئی تھی شوخ رنگ کے چمکیلے کپڑے انہوں نے پہننے چھوڑ دیئے تھے۔ اپنی ہی جہیز میں سے انہوں نے ادھیڑ بن کر کے اکیس جوڑے بہت اچھے ہو کے لئے تیار کرائے۔ دس پہلے تھے۔ زیور ان کو میکے سے جو ہرا جو ہرا ملا تھا۔ سادہ الگ جڑاؤ الگ۔ چڑھاوے کے زیور کا تو کہنا ہی کیا۔ سکندر زمانی بیگم نے ان کو سب اپنا زیور دیا تھا۔ ان کی نتھ کے موتی ہی پانچ ہزار کے جوہری نے

ٹانکے تھے۔ ان زیوروں میں سے صرف ہیرے کی پونچیاں ہی قیصر دلہن نے
بنّو کو دیں۔ جہیز کے زیور میں سے آدھا ستارہ کے لئے رکھ دیا اور آدھا بنّو کو
دیا۔ جو سونے کا تھا اُسے اُجلوایا۔ جڑاؤ کے ڈورے بدلوائے، بھاری بھاری
تانبے کے برتن تو رکھے رکھے ہی زنگ آلود ہو گئے تھے۔ ان پر قلعی کروائی۔ چھپر کھٹ
کا پردہ اِن کا سچے تاش کا تھا۔ وہ اب بھی جگمگا رہا تھا۔ لحاف، توشک،
تکیے اور گل تکیے اور تیار کرلئے اور سب سامان نک سک سے درست کرلیا۔
منجھلی بہو صاحب نے تاریخ ٹھہرتے ہی قیصر دلہن کو تین ہزار روپے دے
کر کہا۔ "دلہن بنّو کا جہیز تم خود دیکھ بھال کر تیار کروا دینا۔ میرا تو دماغ کام
کا ہی نہ رہا۔ قیصر دلہن روپوں کی تھیلی ساس کو واپس دے کر بولیں۔ زیور
کپڑے تو میں نے سب درست کر لئے ہیں۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں۔ جو کمی ہو گی وہ
پوری کر دوں گی۔ صرف دولہا کی سلامی خلعت اور اوپر کا خرچ ہے۔ وہ آپ
جانیں اور آپ کا کام۔"

بنّو بی کو تاریخ وداع سے ایک شام پہلے مایوں بٹھایا گیا اور دوسرے
دن رات کا کھانا کھلا کر منجھلی بہو صاحب نے پوتی کو رخصت کر دیا۔ دولہا کی
جانب سے نواب اُن کے چند قریبی رشتہ دار اور اہلکار ساتھ آئے تھے، بنّو بی
وداع ہو کر پھول پور ہاؤس پہنچیں تو یہاں خوب رونق تھی دروازے پر شہنائیاں
بج رہی تھیں۔ اور ریاست کے قوال بھی گا رہے تھے۔ قیصر دلہن اس بات پر
کافی برہم تھیں کہ ان کی بھتیجی بیٹی کی رخصتی ایسے چپ چپاتے کی گئی۔ دوسری صبح
بیٹی کو لینے وہ خود پھول پور ہاؤس پہنچ گئیں۔ نواب صاحب نے بہو کو بیش بہا
ہیرے کی ہیکل رونمائی میں دی اور شاہ دلہن خطاب دیا۔ چوتھی کی رسم بھی سسرال
ہی میں بنّو بی کی ہوئی، رات کو قیصر دلہن بیٹی کو لے کر رنگ محل آگئیں اور دو دن

بعد نواب صاحب دولھا دلہن کو لے کر پھول پور سدھارے۔

قیصر دلہن نے بہت رو رو کر بیٹی کو وداع کیا۔ تمو کی انا اور منجھلی بہو صاحب کی مغلانی بستی بیگم ساتھ گئیں۔ پہلی دفعہ کی بات تھی اور تمو ابھی کمسن تھی اس لئے ایک ہفتے بعد ہی منور مرزا تمو کو جاکر لے آئے۔ تمو اپنی پھوپھی کی طرح تو حسین نہ تھی لیکن سکندر زمانی بیگم کے خاندان میں بد صورت کوئی بھی نہ تھا۔ تمو بھی گوری چٹی، بھولی بھولی صورت کی گداز جسم کی لڑکی تھی۔ اتنے سارے عمدہ زرکار جوڑے اور خوبصورت عمدہ مرصع زیور پاکر تو وہ خوش تھی لیکن ولی عہد کو دیکھتے ہی وہ سہم جاتی اور اس کا منہ سفید پڑ جاتا۔ ان کو اس نے پھوپھا کے روپ میں دیکھا تھا۔ نکاح کے بعد بھی کچھ دنوں وہ میاں کو پھوپھا جان ہی کہتی رہی۔ ماں نے بڑی مشکل سے گھڑک گھڑک کر اس کی یہ عادت چھڑائی تھی۔ لیکن لاشعوری طور پر اب بھی اس کے ننھے سے دل پر ولی عہد صاحب کی بڑائی کا رعب غالب تھا۔ جب وہ پیار بھرے لہجے میں اس کی معصوم اور حیران آنکھوں میں جھانک کر کہتے "بیگم" تو وہ انجانے طور پر کانپ جاتی۔ لیکن یہ چھوٹی سی لڑکی واقعی اب بیگم بن چکی تھی۔ اس لئے بیچاری سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ ویسے تو تمو کی فطرت شروع ہی سے کھلنڈری تھی شادی ہو جانے کے بعد اور بھی اس کی طبیعت بجھ گئی۔ لیکن لڑکپن کی عمر بھی کبھی کبھی اس کو کھیل کی طرف متوجہ کر دیتی تو قیصر دلہن اس کو تیز نگاہ سے دیکھ کر کہتیں۔ "تمو اب تمہاری شادی ہو گئی۔ بھلا اب تم اس قابل کہاں کہ چھمو اور انجو کے ساتھ گڈے گڑیاں لگاؤ۔ کب تم کو عقل آئے گی جب ہی تو انجو تمہاری عزت نہیں کرتی"

بیچاری لڑکی دل مسوس کر رہ جاتی۔ چھمو اور انجو کو جھولا جھولیں لگاتے گاتے اور ہنستے ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی اور اپنی جگمگاتی ریشمی پوشاک کبھی گھونگھر

ایک نفرت بھری نظر ڈالتی ۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک آہ آجاتی اور دل اپنی بے بسی پر بھر آتا ۔ لیکن کہیں ماں نہ دیکھ لے اس ڈر سے وہ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو جلدی سے پونچھ ڈالتی ۔

جنوری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، اندر کے دالان کے سرخ پناٹی کے پردے چھوٹی بہو صاحب کا حکم تھا۔ دس بجے سے پہلے نہ باندھے جائیں۔ کیونکہ چھمو بلا کی شریر تھی۔ صبح سے اُٹھ کر باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دیتی تھی۔ کرسمس کی تعطیلوں میں قمر اور انور بھی آئے ہوئے تھے۔ قمر تو ہمیشہ سے سنجیدہ تھا۔ لیکن انور میاں کا نمبر شرارت میں چھمو سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ جب یہ دونوں اکھٹے ہو جاتے تو ان کی بے پناہ شوخیوں سے چھوٹی بہو صاحب چیخ اُٹھتی تھیں۔ اس وقت بھی یہ تکیے اچھال رہے تھے۔ اور رنگ برنگ کی آوازیں نکال کر سارا دالان سر پہ اُٹھا رکھا تھا۔

کیونکہ دو دن سے بوندا باندی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اس لئے سردی اور بھی بڑھ گئی۔ برفیلی ہوائیں جسم کے پار ہوئی جا رہی تھیں۔ مگر منجھلی بہو صاحب بمع منور دلہن کے آج صبح گیارہ بجے والی ٹرین سے پھول پور جا رہی تھیں۔ اس لئے صبح سویرے ہی سے چائے ناشتے سے فراغت پا کر انہوں نے چلنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

بلا وے تو سب ہی کے آئے تھے مگر سکندر زمانی بیگم نے تو زیادہ سردی ہونے

کا عذر کر دیا۔ چھوٹی بہو صاحب کو جب سے بنجو بی کا پیغام نواب پھول پور نے دیا تھا پھول پور والوں پر غصّہ تھا۔ ویسے بھی ان کا پاؤں بھاری تھا اور یہ بہانہ ان کو اچھا ہاتھ لگا تا ساز ئی طبع کا عذر کر کے ٹال گئیں۔ بڑی بہو صاحب لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہ تھیں، انہوں نے صاف کہدیا۔ "بوا پھول پور کون جائے' اپنی ہڈی پسلی ایک کرنے۔ نگوڑا راستہ ہے کہ شیطان کی آنت' کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اس جاڑے پالے میں بھلا اپنا گھر کا آرام چھوڑ کر کیسے جاؤں۔ ڈبہ ہوتی تو خیر، آپ کی خاطر چلی بھی جاتی' اب کون جا کر اپنا جی جلائے۔"

بڑے صاحب سے نواب پھول پور کی دوستی بہت تھی۔ وہ ان کے ساتھ کے کھیلے اور ہمسن تھے۔ اس لئے وہ تو نواب صاحب کے بلاوے پر چار دن پہلے ہی جا چکے تھے۔ منجھلے صاحب مع بیوی' چھوٹے بیٹے' بہو کے اب جا رہے تھے۔ قیصر مرزا نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ گویا بنجو بی کی شادی پر بھی ان کا اظہار نا راضگی تھا جب باپ نے ان سے چلنے کے لئے بہت کہا' تو ان کو جواب تو نہ دیا۔ شکار کھیلنے چل دیئے۔ جرنل صاحب کو بھلا حیدرآباد سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ صالحہ بیگم کو خدا نے دو لڑکیوں کے بعد لڑکا دیا تھا اور ابھی وہ چلّے میں تھیں اس لئے نہیں جا سکیں۔ غرض دہلی کا قافلہ بھی مسند نشینی سے ایک دن پہلے پھول پور پہنچ گیا۔ قیصر دلہن تو جب دوبارہ بنجو بی آئی تھیں ان کے ہمراہ ہی آ گئی تھیں۔ خانہ داری کا تمام کام اور محل کا انتظام انہیں کے سپرد تھا۔ نواب بیگم دائم المریض تھیں اور ان کی تینوں لڑکیاں بڑے رئیسوں کی بیگمیں تھیں۔ اس لئے اپنی ہی شان و شوکت دکھانے لباس اور زیور کی نمائش کرنے میں مصروف رہتیں۔ آنے والوں کی آؤ بھگت کرنے کی ان کو کہاں فرصت تھی اس لئے سارے محل پر قیصر دلہن کا راج تھا۔ بنجو بی تو بس بنی سنوری گڑیا کی طرح بیٹھی ماں کے اشارے پر چلتی رہتی تھیں

مرزا فریدوں بخت کی مسند نشینی بہت دھوم سے ہوئی۔ ریاست کی ساری کوٹھیوں کے علاوہ بہت سے ڈیرے خیمے مہمانوں کے لئے لگے ہوئے تھے۔ ہر حیثیت اور ہر منصب کے لوگ تھے۔ نواب پھول پور کا بڑھاپا تھا لیکن شوقین مزاج رئیس تھے۔ اس لئے ریاست کی طوائفوں اور قوالوں کے علاوہ دہلی سے بھی کشمیری بھانڈوں کا طائفہ اور دو اچھی گانے والی طوائفیں بھی آئی تھیں۔ اجمیر کے قوالوں کی ٹولی بھی تھی۔ صبح سے رات تک گانے بجانے، غل شور کے مارے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ مسند نشینی کے بعد مہمان رخصت ہوئے اور اطمینان ہوا تو منجھلی بہو صاحب کو یہ سمجھنے کا وقت ملا کہ بچے کس طرح رہ رہے ہیں اور قیصر دلہن کا برتاؤ کیسا ہے۔ دونوں لڑکوں کو تو محل سے کوئی مطلب نہ تھا۔ بڑا تو ہمیشہ سے دادی کا لاڈلا تھا اور ان کے پاس رہتا تھا۔ چھوٹا ماں کے مرنے کے بعد تب سے ان کے گلے کا ہار رہتا تھا۔ عظمیٰ ابھی چھوٹی تھی۔ بھلا پانچ سال کی بچی کو بھلے برے کی تمیز ہی کیا ہوتی، تھی بھی فطری طور پر ہنس مکھ۔ ہر حال میں خوش رہتی تھی۔ مشکل تو انجو کی تھی۔ وہ ماں کی بہت چہیتی تھی اور ان کی بے وقت موت نے اس کو بہت زود رنج بنا دیا تھا۔ یہ آٹھ برس کی ننھی سی بچی چھوٹے بہن بھائیوں کا خود کو محافظ سمجھتی تھی۔ اور قیصر دلہن کی بے جا سختی کی وجہ سے دن بدن اس کے مزاج کی تلخی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ماں کی زندگی میں بھولی بھالی پیاری شکل والی انجو ہمیشہ صاف ستھری رہتی تھی، لیکن اب کون تھا جو اس کا خیال رکھتا۔ یوں تو اس کی انا موجود تھی۔ لیکن یہ ضدی لڑکی گھنٹوں بہلانے پھسلانے پر بھی اس کے قابو میں نہ آتی۔ قیصر دلہن اس کو ہر وقت برا بھلا کہتی رہتی تھیں۔ اس لئے جب بھی انجو کو موقع ملتا بوبی کا منھ چڑاتی، نقلیں اتارتی اور اپنی بے پناہ شرارتوں سے ان کا ناک میں دم کر دیتی۔ قیصر دلہن ایسے موقعوں پر جو منھ میں آتا کہتیں

اور کبھی کبھار تھپڑ بھی مار بیٹھتیں، منجھلی بہو صاحب کو بہو کا یہ انداز پسند نہ تھا لیکن قیصر دلہن پر تو ان کا بس نہ چلتا تھا وہ بھی تو اسی کو کوستیں اور بُرا بھلا کہتیں۔

ذکیہ کی حسین صورت ہر دم ان کی آنکھوں میں پھرا کرتی۔ اس لئے مسند نشینی کے ایک ہفتے بعد ہی وہ جانے کو تیار ہو گئیں۔ لیکن مرزا فریدوں بخت نے جو اب نواب پھول پور تھے کہا۔ "ایسی بھی کیا جلدی، آپ کچھ دن تو ٹھیریئے۔"

منجھلی بہو صاحب نے کہا۔ "بیٹا تمہارے چچا کی چھٹی آٹھ دن کی تھی۔"

نواب صاحب نے کہا۔ "ان کو جانے دیجئے، آپ کو میرا سکریٹری پہنچا آئے گا۔"

منجھلی بہو صاحب کا دل رہنے کو تو نہ چاہتا تھا لیکن داماد کی بات نہ ٹال سکتی تھیں۔ اس لئے مجبور ہو کر رہ گئیں۔ منجھلے صاحب چلے گئے۔ منور مرزا مع بیوی کے مسند نشینی کے دو دن بعد ہی چلے گئے تھے۔

قیصر دلہن نے پھول پور آ کر کیچلی سی بدل لی تھی۔ ساس کی ذرا پروا نہ کرتیں اور سنا سنا کر کہتیں۔ "لوگوں کو میرا چین اور میری بیٹی کا راج ناگوار گزرتا ہے میں نے تو کسی کا گلا گھونٹا نہیں جس کی آتی ہے وہ تو جاتا ہی ہے اور ایسی ہی جلن تھی تو میری بچی کو دیا ہی کیوں؟ اس کی تو ابھی گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے ننھی سی جان کو پانچ بچوں پر بیاہ دیا۔ اب اس کا کھانا پہننا بھی بُرا لگتا ہے۔"

منجھلی بہو صاحب دور بیٹھی اپنی بہو کی باتیں سنتی رہتیں اور بن ماں کے بچوں کی خاطر شہد کے گھونٹ کی طرح پی لیتیں، ذکیہ کی جوانمرگی نے ان کے دل کا چین ختم کر دیا تھا۔ ایک تو مرنے والی کا غم ان کو کھائے جاتا تھا۔ پھر وہ انجو کی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔ گن گن کر انہوں نے پندرہ دن کاٹے۔ پھر داماد سے کہا۔ "صالحہ بیگم کا خط آیا ہے، اللہ خیر رکھے آئندہ ہفتے کو وہ

دلی پہنچ جائیں گی۔ اس لئے مجھے پرسوں تک ضرور جانا چاہیئے، بڑی بھابی بیگم نے بھی پہنچنے کی تاکید لکھی ہے۔ تم اجازت دو تو لڑکیوں کو بھی لے جاؤں خالہ سے مل لیں گی۔"

نواب نے جواب دیا۔ "اگر بہن صالحہ بیگم آرہی ہیں تو میں آپ کو نہیں روک سکتا۔ مگر لڑکیوں کو دلی بھیجنا ابھی نہیں چاہتا۔ انجو اپنی ماں کے بعد بالکل ضدی اور کھلنڈری ہوگئی ہے اور دن بدن اس کی بیہودگی میں ترقی ہوتی جارہی ہے۔"

منجھلی بہو صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ "میاں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے سمجھ آئے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ ماں کا غم ننھے سے دل پر پڑا اس لئے چڑچڑی ہوگئی۔ سدا ایسی تھوڑی رہنے لگی۔ اب تو میرے ساتھ بھیجدو۔ ایک مہینے بعد ہی بلا لینا۔"

نواب خشک لہجے میں بولے "معاف کیجئے چچی جان، میں اس وقت آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا اور یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ میری لڑکیاں یہاں رہیں اور اپنی دوسری ماں سے مانوس ہوں اور ان کا ادب و احترام کریں۔"

منجھلی بہو صاحب کو نواب کی ہٹ دھرمی پر غصہ آگیا اور تیز لہجے میں بولیں "خدا کی شان ہے کہ تم اور میرا کہنا ٹالو۔ مرنے والی کا تم کو کچھ خیال ہے نہ میرا لحاظ۔ اگر یہ بچے بدنصیب نہ ہوتے تو ان کی ماں ہی کیوں مرتی، خیر تمہاری اولاد ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام، بس یہ سمجھوں گی کہ ذکیہ کے ساتھ یہ بھی مر گئے۔"

نواب صاحب نے ساس کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا، خاموش بیٹھے مونچھوں کو بل دیتے رہے۔ منجھلی بہو صاحب یہ کہہ کر کہ "میں کل شام کو جاؤں گی درجہ ریزرو کرا دینا" غصے اور رنج سے کانپتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔ عشا کا وقت قریب ہوگیا تھا۔ وضو کر کے نماز کی نیت باندھ لی۔ یہ رات انہوں نے

149 7169

رو کر اور آہیں بھر کر گذاری۔ صبح چائے کی کشتی آئی تو انھوں نے صرف ایک پیالی چائے پی اور ناشتہ جوں کا توں واپس کر دیا، رات کا کھانا ہی سینے پر رکھا تھا۔ بھلا ناشتہ کرنے کی گنجائش کہاں تھی۔ حسب معمول پوتی اور بہو سلام کے لئے آئیں تو انہوں نے سلام کا جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھی اپنا سامان بندھواتی رہیں۔

انجو نے جو نانی کا سامان بندھتے دیکھا یہ سمجھ کر نہال نہال ہو گئی کہ اب وہ بھی دلی جا سکے گی اور وہاں پھر وہ ہو گی اور چھٹو سے ساتھ جائیں، کچھ دن تو بات بات پر طعنے دینے والی اور نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے والی ممانی قیصر دلہن سے اس کو چھٹکارا ملے گا۔ اپنی انا سے کہا۔ "میرا اور عظن کا سامان درست کرو، ہم بھی نانی اماں کے ساتھ جائیں گے۔" اس کی کوکا شتو بولی "اے بی بی، تم نا ہی جاؤ گی۔" انجو نے اس کا منھ چڑا کر کہا۔ "جب وہ چڑیل نانی اماں تو کل جا رہی ہیں، میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔ ممانی جان کی ہر وقت کی فضیحتوں سے دل بیزار ہو گیا ہے۔" ننھو نے اپنی ننھی بھرا کر کہا۔ "مگر بوا تو کہہ رہی تھیں کہ۔" "ہماری بیگم صاحب جادیوں کو لیجانا چاہتی تھیں پر نواب صاحب نے منع کر دیا۔ کہا۔ انجو بی بی بہت بیہودہ ہو گئی ہیں ہم ان کی ..."

انجو کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے غریب ننھو کا بیان بھی جاری نہ رہنے دیا اور ایک دھموکا اس زور سے اس کے منھ پر جڑا کہ اس کے آنسو نکل آئے اور وہ گال سہلاتی، بسورتی چلی گئی۔

کھانے کا وقت ہوا تو منجھلی بہو صاحب نے کہدیا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے" قیصر دلہن نے بہت اصرار کیا۔ پوتی نے بھی گلے میں ہاتھ ڈال کر دادی کو بہت منانا چاہا۔ لیکن اب منجھلی بہو صاحب کا غصہ پورے عروج پر تھا۔ یہاں کھانا جہاں

بات نہیں مانی گئی تھی۔ کیسے کہاتیں۔ شام کو ٹرین پانچ بجے جاتی تھی۔ لیکن منجھلی بہو صاحب نے پالکی ظہر کی نماز کے بعد ہی منگوالی۔ انجو نانی کے سوار ہونے سے پہلے پالکی میں جا بیٹھی اور جب منجھلی بہو صاحب نے اس کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ مچل گئی۔ منجھلی بہو صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نکل کمبخت میرے لئے تو تو بھی ماں کے ساتھ مر گئی۔"

نواب صاحب ساس کو رخصت کرنے آئے تھے ان کو بیٹی کی ڈھٹائی پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے انجو کو پالکی میں سے ہاتھ پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

منجھلی بہو صاحب بید کی مانند لرزتی پالکی میں جا بیٹھیں۔ انجو دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عطرن بھی بغیر سوچے سمجھے بہن کا ساتھ دے رہی تھی۔ منجھلی بہو صاحب کا دل ان دو نو نواسیوں کے رونے کی وجہ سے ہل رہا تھا۔ ان کو اب اپنے بھول پن پر آنے پر پشیمانی تھی۔ ریل میں بیٹھ کر بھی وہ تمام راستے روتی رہیں۔ دلّی پہنچ کر انہوں نے ساری حقیقت ساس، اور جیٹھانی دیورانی کو سنائی۔

بڑی بہو صاحب بولیں۔ "میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ قیصر دلہن بس کی گانٹھ میں ابھی کیا ہے، ابھی تو تم اور روؤ گی۔ جان بوجھ کر تم نے اپنی چوٹی بہو کے ہاتھ میں دے دی ہے۔"

چھوٹی بہو صاحب نے کہا۔ "بھابی جان آپ کو اس طرح روٹھ کر آنا مناسب نہ تھا۔ انجو پر اب اور بھی سختی ہوگی۔"

منجھلی بہو صاحب کی ہچکی بندھی ہوئی تھی، وفورِ غم سے ان کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ سکندر زمانی بیگم نے بہو کو گلے لگایا، تسلی دی، پانی منگا کر پلایا۔ جب ذرا دل ٹھیرا تو وہ بولیں۔

"میں نے اتنے دن بھی مشکل سے وہاں گذارے، قیصر دلہن نے تو جیسے مجھ

سے ضد باندھ لی ہے۔ خدا ہی جانے وہ ایسی کیوں ہو گئی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ کبھی بُرا برتاؤ نہیں کیا۔ انجم کی ذرا ذرا سی بات فریدون بخت سے لگاتی ہیں۔ اور اس کی دشمن ہو گئی ہیں۔"

چھوٹی بہو صاحب نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "مرد تو کچے کانوں کے ہوتے ہیں پھر آپ کی مُردہ بیٹی کا منہ ان کو اب کب یاد ہے۔ اب تو نئی نویلی کی چاہت ہے قیصر دلہن کی بات کو کیوں نہ مانیں گے۔ دیکھا آپ نے یہ سوتیلے رشتے بہت بُرے ہوتے ہیں۔ خدا نہ کردہ" اگر دشمن دو ریار منجھو یہاں ہوتی تو کیا آپ کا دل مجھ سے صاف رہتا"

منجھلی بہو صاحب رو نکھے لہجے میں بولیں "ہائے مجھے اس کی کیا خبر تھی کہ بہو میری ایسی دشمن ہو جائے گی ورنہ میں ہرگز بچّو کی نہ ہونے دیتی۔"

منجھلی بہو صاحب کے آنے کی خبر پا کر پھوپھی اچھلتی کودتی آئی لیکن جب انجم کو بجی کے ساتھ نہ دیکھا اور ان سب کو مغموم پایا تو سلام کر کے منہ لٹکائے ہوئے چلی گئی۔

(۶)

مئی کا مہینہ تھا، دوپہر بھر لو کے جھکڑ چلتے تھے، سکندر زمانی بیگم اس مہینے میں ہمیشہ اوپر سے نیچے آ جاتی تھیں۔ چھوٹی بہو صاحب حسبِ معمول اپریل کے آخر میں حیدرآباد چلی گئی تھیں۔ ان کی صحنچی کے تینوں دروازوں پر خس کے پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک بہشتن صبح سے شام تک ان پردوں پر پانی چھڑکتی رہتی تھی۔ سکندر زمانی بیگم اور بڑی بہو صاحب صبح دس بجے سے یہاں بیٹھتی تھیں تو عصر کی نماز پڑھ کر باہر نکلتیں۔ یہیں ساس بہو کھانا کھاتیں۔ اور مغلانیوں سے کیری کٹاؤ کے کرتے دوپٹے پھولدار بیلوں کے ستارے لگے جالی اور آبِ رواں کے تیار کراتیں۔

منجھلی بہو صاحب نے بھی خس کی ٹٹی اپنی طرف لگوا لی تھی۔ وہ اور منور دلہن وہیں رہتی تھیں۔

زنگ محل میں ان دنوں سناٹا تھا۔ چھٹکو کے دم کی بڑی بستی تھی۔ وہ ہر وقت کانی گنگناتی تیتری کی مانند سارے گھر میں گھومتی رہتی تھی۔ چھوٹی بہو صاحب کے ملازمین کا اسٹاف بھی کافی بڑا تھا۔ اس لئے ان کے جانے کے بعد محل کی چہل پہل بہت کم رہ جاتی تھی۔ منجھلی بہو صاحب کے پاس قیصر مرزا کا لڑکا سکندر مرزا

رہتا تھا اور شمیم بھی۔ منور دلہن کے دونوں بچے تھے ان چاروں بچوں کی وجہ سے خاصی رونق تھی۔

بڑے صاحب کی صحت دو سال سے کچھ ٹھیک نہیں تھی، مگر وہ ایسے بے فکرے تھے کہ انہوں نے کبھی ڈھنگ سے علاج کیا نہ پرہیز۔ ماں کے بہت بکنے جھکنے سے طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو دوا پی لیتے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دل کی جھلی پر ورم آ گیا ہے۔ اس لئے چکنائی اور گوشت کا استعمال بہت کم کرنا چاہیئے مگر وہ حسب معمول مرغن کھانے کھاتے رہے۔ ان کا قول تھا کہ زندگی کا لطف کھانے پینے ہی سے ہے جب انسان کھا نہ سکے تو جینے سے کیا فائدہ؟ بھوپال سے واپس آنے کے بعد اُن کی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی، گھنٹوں دم گھٹتا رہتا لیکن نہ انہوں نے باقاعدہ پرہیز کیا نہ ڈھنگ سے علاج۔ طبیعت زیادہ گرتی، لیٹ جاتے جہاں طبیعت ذرا سنبھلی اور وہ اُٹھ بیٹھے۔ اس لئے کسی کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ کافی بیمار ہیں۔ گرمی زیادہ ہوئی تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح اب بھی چوکوں پر چھڑکاؤ کرایا اور ٹھنڈا پانی بھجوا کر لیٹ گئے۔ بیماری نے کمزور کر دیا تھا جسم میں درد ہو گیا اور حرارت بھی۔ اس کا علاج انہوں نے یہ کیا کہ عرق بید مشک میں شربت نیلوفر ملا کر پی لیا۔ اس کے پیتے ہی بخار اتنا تیز ہو گیا کہ وہ بیہوش ہو گئے، سکندر زمانی بیگم کو ان کی علالت کی اطلاع ملی تو وہ دیوان خانے میں پردہ کرا کے صحن سے پہنچ گئیں۔ بڑے صاحب کو اس وقت ۱۰۵ بخار تھا اور ہذیانی کیفیت ان پر طاری تھی۔ ان کے عزیز دوست حکیم اجمل خاں ابھی اپنے سامنے معزّج دوا پلوا کر گئے تھے اور ہاتھ پاؤں سہلانے کی تاکید کر گئے تھے۔ دو خدمت گار برابر ان کے تلوے سہلا رہے تھے۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر بیگم صاحب گھبرا گئیں اور منجھلے صاحب کو آنے کے لئے تار دیا۔

سورج ڈھلنے کے بعد بخار تو ہلکا ہو گیا لیکن گھبراہٹ اس بلا کی تھی کہ بڑے صاحب اب بھی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور بار بار پانی مانگ رہے تھے۔ حکیم صاحب پھر دیکھنے آئے، سکندر زمانی بیگم اور بڑی بہو صاحب پردے کے پیچھے بیٹھی رہیں، حکیم صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "ان کے دل کی حالت کافی تشویشناک ہے اور یہ بے چینی اس وجہ سے ہے اگر دل کی کیفیت ایسی ہی رہی تو ان کی زندگی بچانا محال ہو جائے گا۔" رات گئے تک حکیم صاحب بیٹھے رہے، برابر دوا دیتے رہے۔ جب بڑے صاحب کی طبیعت کو ذرا سکون ہوا اور وہ سو گئے تو حکیم صاحب رخصت ہوئے اور سب کی جان میں جان آئی۔"

بیگم صاحب تہجد کی نماز پڑھ کر بیٹے کی سلامتی کی دعاؤں میں مصروف تھیں کہ بڑے صاحب کی طبیعت پھر بگڑی اور صبح ہوتے ہوتے وہ اس جہانِ فانی کو چھوڑ گئے۔ بیگم صاحب نے اس وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ روئیں پیٹیں نہیں۔ البتہ بیوہ بہو کو گلے لگا کر کہا۔ "ہائے تم بے اولادی تو تھیں آج تمہارے سر سے وارث بھی اٹھ گیا۔" پھر آنسوؤں کو پونچھ کر صبح کی نماز کے لئے وضو کرنے لگیں۔

بڑی بہو صاحب کی میاں سے کبھی نہیں بنی اور زندگی بھر وہ ان کی لاابالی طبیعت کی وجہ سے میاں کو خاطر میں نہ لائیں۔ لیکن آج ان کا دل شریکِ حیات کی موت سے ٹوٹ گیا۔ بارہ سال کی بالی عمر میں انہوں نے سہاگ کا جوڑا پہنا تھا۔ اڑتیس سال جو انسان ان کی زندگی کا ساتھی رہا اور جس نے ان کی ہر کڑوی کسیلی بات کو خاموشی سے برداشت کیا وہ ہمیشہ کے لئے منہ موڑ چکا تھا۔

اکبر علی خاں نے زندگی بھر کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کوئی ان کی اہمیت سمجھتا۔ فطری طور پر لاپرواہ تھے۔ اس لئے ماں اور بیوی سے بھی بے تعلق رہتے،

لیکن اپنے محلے کی بہت سی بیواؤں اور بوڑھوں کی وہ ہمیشہ امداد کرتے رہے اور بچوں سے تو ان کو اتنا پیار تھا کہ سارے محلے کے بچے ان کو بابا جان کہتے تھے جمعے کی نماز کے بعد بچوں کو پیسے تقسیم کرنا ان کا معمول تھا۔ عیدوں پر عیدیاں دیتے۔ ویسے بھی دو چار بچے ان کے پاس ہمیشہ موجود رہتے تھے محرم کے دس دن بچوں کو دودھ کا شربت بنوا کر پلواتے تھے۔ رمضان کے پورے مہینے محلے کے کئی شریف بوڑھے ان کے ساتھ روزہ افطار کرتے اور کھانا کھاتے تھے۔ ان کی مرنجان مرنج طبیعت کی بدولت نہ جانے کتنے لوگوں کا کام چل رہا تھا اور وہ کتنی مفلس زندگیوں کی شکستہ ناؤ کے ناخدا تھے۔

ان کی موت کی خبر پاتے ہی بہت سے لوگ ٹوٹ پڑے جو سنتا ہائے ہائے کرتا آتا۔ منجھلے صاحب بھی دوپہر کو آگئے۔ جنازہ تیار تھا ان ہی کا انتظار تھا۔ ٹھیک چار بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ عزیز و احباب کے علاوہ پورا محلہ اور دلی کے اور بھی بہت سے لوگ ساتھ تھے اور جنازے کے پیچھے وہ یتیم بچے اور بیکس بوڑھے روتے چلاتے جا رہے تھے جن کا خیال مرحوم کو ہمیشہ رہتا تھا ان ٹوٹے ہوئے دلوں سے نکلے ہوئے نالے مرنے والے کی مغفرت کا سامان بن رہے تھے۔ اکبر علی خاں کو ان کے خاندانی ہڑواڑ میں دفن کیا گیا۔

سکندر زمانی بیگم نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو تھام کر بیٹے کو اول منزل کے لیئے رخصت کیا تھا۔ وفور غم سے ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک تھی بہو کی وجہ سے خود کو بہت سنبھالتی تھیں لیکن دل مرغ بسمل کی طرح سینے میں تڑپ رہا تھا۔ زمانے کا یہی رنگ ہے آج اسی محل میں اکبر علی خاں کا ماتم ہو رہا تھا جہاں ان کی پیدائش پر شادیانے بجے تھے۔

منجھلی بہو صاحب تیجے والیوں کا بھی خیال کرتیں ساس اور جیٹھانی کو بھی

سنبھالیں۔ صالحہ بیگم بنی تال تھیں وہاں سے آئیں، جنرل صاحب بھی پہنچ گئے۔ چھوٹی بہو صاحب نہ آ سکیں۔ ان کے یہاں چوتھی لڑکی ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے زچہ خانہ میں تھیں کیسے آتیں۔

قیصر دلہن نواب پھول پور کے ہمراہ آئیں۔ نواب پھولوں کی فاتحہ کے بعد محل میں آئے، سکندر زمانی بیگم اور بڑی بہو صاحب سے تعزیت کر کے تھوڑی دیر بعد واپس چلے گئے۔ منجھلی بہو صاحب اس وقت کھانے کے انتظام میں تھیں ان کو نواب صاحب نے پوچھا نہ سلام کیا اس کا منجھلی بہو صاحب کو بڑا ملال ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا قیصر دلہن کے ساتھ انجو اور علمن نہیں آئیں اس کا بھی ان کو ملال تھا۔

نوبی کو کچھ دن ہوئے تھے اور پہلی دفعہ کی بات تھی اس لئے سفر کرنا مناسب نہ تھا۔ قیصر دلہن سے سکندر زمانی بیگم نے پوچھا "لڑکیوں کو کیوں نہیں لائیں۔"

وہ بولیں اماں جان! میں نے تو کہا تھا لیکن ان کے باپ نے نہیں آنے دیا۔ ستارہ کو بھی روک لیا کہ بیگم تنہا گھبرائیں گی۔"

لیکن منجھلی بہو صاحب کا خیال تھا کہ قیصر دلہن یونہی باتیں بنا رہی ہیں۔ مجھے ستانے کے لئے لڑکیوں کو نہیں لائیں۔

بڑے نواب صاحب عید کر کے ہی حج کو چلے گئے تھے اور بیا نواب بیگم کو ان کی چھوٹی بیٹی اپنے ساتھ کشمیر لے گئی تھیں

منجھلی بہو صاحب: اماں کا تو کیا کر سکتی تھیں۔ بہو سے البتہ منہ دے کر بات نہ کرتیں۔ بڑی بہو صاحب کی نظر سے تو قیصر دلہن ہمیشہ ہی اتری رہیں اور اب تو وہ غمزدہ تھیں اس لئے بات چیت کرنے کا موقع ہی کہاں تھا لیکن قیصر دلہن نے اپنے پر بات نہ آنے دی اور تحمل کر کے پھول پور واپس چلی گئیں۔

بڑے صاحب کے دم سے دیوان خانے میں بہت رونق تھی دو چار بے فکرے

بیٹھے رہتے۔ کبھی شطرنج جمی ہوئی ہے کبھی محفلِ شعر و سخن آراستہ ہے۔ خدمت گار ہر وقت حقہ تازہ کرتے رہتے مصاحب لاڈو جان دونوں خاصدان پانوں سے بھر صبح و شام بھجوا دیتیں لوگ باتیں کرتے۔ پان چباتے حقہ پیتے اور فرصت کے اوقات میں یہاں آ کر دل بہلاتے

گرمیوں میں ان کا خسخانہ ایسا مشہور تھا کہ اپنے محلّے کے علاوہ دور پرے کے لوگ بھی دوپہر گزارنے یہیں آ جاتے ہیں۔ غرضکہ آنے جانے والوں کا صبح سے شام تک تانتا لگا رہتا تھا۔ اب کون کس کے پاس آتا۔ دیوان خانہ اجاڑ ہو گیا تھا۔ منجھلے صاحب گھر بلو طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ زیادہ اندر ہی رہتے اور جنرل صاحب بچپن سے فوجی ان کے پاس اتنا بیکار وقت کہاں تھا جو صبح سے شام تک بیکار صرف کرتے۔ ان بڑے صاحب کی روایات کچھ تیمور مرزا کو ورثہ میں ملی تھیں لیکن وہ بات کہاں جو ان میں تھی۔

بڑی بہو صاحب کو میاں کی زندگی میں ساس سو روپے ماہوار دیا کرتی تھیں انہوں نے کبھی خود کچھ نہیں دیا۔ ہاں اگر کوئی اچھا کپڑا انہیں پسند آ جاتا تو بیوی کو لا دیتے ہر موسم کے عطر بھی ان ہی کے ذمے تھے۔ کھانے کھلانے کے بہت شوقین تھے۔ خربوزوں اور آموں کی فصل پر ٹوکروں ہی لاتے اور کھلاتے۔ کھانا ان کا باہر باورچی پکاتا تھا۔ وہیں سے بیوی کے لئے بھی بھجوا دیتے تھے۔ میکے سے بھی پچاس روپے ماہوار کی جائداد بڑی بہو صاحب کو ملی تھی اپنا اکیلا دم تھا' میاں کے مرنے کے بعد ان کی نصف جائداد بڑی بہو صاحب کو مل گئی۔ جس کا کرایہ ڈھائی سو روپے ماہوار تھا لیکن اس سے اُن کو کچھ خوشی نہیں ہوئی اپنے شوہر کو یاد کر کے وہ چپکے چپکے گھنٹوں آنسو بہاتیں

جنرل صاحب تو چہلم کے بعد ہی حیدرآباد واپس چلے گئے' منجھلے صاحب نے اپنی رخصت اور بڑھا لی۔ دل شکستہ ماں اور غمزدہ بھاوج کی خاطر ان کو رہنا ہی تھا جولائی کے دوسرے ہفتے میں چھوٹی بہو صاحب بھی دلی آ گئیں۔ چھپو کی وجہ سے بڑی بہو صاحب کا دل بہت بہلتا تھا وہ ہر وقت ان کے پاس گھسی رہتی تھی۔

منجھلی بہو صاحب کا جھگڑا بھول پور والوں سے باقاعدہ چل رہا تھا۔ اب انہوں نے قیصر دلہن کے خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ البتہ انجو کی خیریت ان کی آنا کے ذریعے معلوم کر لیتیں۔ بڑے نواب صاحب حج کر کے واپس آئے تو ممانی کے پاس تعزیت کے لئے آئے ان سے سکندر زمانی بیگم نے کہا۔ "میاں فریدوں بخت کو سمجھائیے ان کو ذرا بھی مرنے والی بیوی کا خیال ہے نہ غمزدہ ساس کا لحاظ۔ بڑے کا انتقال ہوا جب بھی انجو اور عطن کو نہیں آنے دیا۔"

نواب صاحب بڑے وضعدار اور خلیق انسان تھے، ممانی سے بھی انہوں نے معذرت چاہی اور بھاوج کو بھی دلاسہ دیا اور یہ وعدہ کیا کہ انجو اور عطن کو جلدی دلی بھجوا دوں گا۔"

(۸)

ستمبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی بارش بند ہو گئی۔ اس لئے بلا کا حبس تھا۔ سورج کی تیز چمکیلی آنکھیں صبح ہی سے پریشان کرنا شروع کر دیتی تھیں۔ سکندر زمانی بیگم صبح کی نماز کے بعد جو نیچے آتیں تو پھر دوپہر کو کھانے کے وقت ہی اوپر جاتیں۔ چھوٹی بہو صاحب کی گود کی بچی نسرین عرف بے بی کو دو دن سے بخار تھا۔ اس لئے اس وقت سکندر زمانی بیگم اور دونوں جیٹھانیاں ان کے ہی پاس بیٹھی تھیں۔

قیصر مرزا کو پریشان صورت اور ہاتھ میں تار لئے دیکھ کر سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ منجھلی بہو صاحب نے جلدی سے سوال کیا۔ "میاں خیر تو ہے۔"

قیصر مرزا نے پست لہجے میں کہا۔ "جی ہاں! یہ نواب پھول پور کا تار آیا ہے، ننّو کے یہاں کل شام کو لڑکا ہو گیا"

سکندر زمانی بیگم "اے ہے! آٹھواں... بچہ ہوا، اگر نویں مہینے کی چھاؤں بھی دبا لیتا تو فکر کی بات نہ تھی۔ خدا ننّو کا دم بچائے اور بچہ بھی بچ جائے جب ہی بات ہے" "مہتاب دلہن تم کل صبح کی ٹرین سے پھول پور سدھارو، آخر ننّو تمہاری بیٹی ہے۔ ذکیہ نہیں تو اس کا ہی خیال رکھنا چاہیئے، ایک آنکھ پھوٹتی ہے تو دوسری کی خبر مناتے ہیں؟

قیصر مرزا ہزار لاپرواہ سہی، مگر پھر بھی باپ تھے۔ اس وقت وہ کافی پریشان تھے۔ منجھلی بہو صاحب ٹھنڈا سانس لیکر بولیں "ہاں، اماں جان! آپ تو مجھے جانا ہی ہوگا، جاؤ، میاں درجہ ریزرو کرالو، کل ہی اور تم پھول پور چلیں گے۔" اور منجھلی بہو صاحب نے سفر کے انتظامات شروع کردیئے۔ دست بقچے میں پہننے کے کپڑے رکھے۔ اچھے کپڑوں کا ایک ٹرنک الگ کیا، بستر کا بوغبند بندھوایا۔ بچوں کے لئے مٹھائی اور پھل ٹوکروں میں رکھوایا، ظہورن ماما اور گلشن لونڈی ساتھ جانے کو تیار رہیں۔ باہر قیصر مرزا کا کام محمود تھا، جلالی مینی بیگم اور کلّو بوا کو گھر میں چھوڑ کر منجھلی بہو سدھاریں۔

راستے بھر پوتی کی صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔ راستہ کاٹنا دشوار ہوگیا۔ خدا خدا کرکے شام کے چھ بجے پھول پور پہنچیں، انجو اور عطن کو نانی کے آنے کی خبر ملی تو ان کی عید ہوگئی، موٹر کے ٹھہرتے ہی پہلے داماد ساس کے سامنے جھکے انہوں نے دعائیں دے کر بلائیں لیں۔ "خیر تو ہے میری بنّو کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

وہ ان کے پانوں کی ڈبیہ سنبھالتے ہوئے بولے "جی ہاں خدا کا فضل ہے۔" ڈیوڑھی میں قیصر دلہن کھڑی تھیں ساس کے گلے لگ کر رونے لگیں منجھلی بہو صاحب بولیں۔

"اے ہے، دلہن تم کو ہم بھی نہیں آتا، بنّو کی خیر مناؤ۔ اس طرح رونا بدشگونی ہے۔"

انجو اور عطن دوڑ کر نانی سے لپٹ گئیں۔ انجو نے اتنے دن میں خاصا قد نکال لیا تھا اور منجھلی بہو صاحب کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی چوٹی گندھی ہوئی تھی اور کپڑے بھی صاف تھے۔

بنّوبی سرخ مخملی پر دوں والے چاندی کے چھپر کھٹ میں مزین مورت کی طرح لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کا شہابی رنگ بالکل زرد ہوگیا تھا۔ دادی نے جھک کر پیار کیا اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں نبو اچھی تو اچھا ہے۔"

بنّوبی نے لجا کر کہا۔ "اچھی ہوں۔"

کمزور اور نحیف روئی کے پہلوں میں لپٹا ہوا بچہ نرس کی گود میں تھا۔ کیونکہ بچہ پیدا نہ ہوا تھا اس لئے بیچاری نبو کو تین دن بجز سونف کے عرق اور بے گھی کی اچھوانی کے کچھ نہ ملا۔ چوتھے دن دودھ اور مرغی کی یخنی دی گئی۔ شوربہ پھلکا آٹھویں دن جا کر ملا۔ بچے کی روزانہ تیل مالش کی جاتی اور روئی میں اس کو رکھا جاتا۔ لیکن باوجود ہر طرح کی احتیاط کے وہ اٹھارہ دن کا ہو کر ختم ہوگیا۔ قیصر دلہن بہت روئیں لیکن بنوبی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ ان کے لئے تو یہ بچہ پورا وبال جان ہوگیا تھا۔ جب تک پیٹ میں رہا۔ چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے، ہر وقت کی احتیاط سے ناک میں دم رہا۔ پیدا ہونے کے بعد فاقے کرنے رہے

ایک مہینے کا چلّہ نہلا کر پوتی اور نواسیوں کو ساتھ لے کر منجھلی بہو صاحب دہلی آگئیں۔ نواب فریدوں بخت نے ساس کا بہت خیال کیا۔ قیصر دلہن بھی اس مرتبہ انسان ہی رہیں۔ یوں بھی خوش تھیں کہ میاں بھی اب کے ماں کے ساتھ آئے تھے۔ دراصل میاں کی لاپرواہی نے ان کو ساس کا مخالف بنا دیا تھا وہ دل کی اتنی بری نہ تھیں۔

نواب پھول پور نے یہی بہتر سمجھا کہ بنّوبی کی صحت بحال کرنے کے لئے ان کا کچھ دن دلّی میں باقاعدہ علاج کیا جائے۔

رنگ محل میں پہنچتے ہی انجو نے اپنی پیاری سہیلی جمو کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جو باتیں کرنی شروع کیں تو شام سے رات ہوگئی۔ مگر اب انجو پہلے کی طرح

ضدّی اور شوخ لڑکی نہ تھی۔ کافی سمجھدار ہو گئی تھی۔ بنّو بی کا لحاظ بھی کرتی اور تیسرے دُلہن سے تو ایسا ڈرتی کہ ان کی آواز سُنی اور اس کا دم نکلا

بنّو بی کی صحت زچگی کے بعد ایسی بگڑی کہ برابر طاقت کی دوائیں دی جا رہی تھیں اور دائی کا علاج بھی ہو رہا تھا۔ لیکن طبیعت پوری بحال نہ تھی اس لئے ان کو دلّی تین مہینے رہنا پڑا۔ انجو اور عظمیٰ اس طویل قیام سے بہت خوش تھیں۔

نواب پھول پور مہینے میں دو مرتبہ کچھ دن کے لئے ضرور دلّی آتے۔ بنّو بی کی حالت میاں کو دیکھتے ہی ایسی ہو جاتی جیسے خونخوار بلّی کو دیکھ کر چوہا سہم جاتا ہے۔ جہاں نواب صاحب کے آنے کا تار آیا اور وہ گم سُم ہو کر پلنگ پر دراز ہو گئیں اور نواب صاحب کے واپس جاتے ہی وہ اُٹھ بیٹھتیں۔

رنگ محل میں ان دنوں گہما گہمی پورے عروج پر تھی۔ منجھلی دلہن کے یہاں دوسرا لڑکا ہوا تھا۔ رات کو چلّہ جاگا جاتا۔ ساز بھرے جاتے۔ دن بھر گانا بجانا رہتا۔ چھوٹو بجائے پڑھائی کے سارا سارا دن انجو کے ساتھ کھیل کود میں لگی رہتی۔

منجھلے صاحب نے بڑے بھائی کی وفات کے بعد ماں کے کہنے سے پنشن لے لی تھی اور دلّی ہی میں رہتے تھے۔ وہ بہت نیک طبیعت اور ملنسار انسان تھے۔ بچوں سے ہنستے کھل مل کر ملا کرتے۔ اس لئے جتنی دیر بھی وہ گھر پر رہتے سب بچے ان کو گھیرے رہتے۔ کبھی چٹکلے، لطیفے ان کو سناتے، کبھی غالب کی غزلیں گا رہے ہیں۔ منجھلی بہو صاحب کو ان کی یہ عادت بالکل اچھی نہ لگتی تھی کہ اپنی بزرگی کا خیال چھوڑ کر سارا دن تفریح میں رہیں، لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ بیوی بگڑ بیٹھتیں تو ہنس کر ٹال دیتے اور بچوں کو بھی خوش رکھتے تھے۔

بڑی بھاوج کا ادب وہ ماں کی طرح کرتے اور جو وہ کہتیں وہ سر جھکا کر

سن لیتے۔

بنو بی کرسمس پر پھول پور سدھاریں، وہاں ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی شکار کھیلنے ریذیڈنٹ بہادر آئے تھے۔ غریب رعایا پر ٹیکس لگا کر جمع کیا ہوا روپیہ نواب صاحب نے صاحبِ عالی شان کی مہمان نوازی میں صرف کیا۔ ریذیڈنٹ صاحب کی خوشنودی کا پروانہ نواب پھول پور کے مطلق العنان رہنے کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے جب وہ رخصت ہو گئے تو ان کی میم صاحبہ کو بنو بی سے نواب پھول پور نے یاقوت موتی کی دو لڑی تحفے میں دلوائی اور میم صاحبہ نے اپنی جگہ پہنچ کر بیگم صاحبہ کو ایک سرخ منکوں کی مالا تحفے میں بھیجی۔

بنو بی کی صحت کچھ ایسی گر گئی تھی کہ باوجود علاج معالجے کے ہر وقت مضمحل سی رہتی تھیں۔ خانہ داری کا سارا انتظام قیصر دلہن کرتیں۔ دو ہزار روپیہ ماہوار نواب صاحب ہر مہینے خانگی اخراجات کے لئے دیتے تھے۔ باورچی خانے کا خرچ اس کے علاوہ تھا لیکن قیصر دلہن نے کفایت شعاری سیکھی نہ تھی۔ کھانے کی شوقین تھیں۔ انواع و اقسام کے حلوے، پنیڈیاں، سٹورے آئے دن بنتے رہتے تھے۔ سارا روپیہ ان ہی اللوں تللوں میں خرچ کر ڈالتیں۔ بنو بی کی قسمت کا رزق تو اب برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ ہر وقت پیٹ ہی سہلاتی رہتیں۔ انجو کی صحت بھی ممانی کی ہر وقت کی نصیحت اور نوک جھونک کی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھتے رہنے کی وجہ سے خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن اس کی بیماری کو بھی قیصر دلہن بہانہ سمجھتیں۔ اور بیچاری انجو اپنی ماں کو یاد کر کے تنہائی میں گھنٹوں رویا کرتی۔ یوں ہی دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔

بنو بی کو پھر امید ہوئی اور دوسرا مہینہ لگتے ہی لٹا دیا گیا۔ لیکن بنو بی کا کمزور جسم اس بار کا متحمل نہ ہو سکا اور چھٹا مہینہ لگتے ہی اس کا حمل اسقاط ہو گیا۔

ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ خون کی جسم میں بہت کمی ہے - اس لئے علاج کے ساتھ ساتھ بنّو کو تبدیلِ آب و ہوا کی بہت ضرورت ہے۔ گرمی شروع ہو چکی تھی - نواب بھوپال پور جب بنّو چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو بیوی اور بچوں کو لیکر کشمیر چلے گئے

(۹)

اکتوبر کے خوشگوار اور چمکیلے دن تھے۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح رجب کے پہلے جمعے کو منجھلی بہو اور چھوٹی بہو صاحب نے کھیر کے کونڈوں پر نیاز دلوائی تھی۔ باہر کے دالان میں لمبے سرخ دستر خوان پہ دوہری قطاریں کونڈے رکھ دیئے گئے، نماز مغرب کے بعد منجھلے صاحب نے نیاز دی۔ پہلے مردوں نے نیاز چکھی۔ ان کے بعد بیگمات نے پھر ماماؤں اور مغلانیوں کی باری آئی، اناؤں مغلانیوں اور ماماؤں کے پورے خاندان محل میں جمع تھے۔ عورتوں کی باتوں کا شور اور بچوں کے غل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب سے نمایاں ہستی خالہ نیفضو کی تھی جو کالے اٹلس کا چیت دھنک کے کام کا ٹھپے لگا ہوا پائجامہ، گلشن کی چمپئی رنگ کی محرم کرتی اور اس کے ہم رنگ ہوا دوپٹے کا دوہرا تاج لگا دوپٹہ اوڑھے ہوئے چھاگلیں چوڑیوں کی آواز سے حشر برپا کرتی ناک بھوں چڑھاتی ادھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ اور ہر ایک بیگم کو ٹھوک کر کہتیں "اے ہے ان عورتیوں کو تو دیکھو کھانے پر کیسا گری ہیں۔"

بھلا خالہ نیفضو کی ہاں میں ہاں کون نہ ملاتا اور واقعی تھا بھی صحیح۔ آنے والیوں کے جھلڑ کے جھلڑ تھے، تھوڑی دیر میں کھیر کے کونڈے صاف ہو گئے، رات

کے نو بجے بیاہ کا ہنگامہ ختم ہوا تو خاصہ لگا۔ کھانے کے بعد حسب معمول خالہ فیضو کی شادی خانہ آبادی کا ذکر چھڑ گیا۔ خالہ فیضو کی ہستی دلی کی بیگمات کے لئے موضوع تفریح تھی۔ ان کی عمر تو اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ منہ میں صرف دو دانت رہ گئے تھے۔ بالوں میں خضاب وہ بڑے اہتمام سے لگاتی تھیں۔ کیونکہ حبشی النسل تھیں ان کا رنگ زلف حسیناں اور شب دیجور کا جواب تھا۔ آنکھیں ہمیشہ لال لال رہتی تھیں۔ جوانی میں سکندر زمانی بیگم کی سسرال میں خاصہ کھلانے والیوں میں یہ بھی شامل تھیں۔ لیکن بڑھاپا آتے ہی کچھ ایسا دماغ چل گیا کہ یہ بڑی بی اپنے کو نوجوان 'خوبصورت' اور 'پشتینی' امیر زادی سمجھنے لگیں۔ دلی کے سارے اچھے گھرانوں سے انہوں نے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ سکندر زمانی بیگم کو بھی وہ خالہ اماں کہتی تھیں اور تینوں بہو صاحبان سے بھی انہوں نے بھاوج کا ناطہ قائم کر لیا تھا۔ جب بھی خالہ فیضو آجاتیں۔ صبح سے رات گئے تک سب بیویاں ہنستی رہتیں منجھلی بہو صاحب اور ان کی زندہ دل مغلانی بنّی بیگم نے تو خالہ فیضو کو ایک افسانوی دلچسپ کردار کی حیثیت عطا کر دی تھی۔

اب بھی منجھلی بہو صاحب نے پان بناتے ہوئے کہا۔ "اے بوا بنّی بیگم! تم نے ہماری فیضو کے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈا یا نہیں۔"

بنّی بیگم چھالیے کا تسلا اپنے سامنے سرکا کر بولیں "اے ہاں بیوی! مجھے تو ان کی شادی کا فکر ایسا سوار ہے کہ راتوں کی نیند اڑ گئی ہے"

چھوٹی بہو صاحب مغلانی کی اس لفاظی پر منہ پھیر کر مسکرائیں۔ مجھو بی بتن بی اور سنور دلہن کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

خالہ فیضو نے ترچھی چتون سے انہیں گھورا۔

منجھلی بہو صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "اے واہ بھلا یہ کیا موقع ہنسنے کا ہے

ماں بی بستی بیگم کونسا لڑکا دیکھا تم نے۔"

بستی بیگم چھالیہ کا پھنکا مار کر بولیں۔ "دو نکڑ پر جو عطار ہے۔ اس کی بیوی تیز یوں کے چاندہی گذری ہے، بڑا نیک بخت آدمی ہے۔ مجھ سے ہمیشہ کہتا ہے، مغلانی جی میرا گھر بسوا دو تو تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

منو دلہن (مذاقیہ لہجے میں) "مغلانی بوا لڑکے کی عمر کیا ہوگی؟"

بستی بیگم۔ "اے دلہن بی، مرد کی عمر کا پوچھنا کیا۔ وہ تو ساٹھا اور پاٹھا مشہور ہے، یہی ہوگی کوئی ستر برس کی۔ نورانی سفید داڑھی ہے۔ بہت نمازی اور پرہیزگار آدمی ہے۔ پھر اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ دو تو مکان ہیں۔ کپڑا لتا۔ گہنا پاتا۔ اللہ رکھے بھرا پرا گھر ہے۔ دوکان بھی خوب چلی ہے۔

بنن بی ہنسی روکتے ہوئے۔ "اور شکل کیسی ہے۔"

مغلانی بستی بیگم۔ "بس ہماری جیداسے ملتی ہی جلتی ہے۔ ڈیل ذرا بھاری ہے اور قد ٹھگنا ہے۔"

مجھو بی (قہقہہ لگا کر) بھئی واہ! پھر تو وہ آدمی نہیں گیند ہوا۔"

منو دلہن اور بنن بی بھی ہنسی کے مارے لوٹ گئیں۔

خالہ فیضو بھنا کر "دیکھو تو منجھلی بھابی! تمہاری بہو خود بھی ہنس رہی ہیں اور لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ لگالیا۔"

منجھلی بہو صاحب "اے دلہن، سچ تو ہے کیوں خواہ مخواہ ہنس رہی ہو۔ تم تو ماشاءاللہ دو بچوں کی ماں ہوگئیں مگر لڑکپن ابھی تک نہیں گیا۔"

چھوٹی بہو صاحب (بات ٹالتے ہوئے۔ "اس عطار کے کوئی بچہ تو نہیں ہے؟"

مغلانی بستی بیگم "بی بچے تو چار ہیں۔ مگر لڑکیاں تو بیاہی ہوئی اپنے اپنے

ٹھہر گئی ہیں، بڑے لڑکے کی نسبت ٹھیری ہوئی ہے۔ عید کے چاند شادی ہوگی چھوٹا ابھی بیانا ہے۔ باپ کے ساتھ دوکان پر بیٹھتا ہے۔"

منجھلی بہو صاحب۔ "اوہوں' نہ بوا' یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے' بوڑھا آدمی اور پھر بال بچوں والا' نگوڑا چیونٹیوں بھرا کباب! بیچاری فیقو کی جان مصیبت میں آجائے گی"

خالہ فیقو (شرم کو بالائے طاق رکھ کر بولیں)۔ "یہ مغلانی ایسے ہی بے تکے پیغام لاتی ہیں بیاہے۔ بیتا ہے۔ رنڈوے خدائی خوار بڈھے۔ کیا میرے ہی لئے رہ گئے ہیں۔ میں اس لئے کچھ نہیں کہتی کہ سب بے شرم کہیں گے۔"

منجھلی بہو صاحب (مسکراتے ہوئے) "خدا نے کرے کہ میں تیرے لئے کنوارا کماؤ لڑکا ڈھونڈ دوں گی۔ تیری تو جوتیوں سے رشتے لگے پڑے ہیں' یہ مغلانی تو بڑھاپے میں کچھ سٹھیا گئی ہیں۔"

چھوٹی بہو صاحب۔ "لڑکا تو مل ہی جائے گا' بی بستی بیگم! تم جلدی خدا کا سہاگ لگاؤ۔"

مغلانی نے تالی بجا کر تان ماری۔ "بنو ہے نادان۔ ابھی بیاتی ہولے دو۔" خالہ فیقو لجا کر بالکل دلہنوں کی طرح سمٹ کر بیٹھ گئیں' منجھلی بہو صاحب اور چھوٹی بہو صاحب نے منہ پر رومال رکھ لئے۔ منور دلہن منہ میں آنچل ٹھونس کر ہنسنے لگیں۔ بتن اور ننجھو کھوں کھوں اور کھل کھل کرتی ہوئی بھاگ گئیں۔

دوسرے دن صبح چھوٹی بہو صاحب ننھی کپڑے والی سے بیٹھی رنگ برنگی چینٹوں کے ٹکڑے خرید رہی تھیں کہ مانی نے تار لا کر ہاتھ میں لا کر دیا۔ چھوٹی بہو صاحب سدا کی وہمن "تار" دیکھ کر ان کا دل دھڑکنے لگا۔ منور دلہن سے انہوں نے کہا۔ "دیکھنا دلہن کس کا تار ہے۔"

انہوں نے پڑھنے کی کوشش کی، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو بجن بی کو لے کر آئیں۔ وہ ابھی ہجے کرکے تار کے مضمون کو سمجھنا چاہتی تھیں۔ کہ ان کے گرد خاصا ہجوم ہو گیا جس جس کو بھی تار آنے کی خبر ملی، اپنا اپنا کام چھوڑ کر آ گئیں۔

مصاحب لاڈو جان۔ "کہو بی بی: کس کا تار ہے؟"

بڑی بہو صاحب۔ "خدا اچھی خبر سنائے۔"

منجھلی بہو صاحب۔ "کہیں پھول پور سے نہ آیا ہو، نہ جانے شاپور کی طبیعت کیسی ہے اس کو موتی جھرا ہو گیا تھا۔"

منور دلہن۔ "میری اماں بی کی طبیعت بھی تو اچھی نہیں تھی۔ اس تار سے وحشت ہو رہی ہے۔"

مغلانی بستی بیگم۔ "اے بیگم صاحب، تار کا لفافہ دیکھ کر نگوڑا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اللہ خیریت کی خبر سنائے۔"

بڑی بہو صاحب۔ "میں جانوں، صالحہ کے آنے کا ہے۔"

بجن بی۔ "ہاں ہاں، لکھا تو کچھ آنے کا ہی ہے۔"

اتنے میں پھوپی غسل کرکے آ گئیں انہوں نے تار دیکھ کر کہا۔ "آپا بیگم کا ہی ہے وہ کل صبح یہاں پہنچ رہی ہیں۔"

تار کا مضمون سن کر سب کی جان میں جان آئی۔ چھوٹی بہو صاحب پھر اپنی خریداری میں لگ گئیں۔ بڑی بہو صاحب، صالحہ بیگم کے آنے کی خبر پا کر پھولی نہ سمائیں ان کو صالحہ بیگم سے محبت نہیں عشق تھا۔ کوئی اپنی اولاد کو بھی اتنا نہیں چاہتا جتنا وہ صالحہ کو پیار کرتی تھیں۔

صبح ہی صالحہ بیگم مع دو نو لڑکیوں کے آ گئیں۔ لڑکوں کو وہ میاں کے پاس چھوڑ آئی تھیں۔ صالحہ بیگم کے میاں خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے۔

اور وہ بھی خوش شکل تھیں۔ پھر بھلا بچے کیوں بُرے ہوتے چاروں خوبصورت تھے۔ خصوصاً ان کی بڑی لڑکی فریدہ بہت پیاری صورت کی تھی۔ اس کی شکل اپنی مرحومہ خالہ ہیں ملتی جلتی تھی۔ فریدہ کی نسبت پیدا ہوتے ہی ذکیہ بیگم کے بڑے لڑکے شاہرخ مرزا ولی عہد پھول پور سے ٹھہر گئی تھی۔ صالحہ بیگم کو ابھی سے اپنی کمسن لڑکی کے جہیز کی تیاری کا فکر ہو گیا تھا۔

ہتو بی، انجو بی، عظمیٰ بی ان دنوں دلی ہی میں تھیں، لیکن ان کا قیام پھول پور ہاؤس میں تھا۔ کیونکہ نواب بیگم کی علالت شدت اختیار کر گئی تھی۔ ہتو بی دوسرے تیسرے دن رنگ محل دادی کے سلام کو آتیں اور تمام دن رہ کر چلی جاتیں قیصر دلہن کے والد علیل تھے اس لئے وہ میکے گئی ہوئی تھیں۔

پھوپھی کے آنے کی اطلاع ملتے ہی ہتو بی اور ان کے ساتھ انجو اور عظمیٰ بھی آئیں۔ کشمیر کی خوشگوار آب وہوا کے اثر سے ہتو کی صحت اب بحال ہو گئی تھی اس کا جسم پھر گداز ہو چلا تھا اور گالوں پر سرخی آ گئی تھی۔ دھانی ریشم کے زرکار لباس میں مرصع زیورات سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی ہتو بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن انجو اور عظمیٰ کے سروں پر بسنتی گلابی کریپ کے لچکا لگے ہوئے دوپٹے تھے موٹی ململ کے کُرتے اور سبز نشر کے اریب پاجامے وہ پہنے ہوئے تھیں۔

صالحہ بیگم (تعجب اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں) اے ہے یہ کپڑے جو لڑکیاں پہنے ہوئے ہیں امیروں کے پہننے کے ہیں۔ ہماری بھابی جان نے اچھی گت ان دونوں کی بنائی ہے۔"

عظمیٰ تو خاک کچھ نہیں لیکن انجو بیچاری خالہ کے اس ریمارک پر شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گئی بیوقوف۔ ہتو بی حسب عادت بیٹھی مسکراتی رہیں۔ انجو کی آمد کی خبر پا کر چھٹو... کھلی کتاب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آئی۔ چھٹو کا زیادہ وقت

اب مطالعے میں گذرتا تھا۔ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا اس کو بہت شوق تھا۔ مجھو بی کوئی ایسی ویسی کتاب چھبو کو نہ پڑھنے دیتی تھیں۔ مگر وہ بھی بلا کی تیز تھی۔ بڑی بہو صاحب کے ہاں پرانی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہاں بیٹھی کبھی مراۃ العروس دیکھتی اور کبھی طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال پڑھا کرتی۔ ان طول طویل رنگین داستانوں میں کھو کر اکثر چھبو کھانا پینا بھول جاتی تھی۔ کتب بینی کے شوق نے اس کو اپنی عمر سے زیادہ باشعور اور سنجیدہ کر دیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اب بھی وہ بے پناہ شوخیاں کرتی تھی۔ انجو نے اپنی سہیلی کی شگفتہ صورت اور اچھے لباس کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور بیساختہ ایک آہ اس کے لبوں پر مچل گئی مگر کچھ دیر بعد ہی وہ چھبو کی دلچسپ باتوں میں اپنا سارا دکھ بھول گئی۔ اور اس کے ساتھ مل کر قہقہے لگانے لگیں۔

منجھلی بہو صاحب نے دونوں نواسیوں کو نجّو بی کے ساتھ نہ جانے دیا اور دو دن اپنے پاس رکھا۔ ان کے لئے نئے جوڑے عمدہ ریشم کے بنوائے اور دو دوپٹوں پر گوٹا ٹکوایا اور یہ جوڑے پہنا کر لڑکیوں کو پھول پور ہاؤس بھیجا۔ قیصر دلہن اب واپس آ گئی تھیں۔ ساس کے دیئے ہوئے کپڑے لڑکیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر تلملا کر رہ گئیں۔ اور غریب انجو ان کے بے وجہ عتاب کا شکار بنی۔

نواب بیگم کو پرانی سل تھی مسلسل سات سال سے بیمار رہیں۔ آخر بیچاری اللہ کے یہاں سدھاریں اور پھول پور ہاؤس میں بخیری صفائی ہونے کی وجہ سے نوبی رنگ محل میں آ گئیں۔ کیونکہ ڈاکٹر ان کو پھول پور جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ قیصر دلہن دن گن گن کر گزار رہی تھیں۔ خدا خدا کرکے نو مہینے پورے ہوئے اور نجّو بی کے یہاں جیتی جاگتی لڑکی ہوئی نواب صاحب کو تار سے اطلاع دی گئی۔ پھول پور ہاؤس مبارکباد کے ترانوں سے گونج اٹھا۔ یہ لڑکی لڑکوں سے

بھی بڑھ کر تھی۔ اور نواب کو لڑکے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اللہ رکھے تین لڑکے ان کے موجود تھے۔ ان کے لئے بیٹا بیٹی اب سب برابر تھے۔ نئی نویلی دلہن کی خوشی پوری کرنی تھی۔ خوب دھوم دھام سے چھٹی کی۔ عقیقہ ہوا بچی کا نام بڑے نواب صاحب نے دل آرا بانو رکھا نانی پیار سے دلبری کہتی تھیں۔

انجو بی سدا کی کم عقل۔ بھلا وہ بچی کی کیا نگہداشت کرتیں۔ دودھ تو انا پلاتی تھی۔ رکھتی ہر وقت نانی تھیں۔ بچی کی صحت کمزور تھی۔ آئے دن بیمار رہتی۔ نانی کو کھلانے کا شوق تھا۔ اس لئے اور بھی اس کا پیٹ خراب رہتا اور ہر وقت ریں ریں کرتی رہتی۔ انجو سے قیصر دلہن دلبری کا کافی کام لیتی تھیں۔ اس کو بھی ننھی بہن سے دلچسپی تھی۔ بڑے شوق سے وہ اس کو گھنٹوں اپنے پاس رکھتی۔ انجو اور عطن کو قیصر دلہن نے کوئی تربیت نہیں دی، نہ ان کو سینا آتا تھا نہ کشیدہ کاری، نہ خانگی انتظام کا شعور تھا۔ باپ تو اتنا ہی کر سکتے تھے کہ تعلیم کا انتظام کردیں۔ وہ انہوں نے خاطر خواہ کر دیا تھا۔

انجو کو پڑھنے کا خود بھی شوق نہ تھا۔ قرآن شریف اور معمولی اُردو لکھنے پڑھنے کے علاوہ اس نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ دو سال سے برابر فارسی پڑھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا تھا۔ اب چند مہینے سے انگریزی پڑھانے کے لئے یورپین اُستانی بھی نواب صاحب نے مقرر کردی لیکن انجو ہمیشہ عطن اور ستارہ سے پڑھائی میں پیچھے رہتی۔ اس کے دل کو ماں کی بے وقت موت نے اور نانی کے برتاؤ نے کچھ ایسا افسردہ کر دیا تھا کہ کچھ بھی کرنے کی سکت اس میں باقی نہ رہی تھی۔

شاہ رُخ مرزا کو دادی کے انتقال کے بعد دہرہ دون ملٹری اسکول

میں داخل کر دیا گیا۔ بھول پور میں شاہرخ اب بہت اُداس رہتا تھا۔ باہر کی فضا اور ہمسن لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں وہ بہل گیا۔

منجو بی اب اپنی عمر کی اکیس منزلیں طے کر چکی تھیں اور چھوٹی بہو صاحب کو دن رات بھتیجی بیٹی کی شادی کا فکر رہتا تھا۔ حالانکہ منجو اپنے نازک جسم اور شگفتہ صورت کے باعث ابھی اٹھارہ سال کی ہی لگتی تھی۔

اتفاق کی بات کہ دو سال سے کوئی پیغام بھی ڈھنگ کا نہیں آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے منجو کے پیغام اپنوں میں سے بھی اور غیروں میں سے بھی آتے ہی رہتے تھے مگر جب جنرل صاحب منجو کی شادی کا ذکر سننے کے لئے تیار نہ تھے اور چھوٹی بہو صاحب بھی ناک بھوں چڑھا کر با سوچے سمجھے انکار کر دیتی تھیں۔ اب وہ چاہتی تھیں تو ہر طرف خاموشی مسلط تھی۔

منجو سمجھدار، سگھڑ، شائستہ اور ہر طرح اب ایک اچھے گھر کی بیگم بننے کے لائق ہو گئی تھی۔ اپنے گھر کے سارے گھریلو کاروبار کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی۔ بے بی کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی اور چھمو کا خیال بھی۔

چھوٹی بہو صاحب تو آئے دن کی مریض تھیں۔ کبھی سر میں درد ہے۔ کبھی کمر میں۔ کبھی اختلاج ہو رہا ہے۔ کبھی زکام ... پھر ان کا زیادہ وقت جانماز پہ گزرتا یا ساس اور جیٹھانیوں سے باتیں کرنے یا خریداری میں۔ منجو نے جب سے

ہوش سنبھالا انہوں نے خانہ داری کے کاموں سے بالکل فرصت پالی۔

قمر میاں سینئیر کیمبرج کر لینے کے بعد پچھلے سال آئی۔ سی۔ ایس کے لئے ولایت جا چکے تھے اور انور نے اس سال ایف۔ اے میں فیل ہونے کے بعد کتابیں پھینک دی تھیں اور ماں سے کہا کہ "یہاں پڑھنے میں اب میرا دل نہیں لگتا۔ مجھے بھی ولایت بھیج دیجئے۔"

جنرل صاحب نے کہا۔ "کہ یہاں تو فیل ہو رہے ہو، وہاں جا کر کیا بناؤ گے"

لیکن انور بڑا ضدی لڑکا تھا۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا اور دو مہینے تک ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخری چھوٹی بہو صاحب نے اپنے پاس سے روپیہ دے کر اس کو ولایت چلتا کیا۔ انور کو ولایت گئے تین مہینے ہی ہوئے تھے، بختاور کو خدا نے دو لڑکوں کے بعد لڑکی عطا کی تھی۔ ان کے بیس دن کے چلّہ نہانے کی تیاری کی جا رہی تھی کہ یکایک سر احسان علی کی بیوی آگئیں۔

سر احسان لاہور کے سب سے بڑے تاجر اور جنرل صاحب کے مخصوص دوستوں میں سے تھے اس لئے چھوٹی بہو صاحب نے ان کی بہت آؤ بھگت کی رات کو کھانے کے بعد جب وہ اطمینان سے بیٹھیں تو کہا کہ میں تو اپنی بنّو کے لئے ایک اچھا پیغام بڑے تعلقہ دار کا لے کر آئی ہوں۔ لڑکا حامد کا کلاس فیلو میرا دیکھا ہوا بہت شریف اور نیک ہے۔ سوا لاکھ روپے سالانہ ان کے تعلقے کی آمدنی ہے۔ بس ایک چھوٹا بھائی اور ہے۔ بنک میں بھی کافی روپیہ ہے۔ آپ میرے کہنے سے یہاں ضرور رشتہ کریں۔ بنّو اللہ نے چاہا تو خوش رہے گی۔

چھوٹی بہو صاحب کو یہ پیغام آنا ایک دقت غنیمت معلوم ہوا۔ اگر ان کا بس چلتا تو جھٹ پٹ منظور کر لیتیں۔ مگر جنرل صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ "دیہاتی لوگوں کے ساتھ ہماری لڑکی کا گذارا ہونا مشکل

ہے، ان کی اور ہماری معاشرت میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔"
چھوٹی بہو صاحب تڑخ کر بولیں۔" اے ہے بس بھی کرو، جوان لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھو گے۔ وہ کوئی کٹنی مشاطہ تو ہے نہیں۔ بیچاری محبت سے اچھا ہی سمجھ کر یہ پیغام لائی ہیں۔ شہر ہو یا دیہات۔ سب قسمت کی بات ہے۔ ہماری لڑکی کا نصیب اچھا ہوگا۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جنرل صاحب۔ "وہ بیگم! پھر بھی یہ معاملہ ایسا نہیں کہ ہم آنکھ دور بے جانے بوجھے لڑکی دینے کو تیار ہو جائیں۔ ہمیں اپنے آدمیوں کو بھیجکر ان لوگوں کا طرز معاشرت رہنے کا طریقہ ضرور معلوم کرنا چاہئے اور میں پہلے لڑکے کو دیکھ لوں اس کے بعد کوئی رائے قائم کرونگا۔"

میاں کی یہ معقول بات چھوٹی بہو صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے بی مانی اور داروغہ جی کو سر احسان کی بیوی کے ساتھ کر دیا۔ یہ دونوں ان کے ہمراہ تعلقے دار صاحب کے یہاں گئے اور چار دن رہ کر مرغ کا قورمہ اور پراٹھے کھا کر بنارسی دوپٹے اور نقدی انعام پا کر آئے تو ان کے یہاں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور چھوٹی بہو صاحب نے ہر طرح مطمئن ہو کر سر احسان کی بیوی کو پیغام بھیجنے کے لئے لکھدیا اور چند دن بعد ہی وہ مع لڑکے کی والدہ کے آ پہنچیں۔

تعلقے دارنی منجو کو دیکھنا چاہتی تھیں، مگر بھلا ان کا وہاں گذر کہاں ہوتا۔ شہ نشین میں منجو بی مخملی پردوں کے پیچھے چھپی بیٹھی رہتی تھیں اور بی مغلانی یا مانی شہ نشین کے زینے پر پہرے کی ڈیوٹی دیتیں۔

مہر کا قصہ چل رہا تھا۔ لڑکے کی والدہ چاہتی تھیں کہ مہر بیس ہزار ہو اور چھوٹی بہو صاحب اپنے خاندانی رواج کے مطابق اکاون ہزار کے مہر پر اڑی ہوئی تھیں۔ لیڈی احسان کبھی ان کو سمجھاتیں کبھی ان کو۔ اس طرح دو دن گذر گئے

تعلقے دارنی کو منجو بی کو دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا' اس لئے وہ ابھی مہر کے معاملے میں
ٹال مٹول کر رہی تھیں۔

بے بی کی بے وقوف آنا سے ان کو منجو بی کی جائے رہائش کا پتہ چل گیا اور وہ ایک دم ٹہلتی ہوئی شہ نشین پر پہنچ گئیں۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت مانی یا مغلانی بھی نہ تھیں۔ صرف احمدی بیگم منجو کے پاس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جوان کو آتے دیکھا منجو کو اشارہ کر دیا۔ وہ اس وقت اپنی یورپین اُستانی کو جو ولایت گئی ہوئی تھیں خط لکھ رہی تھیں جیسی بیٹھی تھیں بیٹھی رہ گئیں سر ذرا جھکا لیا۔

تعلقے دارنی یہ دیکھ کر خوش ہوئیں کہ لڑکی چھریرے جسم کی اور قبول صورت ہے۔ بیّن بی اب پہنچ گئیں وہ ان کو لیکر واپس آئیں۔ چھوٹی بہو صاحب کی عصر کی نماز کی نیّت بندھی ہوئی تھی۔ سلام پھیرا تو تعلقے دارنی کو اوپر سے آتے دیکھا۔ غصے سے ان کا منھ لال ہو گیا۔ مگر کچھ کہنے کا موقعہ نہ تھا' ضبط کر گئیں۔ تیوری پر بل ڈالے تسبیح پڑھتی رہیں۔

تعلقے دارنی نے اسی دن اپنے لڑکے شاہد احمد کو جو دلّی میں ایک ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ جاکر بتایا "لڑکی ماں کی طرح تو حسین نہیں لیکن خوش شکل ضرور ہے۔ رنگ تو سرخ و سپید ہے مگر نقشہ معمولی ہے۔ البتہ یہ گھر ہر طرح تمہارے خیال کے مطابق ہے چاہو تو مہر جو وہ لوگ کہتے ہیں منظور کر لو ورنہ گھر واپس چلو"

شاہد احمد دلّی کی شستہ تہذیب کا گرویدہ اور بہت ذہین اور خوش ذوق نوجوان تھا۔ اور بڑی خوشی اور شوق سے انہوں نے یہاں پیغام دیا تھا۔ لڑکی کی شکل اچھی ہے یہ معلوم ہونے کے بعد بھلا پھر کیوں وہ مہر کے معاملے میں سوچتا۔ جلدی سے خوش ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے اماں جان۔ اگر آپ کو لڑکی پسند ہے تو مہر کی منظوری دیدیجئے۔"

تعلقے داری دراصل پردیس میں رشتہ کرنا نہ چاہتی تھیں اور چھوٹی بہو صاحب کے پُرتمکنت انداز سے بھی مرعوب اور گھبرائی ہوئی تھیں۔ لیکن لاڈلے بیٹے کی خاطر بیچاری مجبور تھیں۔ انہوں نے منظوری دے دی۔ اور رنگ محل میں منگنی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

تین دن بعد جمعے کی شام کو منجو کی منگنی کی رسم بہت دھوم سے ہوئی۔ مگر جنرل صاحب کچھ خوش نہ تھے۔ بیوی کے اصرار سے مجبور ہو کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دیہاتی ماحول میں ان کی لڑکی کبھی بھی خوش نہ رہ سکے گی مگر اپنی بے وقوف بیوی کو کیونکر سمجھاتے جو سر احسان علی کی بیوی کی باتوں میں آ کر منجو کے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھنے کے خیال میں ایسی مگن تھیں کہ سب کچھ بھول چکی تھیں۔

منجو کی منگنی ہونے کے بعد چھوٹی بہو صاحب اس کی شادی کے انتظامات میں مصروف ہو گئیں۔ حالانکہ منجو کے جہیز کا سب سامان پہلے سے تیار رکھا لیکن پھر بھی ان کی حالت یہ تھی کہ صبح سے شام تک خریدتی ہی رہتی تھیں۔ جوہری گیا سادے کار آیا وہ اٹھا بھی نہ تھا کہ گھیرا آ گیا۔ لیلا رام کے یہاں سے موٹر بھر کر کپڑا آ گیا۔ حاجی علی جان کے یہاں سے کارچوبی کام کے لباس آ گئے۔ صبح سے رات کے دس بجے تک یہی ہنگامہ رہتا تھا۔ وہ تو مغلانیوں اور درزن کو سلائی سے سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ جنرل صاحب بھی یہ چاہتے تھے کہ جہیز میں جتنی کو ایک سے بڑھکر ایک چیز اچھی دیں۔ رئیسانہ شان کا جہیز تیار ہو رہا تھا۔ شادی عید کے بعد ٹھیری تھی۔ تین مہینے پلک جھپکتے گذر گئے۔ چاند دیکھتے ہی گہما گہمی اپنے عروج پہ پہنچ گئی۔ جبکہ دو دن بعد ہی پردیس کے مہمان آنے لگے۔ سب سے پہلے صالحہ بیگم آئیں۔ پھر حیدرآباد سے چھوٹی بہو صاحب کے میکے والے پہنچے۔ نواب

پھول پور کو قیصر دلہن نے ایسا چڑھایا تھا کہ انہوں نے لکھا: کہ میں جب آؤں گا کہ جنرل صاحب پیشوائی کے لئے خود آئیں۔ جنرل صاحب ان کی امارت اور ریاست کے رعب سے تو دبنے والے نہیں تھے لیکن منجھلی بہو صاحب کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ انہوں نے دیور کی خوشامد کی اور کہا: "آپ میری خاطر اُن کی یہ شرط منظور کر لیں اگر فریدوں بخت نہیں آئے تو انجو اور عظمیٰ بھی نہیں آسکیں گی' اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیں گی۔"

جنرل صاحب بڑی بھاوج کی خاطر نواب پھول پور کو لینے اسٹیشن پر گئے اور وہ مع اپنے اسٹاف اور محل کے بارات کے آنے سے ایک دن قبل آگئے۔ باقی اور مہمان جمع ہو چکے تھے۔ رنگ محل، چھوٹی حویلی اور چاروں اور گرد کے گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ نواب پھول پور کی تینوں بہنیں مہمان خواتین کے لئے سامانِ تفریح بنی ہوئی تھیں۔ ان تینوں کے لباس اور زیور کی نمائش اور اترانے پر سب بیویاں ہی ہنستی تھیں۔

چھوٹی بہو صاحب نے دلّی بھر کی ڈومنیوں کے طائفے تو بلوائے ہی تھے ریاست رام پور کی ڈومنیاں بھی تیس روپے روز پر بلوا لیں۔ یہ ڈومنیاں واقعی ناچ اور نرت کرنے میں دلّی کی ڈومنیوں سے زیادہ بڑھ کر مشاق تھیں۔

مانجھے کے دن سے ہی روزانہ رات کو کھانے کے بعد جو رقص و طرب کی محفل جمتی تو آدھی رات کے بعد ختم ہوتی۔

منجوبی کے مایوں بیٹھنے کے دو روز بعد بارات بھی آ گئی۔ سول لائن کی ایک بڑی کوٹھی میں بارات کو ٹھہرایا گیا۔ اسی دن شام کو ساچق سمدھیانے والے لے کر آئے۔

چھوٹی بہو صاحب نے اپنی شان دکھانے کے لئے خود بھی دل کھول کر خرچ

کیا تھا اور ان لوگوں نے بھی ایک کی جگہ چار اٹھوائے تھے۔ بیچارے دیہاتی آدمی دہلی کی رسمیں کیا جانیں۔ سانچق کے سامان میں گلاب۔ اور چنبیلی کے تیل کی بوتلوں کے ساتھ دو درجن شربت کی بوتلیں بھی آئیں، باقی سب سامان بہت اچھا تھا۔ دو چاندی کی تھلیاں اور اکیس تانبے کی — تمام سنگار کا سامان۔ گنگا جمنی اکیس بیش قیمت مغرق جوڑے، بیش بہا مرصع زیور، اکیس من بری — یہ سازوسامان دیکھ کر سب ہی مہمان بیگمات نے کہا "بُوا، ہیں تو باہر والے، مگر دل کے اچھے اور سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل دلی والوں کا سامان بری میں لائے ہیں۔" اور یہی سننا چھوٹی بہو صاحب چاہتی تھیں۔

بارات رات کے ایک بجے بہت دھوم سے چڑھی۔ اور چار بجے صبح محل کے دروازے پر پہنچی۔ نفیریوں، بین باجوں، تاشوں، ڈھولوں کے شور میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، آتش بازی۔ تخت رواں اور بارات کا شاندار جلوس آیندہ و روند کو روکے ہوئے تھا، کچھ دیر محل کے پھاٹک پر رک کر بارات تو دیوان خانے کی جانب مڑ گئی، زنانی سواریاں محل میں اترنے لگیں۔

منور دلہن، قیصر دلہن، صالحہ بیگم، بن بی نے سمدھنوں کی خبر پھولوں کی چھڑیوں سے لی۔ دولھا والیوں کے بیٹھتے ہی گالیاں پڑنے لگیں۔ بھاری انعام پاکر ڈومنیوں نے مبارکبادی ترانے شروع کئے، شربت پلایا گیا، پھولوں اور گوٹے کے ہار سمدھنوں کے گلے میں ڈالے گئے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد نکاح ہوا۔

اگست کا مہینہ تھا۔ ایک دن پہلے بارش کافی ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی ہلکا ہلکا ابر آسمان پر موجود تھا۔ اس لئے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر زیادہ ہجوم کے باعث فضا میں گھٹن پیدا ہو گئی تھی۔ دس بجے دولھا آرسی مصحف کی رسم کے لئے محل میں آئے اور دولھا دلہن دونو اس بلاکے حبس میں

گھنٹہ بھر بند مے بیٹھے رہے، رسمیں ہوتی رہیں۔ خدا خدا کر کے کہیں بارہ بجے چھٹکارا ملا۔ دولہا تو باہر چلا گیا۔ منجو بی کو آرام لینے کے لئے لٹا دیا گیا۔ وہ بھاری لباس اور اتنے سارے زیورات میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں اس قدر مخلوق جمع تھی کہ کھانے سے ہی چار بجے تک نجات ملی اور وداع ہوتے تک سورج غروب ہو چکا تھا۔

منجو کو جہیز چھوٹی ہونے اپنی عادت کے مطابق بہت بھاری بھرکم دیا اور اس کے علاوہ مردانی زنانی پہناونیاں الگ دیں۔ داماد کو جو وہ پانچ کپڑے کا خلعت مع جیغہ سرپیچ اور جوڑا مہندی والے دن ہی بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ چاندی کی چوکی چاندی کا تھالی ظروف اور گنگا جمنی خاصدان میں ڈھائی سو روپے دودھ پینے کے لئے بھیجے تھے۔ ڈھائی ہزار روپے سلامی کے دیئے۔ بیٹی کو چھ ہرا چھ ہرا زیور تہ گلے اور کانوں کا اور پاؤں کے دو زیور سونے کے دیئے، علاوہ اور الم غلم سامان کے دولہن کے لئے منقش پالکی کا شانی مخمل کے جگمگاتے پردے کی دی اور دولھا کو گھوڑا مع چاندی کے ساز کے دیا۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ بیٹی پردیس بیاہی گئی ہے اور ساس اور دو جیٹھانیوں نے کہا بھی تھا کہ کاٹھ کباڑ کا منجو کو نقد ہی دے دینا۔ مگر وہ کس کی سنتی تھیں۔ مزاج کے لحاظ سے وہ بالکل "تانا شاہ" کی بہن تھیں۔ میاں تو ہمیشہ ان کا منھ ہی دیکھتے رہتے اور ساس بھی بہت سمجھدار تھیں۔ بہت رکھ رکھاؤ سے برتاؤ کرتی تھیں جو بات بنی ہوئی تھی۔ غرض کہ منجو بی شام ہوتے وداع ہو کر اس کوٹھی میں گئیں جہاں برات کو ٹھہرایا گیا تھا دوسرے روز صبح ہی خالہ زاد بھائی، ماموں زاد بھائی ان کو لینے گئے۔ شام کو چوتھی کی رسم پوری دلچسپی سے ہوئی ترکاری اتنی چوتھی کے لئے آئی تھی کہ رنگ محل کے باہر کے دالان کا ایک حصہ خاصا سبزی منڈی معلوم ہو رہا تھا رسم کے بعد کھانا کھا کر

برات رخصت ہوئی۔

منجو بی کے ہمراہ ان کی انا بی مانی اور مغلانی اور ان کا کوکا تسمشاد گیا۔ راستہ دور کا تھا کہیں دوسرے روز شام کو وہ اپنی سسرال پہنچیں۔

چند دن میں ہی منجو بی کو اندازہ ہو گیا کہ ان کی خوشامد پسند سادہ لوح ماں نے احسان علی کی بیوی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر شادی بالکل غلط جگہ کر دی جن لوگوں میں وہ بیاہ کر آئی تھی ان کے پاس دولت تو تھی۔ لیکن اخلاقی طور پر یہ بالکل مفلس تھے اور طرز معاشرت ان کا بالکل الگ تھا۔ البتہ صرف منجو کے دولہا ذہین اور سمجھدار انسان تھے اور حتی الامکان سسرال کے طور طریقوں کو اپنے یہاں استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے، بیوی کی ہر وقت خاطر مدارات کرتے رہتے تھے۔ اس لئے منجو جو سمجھدار لڑکی تھی اپنی دل کوفت کو میاں پر نہ ظاہر ہونے دیتی۔ اور ساس کی الٹی نکتہ چینیوں کو جو ہر وقت وہ شہر والیوں پر کرتی تھیں سن کر ٹال دیتی تھی۔

لیکن اس اجنبی اور گھٹے ہوئے ماحول میں جہاں نہ وہ زبان سمجھتی تھی نہ جو لوگ اس کو پسند کرتے تھے۔ بیچاری منجو بہت ہی گھبرا تی تھی۔ نہ یہاں دلکش خوبصورت سیرگاہیں تھیں۔ نہ رنگ محل کی طرح سے چہل پہل۔ لیکن اب تو گذارہ کرنا ہی تھا اس لئے منجو نے بڑے استقلال کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا تہیہ کر لیا۔

بی مانی جو پہلے یہاں کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ اب سب سے زیادہ بیزار تھیں۔ منجو بی کی ساس سے بھی ان کی ایک دو بار جھڑپ ہو گئی۔ وہ ان پر اعتراض کرتیں، یہ ان کو دو بد و سناتیں۔ آخر منجو نے روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ کر مانی کو دلی چلتا کیا۔

خدا خدا کر کے شادی کے ڈیڑھ مہینے بعد کوٹھی جو منجو کے لئے تیار ہوئی تھی اس میں گئی تو ذرا اُنکھ کا سانس لیا۔ ساس کی تیز نظروں اور طنزیہ باتوں

سے اب ہر وقت کوفت نہ ہوتی تھی اور یہ بات بھی دل خوش کن تھی کہ پندرہ میں
روز بعد دلی جانے والی تھی۔

(۱۱)

برکھارت کا خیر مقدم یوں تو سارے شمالی ہند میں کیا ہی جاتا ہے لیکن دلّی کے دل والے بہت جوش و خروش سے برسات مناتے ہیں۔ ساون کی جھڑی لگتے ہی مردوں کا منھ قطب صاحب کی جانب اُٹھ جاتا ہے۔ بھلا عورتیں ان سے پیچھے کیوں رہنے لگیں۔ سبزی منڈی کے سارے باغ ان کے لئے ہی ہیں۔ کبھی محل دار خان جاتی ہیں کبھی شالامار اور گلابی باغ۔

سکندر زمانی بیگم کا تو اپنا بہت بڑا باغ نور افشاں تھا۔ اس باغ میں اور پھل تو خیر تھے ہی۔ مگر اپنے بہترین آموں اور گلاب کے لئے یہ دلّی کے باغوں میں خصوصی شہرت رکھتا تھا۔

بیگم صاحبہ حسب معمول برسات کی پہلی بارش ہوتے ہی پورے عملے کے ساتھ باغ آگئی تھیں۔ بہوویں اور کنبے رشتے والیاں، میل جول کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور باغ میں چہل پہل رہتی تھی۔ لیکن ابھی باقاعدہ لڑکیوں نے جھولا نہیں جھولا تھا۔ سبھی کو انجم اور عظمیٰ کا انتظار تھا۔

نواب پھول پور کی صحت ایک سال سے ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے ان کو تبدیلِ آب و ہوا کی رائے دی تو وہ مئی کے شروع میں بیوی بچوں کو لے کر منصوری چلے گئے۔

وہاں جانے کے کچھ دن بعد ہی نواب صاحب کی طبیعت بحال ہو گئی۔ جولائی کے وسط میں ریاست کے ضروری کاموں کی وجہ سے واپس آئے۔ بیگم اور لڑکیوں کو دہلی چھوڑ کر پھول پور چلے گئے۔

انجو کی منگنی منجو بی کی شادی کے دو مہینے بعد ولی عہد سورج گڑھ سے ہو گئی تھی۔ منگنی کے بعد انجو اور چھمو ابھی ملی تھیں۔ چھمو یہ دیکھ کر خوش تھی کہ اس کی پیاری سہیلی پہلے کی طرح اب مرجھائی ہوئی نہیں رہتی تھی انجو کا خوبصورت چہرہ تو شگفتہ پھول کی مانند کھلا رہتا تھا۔ اور وہ نک سک سے بھی درست رہتی تھی۔ چھمو نے ماں سے باغ چلنے کا تقاضا پھول پور والوں کے دلی پہنچتے ہی شروع کر دیا۔ چھوٹی بہو صاحب نے کہا۔ "اے توبہ اس چلچلاتی دھوپ میں کوئی باغ جائے۔ ابر آئے تو جانا بھی اچھا لگے گا۔" آخر ایک دن صبح ہی اودی اودی گھٹائیں آگھریں اور پھوار پڑنے لگی۔ چھوٹی بہو صاحب نے فوراً باغ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں، ملکہ بیگم اور حکیم صاحب کے یہاں کہلا بھیجا کہ کل آپ بھی باغ پہنچ جائیں۔ عنبرن بوا اور عائشہ بی نے شام سے ہی باغ جانے کی تمام چیزیں سمیٹ کر رکھیں۔ عنبر نے جلدی جلدی اپنے اور سب محلے والیوں کے دوپٹے چنپئی رنگے اور چنے۔ سکندر زمانی بیگم کو چھوٹی بہو صاحب نے آدمی بھیج کر اطلاع کرائی کہ کل لڑکیاں جھولا جھولنے کے لئے آئیں گی۔

انہوں نے اپنی مغلانی کو حکم دیا۔ تم صبح بہت ساری کڑھی پکوا لینا۔ کریلے کا دلمہ اور آلو کا بھرتہ تیار کرانا۔ ربکی پراٹھے پکوانا۔ کڑھی کا سب سامان تیار رکھو مگر دیکھو کوئی چیز، تھوڑی نہ ہو۔ اللہ رکھے لڑکیاں بالیاں سبھی تو آئیں گی۔

مغلانی نے منہ اندھیرے جنس تول کر تو مبارک قدم نیک قدم سے

حوالے کی۔ وہ دونوں پکانے کو لگ گئیں۔ مغلانی اور مصاحب عزیز خانم نے نے جلدی جلدی کمروں سے سارے کمرے درست کرائے۔ گول کمرے میں تو سبز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑے کمرے میں جاجم اجلی بچھی تھی۔ اس پر سوزنی کارچوبی کام کی سوزنی بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے۔ بغلی کمرے میں لڑکیوں کے کھیلنے کے لئے صاف دری بچھا دی۔ برآمدے میں پلنگوں پر بیٹھنے کے لئے کھیس بچھائے۔ بیگم صاحب نے اشراق کی نماز کا سلام پھیر کر گلزار سے کہا کہ دو بھیلے تو ہیں دو اور ڈلوا دے۔ پھر وہ وظیفہ پڑھنے لگیں۔ ابھی وہ نماز کی چوکی سے اٹھی ہی تھیں کہ سواریاں آنی شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے لڑکیاں اچھلتی کودتی اتریں چھمو، انجو، عظمیٰ، ستارہ نے آکر آداب کیا۔ چھوٹی بہو صاحب کے اسٹاف سے کھچاکھچ بھری ہوئی گاڑی پہنچی۔ اناؤں ماماؤں کے پورے جلوس کے درمیان خالہ نیفو گلابی دوپٹے میں اپنی چھب دکھاتی اتریں۔ خالہ کے ٹھاٹ آج دیکھنے کے تھے۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں۔ ہاتھوں میں دھانی پہنچے کے ساتھ سنگترے کی چوڑیاں پہنے شوخ رنگ کے بیل ٹینہ لگے دوپٹے میں وہ بالکل نو عمر لڑکی بنی ہوئی تھیں۔ جدھر سے نکل جاتیں عطر سہاگ کی تیز خوشبو سے دماغ مہک جاتے۔ جنرل صاحب کی خوبصورت فٹن پہنچی۔ چھوٹی بہو صاحب دونوں جٹھانیوں اور نجو بی کے ساتھ اتریں۔ قیصر دلہن پہلے ہی لڑکیوں کے ہمراہ آگئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملکہ جہاں بیگم بھی اپنی تینوں بھتیجیوں، مکھو بی، چھپن بی، شبن بی اور بھاوج حشمت دلہن کے ساتھ پہنچ گئیں۔

مکھو بی کی دونوں لڑکیاں زہرہ اور عذرا چھمو کی ہمجولی تھیں۔ حکیم صاحب کے یہاں کی سواریاں بھی آگئیں۔ رنگین لباسوں اور دلکش صورتوں سے باغ لالہ زار بن گیا۔ روش روش پر جھولے پڑ گئے۔ کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ مغلانی شمسی خانم

شروع ہوا۔ منی بیگم اور صاحب عزیز خانم چاروں نے مل کر گانا شروع کیا۔ گھنگھور گھٹا سنو سکھی ساون جو گیا ہو گئے

ان چاروں کی رسیلی آواز سے باغ گونج اٹھا۔ لڑکیاں باری باری پاؤں جوڑ کر دو دو جھول رہی تھیں، گرم گرم پھلکیاں تلی بڑے سنبھال کھا تی جاتیں۔ جب جھولتے جھولتے تھک گئیں تو نہرے پر چلی گئیں۔ ایک نے دوسرے پر خوب پانی اچھالا۔ خاصہ لگ گیا اور کئی کئی دفعہ بلایا گیا تو بیدلی سے کھانے بیٹھیں۔ مگر پیٹ تو پکوان سے بھرا ہوا تھا۔ رہی سہی کسر آموں نے پوری کر دی۔ جلدی جلدی دو چار نوالے مار کر سب کھڑی ہو گئیں اور پھر سب جھولے پر آن ٹنگیں۔

بادل گھر آئے پھوار پڑنے لگی۔ مگر "وہ جوانی ہی کیا کہ جو لاپرواہ نہ ہو" یہ سب جھولتی اور گاتی رہیں۔ جب زور کا چھینٹا پڑا تو "اوئی اوئی" کرتی بھاگیں اندر پہنچتے پہنچتے سب کے کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے۔ دوپٹوں سے رنگ کٹ کر پانی میں مل کر ہر طرف پھیل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عبیر اور گلال بہا دیا گیا ہے دوسرے کپڑے تبدیل کر کے تاش اور چوسر کی بازیاں جم گئیں۔ جمو اور انجو کی باتیں ہی کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ انجو اپنے منگیتر کا ذکر کر کے ہر وقت خوش ہوتی رہتی تھی۔ منگنی پر بیش بہا انگوٹھی کے ساتھ لاکٹ بھی انجو کے لئے آیا تھا۔ اس میں ولیعہد کی تصویر تھی۔ یہ تصویر انجو نے آتے ہی جمو کو دکھائی اور اس کو یہ دیکھ کے خط و خال کا مخمور آنکھوں والا لڑکا ہر طرح انجو کے لئے موزوں نظر آیا اور اس نے ایسا اچھا شریک زندگی پانے پر انجو کو مبارکباد دی۔ اس وقت بھی اس نے انجو سے کہا۔ "میں نہ کہتی تھی کہ ایک دن خدا تم کو صبر کا اجر دے گا بس اب تمہاری قسمت میں چین ہی چین ہے ..... لکھا ہے، مزے سے اپنے میاں کے ساتھ

سیر ہی کرنا، وہاں نہ یہ بھابی قیصر دُلہن ہوں گی نہ آپا بنّو۔"

انجو نے لجا کر کہا۔ "لیکن تم بھی تو وہاں نہ ہوگی۔"

چھمو چٹکی بجا کر بولی۔ "ارے اس کی کیا فکر ہے؟ چاہے سال میں دو پھیرے کرنا۔ ولیعہد بیگم ہو گی۔"

مینھ جل تھل برس کر تھم بھی گیا۔ بادل پھٹ گیا۔ لیکن ان دونوں کی باتیں ختم نہ ہوئیں۔ جھلکیوں دن باقی تھا کہ سورج کی صورت دکھائی دی۔ باغ میں پردہ کرا کر پھر سب بیگمات گلگشت کو نکلیں، شام ہوتے حکیم صاحب کے یہاں کی سواریاں تو واپس گئیں، باقی سب بیویاں مغرب کی نماز کے بعد پلنگوں پر لیٹ کر باتیں کرنے لگیں، منجھلی بہو صاحب اور ملکہ بیگم دو نو بہت زندہ دل بیویاں تھیں تند مزاج کا رشتہ ویسے بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کی آپس کی نوک جھونک سننے کے قابل ہوتی تھی۔ اس وقت بھی دو نو بیگمیں ایک دوسری پر فقرے کس رہی تھیں اور سب ان کی باتوں کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ لڑکیوں کی پارٹی میں جیت بازی ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد ملکہ بیگم نے اپنی مصاحب سے کہا۔ "ہاں، بوا سکینہ بیگم طلسم ہوشربا کی داستان وہاں سے سناؤ جہاں ملکہ الماس پری چہرہ سے شہزادہ ایرج نوجوان کو عشق ہوا ہے۔

سکینہ بیگم نے پاندان کھول کر بڑا سا پان بنا کر چٹکی بھر زردہ اور مٹھی بھر چھالیہ اس میں ڈال کر کلّے میں رکھا پھر اگالدان میں پیک تھوک کر کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "مہرکار با داستان میں یہاں سے شروع کرتی ہوں۔

"صاحبقران تعقب نقابیخ زمرد شاہ باختری کے سامنے لشکر ڈالے پڑے ہیں۔ بادشاہ لشکر اسلام سعد بن کیقباد روزانہ بارگاہ سلیمانی میں دربار کرتے ہیں۔ پانچ سو پنجہ تاجدار اور سات سو سردار شریک دربار رہتے ہیں۔

شہنشاہ افراسیاب بادشاہ طلسم ہوشربا نے ملکہ شعلہ پیراہن جادو کو خداوند لقا کی مدد کو بھیجا تھا۔ اس کو چالاک بن عمرو نے عیاری کرکے مار ڈالا تھا۔ اب پھر خداوند لقا نے افراسیاب سے مدد مانگی ہے۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے اس لیے روز کی میدان داری موقوف ہے۔

شہزادہ ایرج نوجوان نورِ نظر ملک قاسم خاور سپاہ کا بیکاری سے دل گھبرایا۔ اپنے ڈنگل سے اٹھ کر صاحبقران کے سامنے دست بستہ ادب سے سر کو خم کرکے کھڑا ہوگیا۔ صاحبقران نے کہا۔ "بابا! کیا بات ہے؟"

ایرج نے مودبانہ عرض کیا۔ "آج کل موسم خوشگوار ہے میرا خالی بیٹھے دل گھبراتا ہے۔ اجازت دیجیے۔ تو کل صبح شکار کو چلا جاؤں شام تک واپس آجاؤں گا۔"

صاحبقران نے فرمایا "تم نوجوانوں کو چین نہیں، مجھے ستاتے ہو۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میرا اور میری اولاد کا دشمن ہے۔ سب نابنجار ادبے در وہیں بغیر کل صبح چلے جانا لیکن شام ہوتے ہی لشکر میں واپس آجانا۔"

ایرج نے خوش ہو کر تسلیم کی اور کہا "غلام حکم کی تعمیل کرے گا۔" اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ اپنی بارگاہ میں آکر شکار کو جانے کی تیاری کرنے لگا۔ رات گئے تک اہل عملہ تیاری میں مصروف رہے۔ شہزادہ تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوگیا شکار کا لباس پہن کر رہ اشقر پر بیٹھا۔ اس کے عیار چابک بن عمرو نے اپنے آقا کی رکاب پر ہاتھ رکھا اور سیٹی دیتا کرتا ساتھ چلا۔

ایرج کے دونوں بھتیجے سردار سلیم فیلم حفاظتی دستے کے ساتھ دائیں بائیں ہوئے۔ عنتر بن صباح آدھی رات کو ہی شکار کا خیمہ خرگاہ لیکر دو ہزار سواروں کے ساتھ آگے روانہ ہوگیا تھا۔ شہزادے نے پہاڑ کی مغربی سمت کی راہ لی۔ دریے

کے اندر سے نکل کر ایک صحرائے سبزہ زار میں پہنچا۔ یہاں کی ہریالی کوسوں تک دعوتِ نگاہ دیتی تھی۔ ایرج شاداں و فرحاں گھوڑے کی لگام چھوڑے چابک سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ ایک ہرن نظر آیا۔ شہزادہ نے اس پر نگاہ جما کر گھوڑے کو مہمیز کیا۔ ہرن نے ایک دم طرارہ بھرا اور میلوں نکل گیا۔ مگر ایرج کب چھوڑتا تھا۔ جیسے ہی زد پر آیا تیر مارا ہرن زخمی ہو کر لنگڑاتا ہوا کچھ دور چلا اور گر گیا۔ چابک نے دوڑ کر اُٹھایا اور ذبح کیا۔ اور سب دور رہ گئے تھے۔ شہزادہ صبح سے بھوکا تھا۔ شکار کے شوق میں کچھ نہ کھایا تھا۔ چابک نے چقماق سے آگ نکال کر ہرن کو صاف کر کے کباب لگائے۔ ایرج نے کباب کھائے چھاگل سے پانی لے کر پیا اور زین بچھا کر لیٹ گیا۔ شام اب ہو چلی تھی اور اوّل تاریخوں کا چاند پہاڑ کے دامن سے طلوع ہو رہا تھا۔ فضا بہت پرکیف تھی اور خوشگوار ہوا دل کو گدگدا رہی تھی۔ شہزادے نے چابک سے گانے کی فرمائش کی۔ چابک بھی عمر عیّار کے اور لڑکوں کی طرح گانے اور بجانے کا ماہر تھا۔ موج میں آ کر تانیں مارنے لگا۔

ملکہ الماس پری چہرہ دختر ملکہ گلنار جادو مالک طلسم گلنار شبِ ماہ کا لطف لینے کے لئے ہنس پر سوار سیر کرتی پھر رہی تھی۔ اس کے کان میں گانے کی آواز پہنچی کیونکہ خود بھی گانے کی شوقین تھی آواز کی جانب ہنس کا رخ کر لیا۔ جوں جوں قریب آئی آواز کی دلکشی اس کو مسحور کرتی گئی۔ دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک جوان رعنا شاہانہ لباس پہنے نیم تاج سر پر رکھے ہاتھ پر تکیہ کئے لیٹا ہے۔ بھورے بھورے گھنگھریالے بال تیز ہوا سے بکھر رہے ہیں۔ سامنے ایک دبلا پتلا نوجوان اس طرح گا رہا ہے کہ اس کی ہر تان کے ساتھ دل کھنچتا ہے۔ ملکہ کو راگ کی تاثیر کھینچ لائی تھی اور اب اس طرحدار نوجوان کو دیکھ کر وہ بالکل مبہوت ہو کر رہ گئی۔ نہ ایسی دلفریب شکل اُس نے آج سے پہلے نہ دیکھی تھی نہ کبھی ایسا دلکش گانا سنا تھا۔ کبھی ایرج کی

کی نظروں سے بلائیں لیتی۔ کبھی چابک کے نکلنے پر سرد ھنتی۔ ادھر شہزادے نے جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک مہ جبین بھولی بھالی صورت نور کی مورت۔ نافرمانی رنگ کا جوڑا پہنے، جواہر میں غرق، مخمور آنکھیں، کھنچے ہوئے ابرو، لب لعلیں کو دانتوں میں بھینچے ہنس پر سوار ہوا میں لہرا رہی ہے۔

ایرج نوجوان نے کھڑے ہو کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "آؤ صاحب بیٹھو ہم بھی انسان ہیں اور آپ کے مہمان ہیں دو گھڑی ہنس بول کر چلی جانا"

ملکہ شرماتی ہوئی ہنس سے اتری شہزادے نے مسکرا کر ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ملکہ بیٹھ تو گئی لیکن شرمائی ہوئی اور سر جھکائے ہوئے شہزادے نے بہت منت سماجت کی تو آہ سرد کھینچ کر بولی۔ "بس اب ہمیں جانے دیجئے، میری اماں بڑی جلاد ہیں۔ بہت خوشامد کر کے کبھی کبھی چاندنی کو سیر کو نکلتی ہوں اگر ان کو معلوم ہو گیا تو نہ آپ کی خیر ہو گی نہ میری —— میں نگوڑی اچھا گانا سننے کی شوقین ہوں۔ بغیر سوچے سمجھے اس آواز پہ کھنچ آئی۔"

شہزادے نے کہا۔ "دیکھ لیں گے، تمہاری اماں کو بھی — اب تو ہم تم کو نہ جانے دیں گے۔ چابک بھیا! ملکہ کو کچھ اور گانا سناؤ" چابک نے ملکہ کو اقبال و عمر کی زیادتی کے لئے دعائیں دیں اور ایک رنگین غزل گانی شروع کر دی۔

ملکہ سُن تو رہی تھی مگر حالت یہ تھی کہ بار بار گرد و پیش نظر ڈالتی اور پتہ گرنے کی آواز سے بھی تھرا جاتی۔ گانا ختم ہوا تو جانے کے لئے اٹھی۔ شہزادے نے دوپٹے کا آنچل تھام کر کہا۔ "ملکہ، تم اگر جانا ہی چاہتی ہو تو یہ تلوار — اور میرا قصہ جانے سے پہلے ختم کرتی جاؤ۔"

ملکہ نے کانپ کر چابک سے کہا۔ "بھئی ان کو سمجھاؤ، یہ مرد سپاہی ہیں میری بات کیا ہیں۔ بھلا میں کیسے ٹھیر سکتی ہوں، ہاں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ کل

پھر آؤں گی۔"

چابک نے شہزادے کو سمجھایا اور ملکہ نے قسمیں کھائیں تو ایرج نے پلو چھوڑا مگر حالت یہ تھی کہ وہ ہنس پر بیٹھی اور اس کو اڑایا۔ شہزادہ یہ کہتا ہوا چلا "ملکہ ذرا تو ٹھہرو، میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔" اس کا بھی یہ حال تھا کہ ماں کے خوف سے چل تو دی مگر پہلے پہل جو دل پر چوٹ کھائی تھی تو آنکھوں میں آنسو بھرے چلے آتے تھے۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مڑ مڑ کر ایرج کو بہ نگاہِ حسرت دیکھتی جاتی تھی۔ گھر پہنچی تو ماں غصے سے لال بھبوکا بنی بیٹھی تھی اور لونڈیوں سے کہہ رہی تھی۔ "کمبختو! تم نے اپنی سیر و تفریح کے لئے میری بچی کو بھی بگاڑا، ورنہ وہ ایسی ہوائی دیدہ نہ تھی۔ اگر کچھ ایسی ویسی ہو گئی، تو تمہارا کیا جائے گا۔ میری مامتا اجڑ جائے گی۔ میرے منہ میں خاک، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔" (بیٹی کو دیکھ کر بولی) کیوں بی بی! کہاں ماری ماری پھرتی رہیں۔ رات کا ایک پہر گزر گیا نہ تم کو میرا خیال آیا نہ کھانے کا۔ گلزار کو بھی ساتھ نہیں لے گئیں۔ ملکہ نے گھبرا کر کہا۔

"گلزار آج ماندی ہو رہی تھی اس لئے میں اکیلی ہی چلی گئی۔ یہیں قریب تو چاندنی کی سیر کر رہی تھی، سماں اتنا پیارا تھا کہ وقت گزرتا مجھے معلوم نہیں ہوا۔"

گلنار جادو بیٹی کی حیران نگاہیں اور گھبرائے ہوئے انداز کو دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ سچ نہیں کہہ رہی مگر بغیر کچھ معلوم ہوئے کہتی کیا، یہ کہہ کر خاموش ہو گئی "خبردار آئندہ بغیر گلزار اور اپنی کھلائی کے اکیلی کہیں نہ جانا۔ یوں راتوں کو کنواری بالی لڑکیوں کا تنہا پھرنا اچھا نہیں ہوتا۔ دوست کم، دشمن زیادہ۔ کوئی یونہی جھوٹ کچھ تمہارے متعلق کہہ دے تو مجھے منہ دکھانے کی بھی جگہ نہیں رہے گی۔"

ملکہ سر جھکائے ماں کی نصیحت سنتی رہی۔ مگر دل تھا کہ اس کو کسی طرح

قرار نہ تھا۔ کھانا آیا تو ماں کی وجہ سے بیٹھ تو گئی۔ مگر حالت یہ تھی کہ نوالہ حلق سے اُلٹا چلا آتا تھا۔ بہ مشکل دو چار لقمے پانی کے گھونٹ کے ساتھ اتارے پھر کھڑی ہو گئی اور چھپر کھٹ پر منھ ڈھک کر لیٹ گئی۔ چنپی کرنے والی لونڈیوں کو کہہ دیا مجھے تنہا لیٹنے دو۔ ساری رات شہزادے کے تصور میں جاگ کر کاٹی صبح ہوتے ہی آنکھ لگی تو پھر دن چڑھے جاگی۔ منھ ہاتھ دھو کر ماں کو جا کر آداب کیا اور ساتھ کھانا کھایا۔ دن ڈھلتے ہی ماں سے جا کر کہا۔

"اپنے باغ میں جانے کی تو مجھے اجازت ہے۔"

"اوئی، وہاں جانے کو کون منع کرتا ہے۔" گلنار جادو نے کہا۔

ملکہ نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ اور اپنی وزیر زادی، کھلائی، اور چند ہمراز خواصوں کے ہمراہ باغ گئی۔ وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی ساری داستان وزیر زادی گلزار کو سنائی۔ وہ ملکہ کو بہت چاہتی تھی بولی۔ "رنج کرے تمہاری بلا — وہ کام کرو، کہ سانپ مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ کر کے سرِ شام بارہ دری کے پردے ڈلوا دو اور لیٹ جاؤ۔ میں سب کو نکال دوں گی۔ خود تمہارے پاس رہوں گی۔ موقعہ پاکر تم چپکے سے نکل جانا۔"

ملکہ نے خوش ہو کر گلزار کو گلے لگا لیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی سر میں درد ہونے کا بہانہ کر کے لیٹ رہی، گلزار نے صندل پسوا کر منگوایا۔ بارہ دری کے پردے گرا دیئے اور کہا۔ "دیکھو خبردار کوئی قریب نہ آئے۔ میں نے صندل لگایا اور سر دبایا تو ملکہ کی آنکھ لگی ہے۔"

بھلا لونڈیوں، خواصوں کو کیا غرض تھی جو جاتیں، باغ میں بکھر گئیں۔ اور چہلیں کرنے لگیں۔ ملکہ شام کا دھندلکا پھیلتے ہی ہنس پر بیٹھ روانہ ہو گئیں۔ گلزار نے اوّل وقت ہی کھانا کھا لیا اور ملکہ کے چھپر کھٹ کے قریب پلنگڑی

پر جا کر سو گئی۔

گلنار جادو کو بیٹھے بیٹھے ایک دم خیال آیا کہ کہیں بیٹی نے مجھے چکمہ تو نہیں دیا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی فکر میں ہے اور بیٹی کو دیکھنے کے لئے سنّاٹا مار کر خود چلی، باغ میں پہنچی تو دیکھا سب عملے والیاں بے خبر سوتی ہیں، بارہ دری میں گلزار کو غافل سوتے دیکھا۔ پھر کھٹ کا پردہ ہٹایا تو ملکہ کو نہ پایا، سمجھ گئی کہ چالاک لڑکی دھوکہ دے کر نکل گئی۔ غصّہ میں گلزار کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ اس طرح آنکھیں ملتی اُٹھی گویا بالکل بے خبر سو رہی تھی۔

گلنار جادو نے پوچھا۔ "اری تو تو سو رہی ہے، وہ منتنی کہاں ہے؟"

گلزار بولی۔ "یہیں کہیں ہوں گی اُن کے سر میں تو شام سے درد تھا کھانا بھی اس لئے نہیں کھایا۔ میں نے صندل گھس کر لگایا تو بڑی مشکل سے اُن کی آنکھ لگی میں بھی لیٹ گئی، شاید چوکی پر ہوں"

گلزار نے گلنار کے ساتھ باغ کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا اور دل میں ملکہ کے آنے کی دعائیں کرتی جاتی تھی۔ مگر وہ ہوتی تو ملتی۔ آخر گلنار بکتی جھکتی باغ سے نکلی اور چاروں طرف اس نے اوپر بلند ہو کر نگاہ دوڑائی۔ پھر ہر طرف کچھ دور تک وہ گھومی۔ ایک جانب سے اس کو بہت فاصلے سے گانے کی آواز آئی۔ اس نے سوچا شاید ادھر سراغ مل جائے۔ بہت اونچی ہو کر اسی طرف چلی، کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ملکہ ایک خوش رو جوانِ رعنا کے پہلو میں بے تکلف انداز سے بیٹھی ہے۔ ایک دبلا پتلا عیار وضع نوجوان سامنے بیٹھا تانیں مار رہا ہے۔ گلنار جادو بیٹی کی یہ دیدہ دلیری دیکھ کر جل ہی تو گئی۔ دور ہی سے للکار کر کہا۔ "او گیسو بریدہ، تو نے میری ناک کاٹ ڈالی۔ او بے حیا تجھ کو اس طرح غیر مرد کے پاس بیٹھتے شرم بھی نہیں آتی۔" ماں کی آواز سن کر ملکہ نے کانپ کر کہا۔ "شہریار! خدا حافظ۔

میں اب جیتے جی تم کو نہ دیکھ سکوں گی۔"

اور ایرج نے اپنے بیٹے کو سنبھال کر ملکہ کے گرد باہیں ڈال کر کہا۔ "او عورت تو کون ہے جو ہمارے ناموس کو برا بھلا کہتی ہے، اُدھر آ، ہم سے بات کر۔"

گلنار جادو اب قریب پہنچ چکی تھی۔ ایرج کی جانب ہاتھ ہلا کر بولی "او موئے الکاٹا ایک تو میری جوان بیٹی کو لئے بیٹھا ہے۔ اوپر سے اُلٹا مجھ پہ ہی غصہ آتا ہے۔"

گلنار جادو کے ہاتھ ہلانے سے بجلی چمکی، ایرج کی آنکھیں جھپک گئیں۔ تیغ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اب جو ایرج کی آنکھ کھلی تو دیکھا ملکہ کو گلنار جادو گھسیٹتی ہوئی لئے جاتی تھی بے اختیار پیچھے دوڑے مگر وہ اتنے میں سناٹا مار کر بہت بلند ہو گئی۔ ایرج سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جا تیری جوانی پر رحم آتا ہے اس لئے چھوڑ دیا ورنہ کام تو تو نے ایسا کیا تھا کہ تیری بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلاتی۔ قصور تو اس کمبخت نامراد کا ہے، ایسی سزا اس بے حیائی کی اس کو دوں گی کہ یاد کرے گی، مردوں کا کیا ہے جہاں کوئی اچھی شکل نظر آئی پھسل گئے۔" یہ کہہ کر وہ تو ہوا ہوئی۔

ایرج نے اپنا تاج زمین پہ دے مارا اور غصے سے بپھر کر کہا۔ "قسم رب کعبہ کی۔ میں ملکہ کو لے کر آؤں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔"

چابک بولا۔ "واہ یہ اچھی زبردستی ہے ارے صاحب، وہ اپنی بیٹی کو لے گئی۔ آپ کیوں اس میں مداخلت کریں ہر شخص کو اپنی اولاد کا اختیار ہوتا ہے۔"

ایرج نے زور سے آہ بھر کر کہا۔ "وہ عورت ذات تو ایسی باوفا کہ وعدے کو نبھانے کی خاطر ماں کی بھی پرواہ نہ کرے اور جان پر کھیل کر پہنچ گئی، اور میں مرد سپاہی ہو کر رانڈ عورتوں کی طرح بیٹھا روتا ہوں۔ نہ جانے مجھ کمبخت کی وجہ

سے یہ نابنجار عورت ملکہ پر کتنے ظلم توڑے گی۔ "تم دادا جان سے جاکر کہہ دو۔ ایرج طلسم گلنار فتح کرنے گیا اگر جیتا بچ گیا تو واپس آکر ان کی قدم بوسی کروں گا ورنہ وہ اور والد صاحب مجھے صبر کرلیں۔"

یہ کہہ کر کرہ بن اشقر پرزین رکھ کر دامن گردان کر سوار ہوا۔ چابک بن عمرو نے کہا۔ "خوب، گویا میں تم کو چھوڑ کر جاؤں گا تو صاحبقران خوش ہوں گے۔ جو تمہارا حال وہ میرا حال۔" یہ کہہ کر شہزادے کی باگ تھامے ساتھ چلا۔

یہاں تک داستان سکینہ بیگم نے سنائی تھی۔ کہ بیگموں کو نیند آنے لگی اور سب نے لمبی تان لی۔

دوسرے دن شام کو آموں کے ٹوکرے لیکر باغ سے لدی پھندی بیگمات واپس آئیں۔

(۱۲)

جنوری کا مہینہ شروع ہوتے ہی سردی چمک گئی دن بھر غضب کی ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی تھی، مہاوٹ کھل کر تو ایک ہی پڑی تھی مگر ابر دوسرے تیسرے روز موجود رہتا تھا۔

رنگ محل میں اس مرتبہ ہمیشہ کی طرح سردی کا پرجوش خیر مقدم نہیں کیا گیا تھا بیگمات کے دل ہی ٹھیک نہ تھے، حلوا سوہن کا کھانا بھی چھوٹی بہو صاحب نے ایک دفعہ لشتم پشتم کرکے چڑھایا تھا، لیکن وہ روزانہ گاجر کی تری یا پنیڈیاں بنوانے کی فرصت کسی کو نہ تھی

نواب پھول پور دو مہینے سے سخت علیل تھے۔ ان کی صحت تو ڈیڑھ سال سے خراب تھی مگر جوانی کی ہمت تھی جو ساتھ دیتی رہی۔ اس مرتبہ مسوری گئے تو ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ آنتوں میں زخم ہیں اگر علاج باقاعدہ نہیں کیا گیا تو صحت کا بحال ہونا مشکل ہے۔ لیکن نواب صاحب ریاست کے کاموں کی وجہ سے ڈھائی مہینے سے زیادہ مسوری نہ رہ سکے۔ بظاہر ان کی صحت کافی سنبھل گئی تھی دواؤں کا استعمال اور پرہیز وہ باقاعدہ کرتے رہے، اگست کا مہینہ تو زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے کافی اچھا رہا۔ مگر ستمبر میں بارش بند ہوتے ہی پھول پور

میں کافی گرمی ہو گئی اور نواب صاحب کی طبیعت ایک دم گرمی ہو جانے سے بگڑ گئی۔ ان کو اسی حال میں بڑے نواب صاحب دہلی لے کر آئے۔ یہاں آکر پے درپے تین ڈاکٹروں کا علاج بدلا۔ مگر افاقہ ہونے کے بجائے دن بدن مرض میں زیادتی ہوتی گئی۔ روزانہ ان کو دوپہر کے وقت حرارت ہو جاتی تھی اور جو غذا بھی دی جاتی وہ سب دستوں میں نکل جاتی تھی۔ وہ پہلے ہی دُبلے تھے اور اب تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئے تھے

منجھلی بہو صاحب تو جب دن سے نواب صاحب دلّی آئے پھول پور ہاؤس میں زیادہ رہتی تھیں، بڑی بہو صاحب اور چھوٹی بہو صاحب بھی دوسرے تیسرے روز ہو آتیں اور عزیزوں اور دوستوں کا بھی ہر وقت خیریت پوچھنے کے لئے تانتا لگا رہتا تھا۔ قیصر دلہن پر ان دنوں مہمانوں کی تواضع کی بھی ذمے داری تھی اور نواب صاحب کی دوا اور غذا کا خیال رکھنا بھی۔ انجو بھی باپ کی بیماری سے بہت پریشان تھی۔ البتہ بنو بی ہمیشہ کی طرح بنی سنوری بیٹھی مسکرایا کرتیں، ان کو میاں کے بیمار ہونے کا ذرا بھی فکر نہ تھا بلکہ نواب صاحب کے زرد سیاہی مائل چہرے اور سوکھے جسم کو دیکھ کر خوف کے مارے ان کو جھرجھری آجاتی تھی۔ وہ تو بس صبح وشام اور سب بیگموں کے ساتھ میاں کو دیکھنے گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے چلی جاتی تھیں۔ نواب صاحب کے پاس رات دن نرس رہتی تھی اور ان کے چاروں خدمت گار باری باری دیکھ بھال کرتے رہتے۔ نواب صاحب اس حال میں بھی نہ امور ریاست کو بھولے تھے نہ اپنے بچوں کو، شاہرخ مرزا کی منگنی فریدہ سے دھوم دھام سے کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ دلہن کے لئے ہیرے یاقوت کی انگشتری اور گلوبند دلّی کے مشہور جوہری کو تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا انجو بی کی شادی بھی اعلیٰ پیمانہ پر کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ سورج گڈھ والوں سے کسی

بات میں کم رہنا نہیں چاہتے تھے۔ انجو کے جہیز کے لئے بھاری بھاری چاندی کے برتن تیار ہو رہے تھے۔ اور قیمتی جڑاؤ زیور بن رہے تھے۔ کپڑے تیار کرانے کے لئے منجھلی بہو صاحب کو انہوں نے پانچ ہزار روپے پہلے ہی دیدیئے تھے۔ غرضیکہ ان کا دل و دماغ کاموں میں مصروف تھا۔ اور کمزور جسم خطرناک مرض سے لڑ رہا تھا کہ ملک الموت اس اولوالعزم اور دھن کے پکے انسان کی طرف ایک دم جھپٹا۔ یوں تو نواب صاحب کی حالت ایک ہفتے سے خراب تھی۔ لیکن ڈاکٹروں نے ابھی اُمید بالکل نہ چھوڑی تھی۔ دو روز سے ان کو حرارت نہیں ہوئی تھی طبیعت بحال تھی اور رات کو نیند بھی اچھی طرح آ گئی تھی۔ ان کا یہ سنبھالا ڈاکٹروں اور تیمارداروں کو مطمئن کئے ہوئے تھا۔ ۲۸ر جنوری کی رات کو دس بجے تک وہ اپنے سیکریٹری کو ضروری ہدایات دیتے رہے۔ دو بجے ایک دم جاگے اور ان کو سخت گھبراہٹ اس وقت ہوئی۔ ڈاکٹر ریاست کا تو پاس ہی تھا۔ اس نے سکون کے لئے گلوکوز کا انجکشن دیا۔ معالج ڈاکٹر کو لینے کے لئے کار بھیجدی گئی۔ لیکن تین بجے نواب صاحب ریاست اور امور ریاست کو چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئے۔

حالت بگڑتے ہی قیصر دلہن انجو بی، منجھلی بہو صاحب نواب صاحب کو دیکھنے باہر پہنچ گئی تھیں۔ نواب صاحب نے بڑی مشکل سے کہا۔ "بیگم کو بھی بلاؤ" اور قیصر دلہن نے بنو بی کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ اس وقت پہنچیں جب نواب صاحب کی آنکھوں میں دم تھا۔ ایک نگاہ حسرت مرتے والے نے نو عمر بیوی پر ڈالی اور ختم ہو گیا۔

قیصر دُلہن نے بیٹی کو گلے لگا کر چیخ مار کر کہا۔ "ہائے میرے دولہا، تم تو چلے گئے۔ اب یہ بدنصیب کس کے سہارے اپنی بھری جوانی کاٹے گی۔"

منجھلی بہو صاحب کو تسکین پوری کرنی مشکل ہو گئی۔ دفورِ رقت سے ان

کا بُرا حال تھا۔ بن ماں کے بچے آج بن باپ کے بھی ہو گئے۔ ابّو مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ بڑے نواب صاحب بیٹے کے سرہانے کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔ اور منجھلے صاحب کبھی نواسی کو پیار کرتے کبھی پوتی کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ برابر کے کمرے اور برآمدے میں اہلکاران ریاست اور عزیز و اقربا رو رہے تھے۔ لیکن بتو بی کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ لبوں پر آہ۔ مرمریں بت کی مانند بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔ اس جسد بے جاں سے انہوں نے محبت ہی کب کی تھی جو ان کو رنج ہوتا۔ کچھ دیر بعد منجھلے صاحب روتی پیٹتی بیگمات کو اندر لے گئے۔ نواب کو قبلہ رو کر کے سفید چادر اوڑھا دی۔ ان کے دو خدمت گار مورچھل کرنے لگے۔ لوبان اور اگر سلگا دیا گیا۔ سامنے برآمدے میں دو حافظ تلاوت کلام پاک کر رہے تھے اور پرائیویٹ سکریٹری ٹیلیفون پر نواب صاحب کے انتقال کی خبر دوستوں اور عزیزوں کو دے رہا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے پھول پور ہاؤس اندر باہر کھچا کھچ بھر گیا۔ پورا محل نالہ و شیون آہ و بکا کی صدا سے گونج رہا تھا اور ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ بتو بی سادے شب خوابی کے لباس پر زعفرانی ریشم کی پٹّاتے کی گوٹ کی لچکا لگی دلائی اوڑھے ہوئے تھیں۔ ہاتھوں میں خوبصورت چوڑیاں دھانی بانک اور سونے کے طلائی کڑے تھے۔ انگلیاں انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں اور کانوں میں جڑاؤ جھمکے جھول رہے تھے۔ چھوٹی بہو صاحبہ نے رو کر جٹھانی سے کہا "اے بھابی جان! بتو کا یہ زیور اور دلائی اتروا لیجئے۔ اس کا سنگار تو اب اجڑ گیا۔" منجھلی بہو صاحب آنسو پونچھتی ہوئی اٹھیں اور پوتی کو سفید شال لا کر اوڑھا دی۔ چھوٹی بہو صاحب نے بتو کے کانوں سے جھمکے گلے سے چمپا کلی انگلیوں سے انگوٹھیاں، ہاتھوں سے کڑے اتار کر قیصر دلہن کو دے دیئے اور زار و قطار رو

رونے لگیں۔ نیر دلہن بیٹی کے سر پر سفید شال دیکھ کر اور زیور اترنے پر اپنے آپ کو پیٹے ڈال رہی تھیں اور بین کر رہی تھیں۔ بڑی نند نے نجو کی خوبصورت چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ یہ چوڑیاں چار دن پہلے ہی اس نے بڑے شوق سے پہنی تھیں۔ ان کے ٹوٹنے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ چھوٹی بہو صاحب نے اس الڑ کمسن بیوہ کو گلے لگا لیا تو اس نے کہا۔ "کیا چھوٹی دادی جان! میں چوڑیاں اور زیور بھی نہیں پہن سکوں گی۔" اس کے اس سوال پر سب بیبیاں روتے روتے بے حال ہو گئیں۔ اس نا سمجھ لڑکی کا سہاگ اُجڑ گیا تھا جس کو اپنے شوہر کا غم کرنے کی سمجھ نہ تھی۔ چوڑیوں کے ٹوٹنے اور زیور کے اترنے کا رنج تھا۔ اسی طرح روتے دھوتے دن چڑھ گیا۔ نواب صاحب کی وصیت تھی کہ ان کی مرحوم بیگم کے قریب ان کو دفنایا جائے۔ وصیت کے مطابق قدم شریف ان کو لے گئے۔ جنازہ کے ساتھ سونا اتارا گیا تھا جو غربا کو تقسیم کیا گیا۔

پھولوں کی فاتحہ کے دو دن بعد بڑے نواب صاحب سب کو لے کر پھول پور چلے گئے۔ منجھلی بہو صاحب چاہتی تھیں کہ نجو کی عدت یہیں ہو جہاں میاں کا انتقال ہوا ہے۔ مگر بڑے نواب صاحب نے ان کی رائے نہیں مانی اس لئے وہ پھول پور نہیں گئیں۔ انجو کا باپ کے غم میں برا حال تھا۔ باپ کی موت کے بعد ماں کی موت کا غم بھی اس کے لئے تازہ ہو گیا۔

شاہ رخ مرزا دہرہ دون سے آگئے تھے چودہ سال کا یہ کمسن لڑکا بھلا کیا کر سکتا تھا۔ دادا کا منہ دیکھتا رہتا۔ پھول پور کے خزانے میں اب کافی روپیہ موجود تھا۔ اس لئے ہی بڑے نواب صاحب کو یہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ آٹھ سال قبل جب ریاست کی باگ فریدوں بخت کے ہاتھ میں آئی تو قرضے کا بہت بڑا بوجھ ریاست پر تھا۔ مرحوم نواب نے اپنے حسن انتظام کی بدولت قرضہ بھی

اُتار دیا اور کافی روپیہ جمع کرلیا۔

بڑے نواب صاحب ریاست سے دست بردار کچھ بیٹے کی محبت سے نہیں ہوئے تھے بلکہ قرضے کے باعث پریشان ہوکر الگ ہو گئے تھے اب وہ خوش تھے کہ ریاست کا خزانہ معمور تھا اور پوتا نابالغ ۔ خواہ سیاہ کریں یا سفید ۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا ۔ چنانچہ مرحوم نواب کے چہلم کے دو ہفتے بعد ہی انہوں نے بہت دھوم سے پوتے کی مسند نشینی کا جشن کیا۔

تین دن تک رقص و سرود کی محفلیں ہوتی رہیں، نواب فریدون بخت نے جو روپیہ انجو کی شادی کے لئے بڑے جوڑ توڑ لگا کر اور اپنے پر کشش کر کے جمع کیا تھا اس میں سے کافی ان فضولیات میں برباد ہوگیا۔

منجھلی بہو صاحب مسند نشینی میں بھی نہیں شریک ہوئیں، منجھلے صاحب اور قیصر مرزا آگئے تھے ۔ وہ چند دن رہ کر یوں روپے کو برباد ہوتے دیکھ کر افسوس کرتے واپس ہوئے۔

مسند نشینی کے جشن میں ریذیڈنٹ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ کمسن نواب سلیمان قدر عرف شاہرخ مرزا کا نگراں بڑے نواب صاحب کو انہوں نے مقرر کردیا۔ شاہرخ مرزا بہت خوش تھے ۔ اب ان کو کھیلنے کودنے کی پوری آزادی تھی ۔ وہ جتنا روپیہ بھی مانگتے دادا دیتے تھے۔ تنبیہہ کرنے والا باپ ابدی نیند سو چکا تھا۔

مسند نشینی کا بلاوا سورج گڈھ بھی گیا تھا ۔ نواب فریدوں بخت کی وفات پر تو سورج گڈھ کے دیوان تعزیت کے لئے آئے تھے ۔ اب خوشی کا موقع تھا اس لئے نواب سورج گڈھ خود تو نہ آئے لیکن ولیعہد کو اپنے چچا زاد بھائی اور اے ڈی سی کے ساتھ شاہ رخ مرزا کے لئے خلعت بھجوایا تھا

دے کر بھیجا۔ مسند نشینی سے ایک دن قبل یہ لوگ پہنچے تھے، اور سب مہمان تو تیسرے دن شام کو رخصت ہوئے لیکن ولی عہد سورج گڑھ نصرت علی خاں کو شاہ رخ مرزا نے شکار کھیلنے کی دعوت دے کر روک لیا۔ نصرت کو اپنی منسوبہ کو دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ یوں تو وہ انجو سے کچھ مہینے عمر میں چھوٹا تھا۔ اور اپنی عمر کی سولہویں منزل بھی اس نے پوری نہیں کی تھی۔ مگر بہت ذہین اور ہوش مند نوجوان تھا۔ شاہ رخ سے چار دن میں ہی بہت بے تکلفی اپنی ذہانت کی وجہ سے نصرت علی خاں نے بڑھا لی تھی۔

واپسی سے دو دن قبل شاہ رخ سے کہا: "ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گے؟"

شاہ رُخ نے تبسّم آفریں لہجے میں جواب دیا۔ بھلا میں آپ کی کسی بات پر بُرا مان سکتا ہوں۔

"بھئی، بات یہ ہے کہ میں ذرا انجو سے ملنا چاہتا ہوں۔" ولی عہد سورج گڑھ نے رک رک کر کہا۔

شاہ رخ مرزا نے چند لمحے کے سکوت کے بعد سنجیدہ ہو کر جواب دیا: "آپ تو جانتے ہی ہیں ہمارے یہاں پردہ کتنا سخت ہے۔ بیگمات محل سے باہر نکلتی ہی نہیں کسی تقریب یا دربار کی وجہ سے اگر باہر کی کوٹھی میں آتی ہیں تو پردے کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی گرمیوں میں چاندنی راتوں میں نہر پہ پردہ کرا کر ٹہلنے چلی جاتی ہیں۔"

ولی عہد نے تالی بجا کر کہا۔ "بس بس کام بن گیا، اپنی بہن کو آج شام کو سیر کے لئے نہر پہ لے چلیے۔ میں ان سے وہیں مل لوں گا۔"

شاہ رخ مرزا نے: "لیکن وہ تو جب سے آپ آئے ہیں اپنے کمرے سے بھی بہت

کم باہر نکلتی ہیں۔ بھلا نہر تک کہاں آئیں گی؟

نصرت نے کہا۔" میں یہ عذر نہیں مانتا، تم بھائی کیسے ہو، منا کر لے آنا۔"

شاہ رخ مرزا شوخ لہجے میں۔" بہت خوب، آپ کی خاطر مجھے یہ بھی منظور ہے۔"

سورج غروب ہوتے ہی ولی عہد سورج گڑھ گھوڑے پر نہر کی جانب چل دئے۔

شاہ رخ مرزا نے جاکر انجو سے کہا۔" آپا، آپ کا ہر وقت کمرے میں بیٹھے رہنے سے جی نہیں گھبراتا۔ چلئے آج نہر کے کنارے ٹہل کر آئیں گے۔

انجو۔" اے واہ! یہ کوئی موقعہ میرے باہر نکلنے کا ہے۔ ادھر ادھر کے لوگ آئے ہوئے ہیں، ممانی جان سینکڑوں باتیں بنائیں گی۔"

شاہ رخ مرزا منھ بنا کر۔" اونہہ، ممانی جان کی تو عادت ہی بیجا نکتہ چینی کرنے کی ہے ان کی پرواہ کون کرے۔ اندھیرا ہو چکا ہے۔ مہمان تو سب قلعے میں ہیں اور محفل میں جانے کی تیاری میں مصروف ہیں، ایسے میں ہمیں کون دیکھے گا۔ آپ ضرور کچھ دیر باہر کی ہوا کھائیں۔

انجو کھڑے ہو کر بولی۔" اچھا، عظمیٰ اور ستارہ کو تو بلا لوں۔"

شاہ رخ مرزا نے کہا۔" اونہہ، ان دونوں کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ادھر مہتابی پر آنکھ مچولی کھیلنے میں مگن ہیں۔"

انجو نے برقعہ پہننا چاہا تو شاہ رخ مرزا نے کہا۔" وہاں تو پردے کا پورا انتظام ہے۔ میں نے پہرے کے لئے سپاہیوں کو بھیج دیا ہے۔ بھلا پھر اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں ابھی سردی کافی ہوتی ہے کوئی ہلکی چادر کاندھوں پر ڈال لیجئے۔"

انجو نے کہا۔" نہیں، میرا دوپٹہ کافی موٹی سلک کا ہے۔

پھر دونوں بھائیوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ نہر قلعے کے قریب ہی تو تھی۔

چند منٹ میں یہ لوگ پہنچ گئے۔ ولی عہد سورج گڑھ کا رکا ہارن سن کر درخت کی آڑ میں ہو گئے۔ گھوڑے کو انھوں نے پہلے ہی دور چھوڑا تھا۔ انجو مرزے سے شاپور اور شاہ رخ سے باتیں کرتی درخت کے قریب پہنچ گئی۔ شریر شاہ رخ نے نصرت علی خاں کو درخت کی آڑ میں دیکھ لیا تھا۔ شاپور سے کہا۔ "ذرا میری بانسری تو گاڑی میں سے لے آؤ۔" وہ گیا ہی تھا کہ شاہ رخ نے کہا۔ "آپا، میں ابھی بانسری لے کر آتا ہوں شاپور کاہل لڑکا ہے دیر لگا دے گا۔"

انجو نے کہا۔ "ذرا جلدی آنا، یہاں بالکل سناٹا ہے اور چاند کی ہلکی سی روشنی ہے۔"

شاہ رخ مرزا کے جاتے ہی ولی عہد نصرت علی خاں مسکراتے ہوئے انجو کے سامنے آ گئے۔ یہ صورت انجو کے خیالوں میں ہر وقت بسی رہتی تھی۔ پھر بھلا وہ کیسے نہ پہچان لیتی، دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ نصرت نے شوخ لہجے میں کہا۔ "یہ پسند نہیں ہے، ڈارلنگ! ہم تو اس طرح تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے مشکل سے آئے ہیں اور تم ہمیں دیکھتے ہی منھ چھپا کر بیٹھ گئیں۔ جلدی منھ پر سے ہاتھ ہٹا لو ورنہ میں ہٹا دوں گا۔"

کہیں یہ شریر اپنا کہنا نہ کرے اس لئے انجو نے ہاتھ منھ پر سے ہٹائے مگر شرم کے مارے وہ کانپ رہی تھی اور سر اس کا زمین سے لگا جاتا تھا اس کو ایک نامحرم کے سامنے بیٹھنے کا پہلا اتفاق تھا۔ خواہ وہ اس کا منگیتر ہی تھا۔ جس ماحول میں انجو پلی بڑھی تھی وہاں بیویاں بھی شوہروں سے اونچی نظر کر کے بات نہیں کرتی تھیں۔ ولی عہد نصرت علی خاں یہ دیکھ کر بہت مسرور ہوئے کہ ان کی منسوبہ کی صورت تصویر سے بھی زیادہ دل کش ہے۔ ابھی وہ اس شرمیلی حسینہ کے دلربا حسن کی داد والہانہ انداز سے دیکھ کر دے ہی رہے تھے کہ انجو

نے بہت ہمت کر کے آہستہ سے رُک رُک کر کہا۔ "میں منت کرتی ہوں آپ اب یہاں سے چلے جائیے۔ شاہ رخ اور شاپور نے اگر ہم دونوں کو اس طرح ساتھ دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

ولی عہد نے انجو کے اور قریب کھسک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔ "دیکھو جی! ہماری رسائی یہاں بہت مشکل سے ہوئی ہے، بھلا ایسی بھی کیا بے مروتی کہ تم بجائے خاطر مدارات کرنے کے ہمیں نکالنے پر تلی ہوئی ہو۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہو، جتنی مجھ کو تم سے ہے۔"

انجو نے سر ہلا دیا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ولی عہد نصرت علی نے انجو کے ہاتھ کو محبت سے دبا کر کہا۔ "اونہو، یوں نہیں، وعدہ کرو کہ تم میرے خطوں کا جواب دو گی، جب تمہارا ہاتھ چھوڑوں گا۔"

انجو آہستہ سے "جی ہاں!"

ولی عہد نصرت علی خاں نے سونے کا چھلا اپنی چھنگلی سے اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دیا اور اس کے ہاتھ کو چوم کر جھکے ہوئے سر کو اُٹھا کر شوخ لہجے میں کہا۔ "میری طرف دیکھو، انجو!" اور انجو نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ اس شریر نوجوان کے کہنے پر عمل کرے، شرمائی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا اور ولی عہد نے انجو کو کھڑا کرتے ہوئے کہا، "اچھا اب خوف زدہ نہ ہو، جاؤ تم کو بخش دیا۔ اور اب جلد سیئے، ہمیں بھول نہ جانا۔"

انجو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "خدا حافظ۔"

ولی عہد کے پیٹھ پھیرتے ہی وہ موٹر کی جانب چلی مگر اس طرح کہ تمام جسم پسینے میں شرابور تھا۔ دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ پاؤں ڈالتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ ولی عہد پھیر کھا، انجو سے پہلے کار کے قریب پہنچ گئے تھے

اور اب دونوں سالوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ انجو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی پہنچی تو ان حضرت کو دیکھتے ہی منہ پھیر کر ٹھٹک گئی۔

ولی عہد قہقہہ لگا کر۔ "اوہو، شاہ رخ میاں! ہمیں خبر نہ تھی کہ تمہاری ہمشیرہ صاحبہ محترمہ بھی ساتھ تشریف لائی ہیں، ہمارا اسلام بھی ان کو پہنچا دو۔ مگر یہ ہم سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہیں جب ہی تو منہ موڑ لیا۔ اے بھائی ہم تو مسافر ہیں۔ اگر لوگ ہم سے خوش نہیں تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

شاہ رخ کا جواب سنے بغیر وہ ہنستے ہوئے اپنے گھوڑے کی جانب چل دئے۔

شاہ رخ نے موٹر کا پٹ کھول کر انجو کو ہاتھ پکڑ کر اس میں بٹھا دیا۔ وہ ابھی تک گم سم تھی۔ راستے میں بھی اس نے بھائیوں سے کوئی بات نہیں کی، اچانک اپنے منگیتر کی ملاقات سے وہ بے حد لجا رہی تھی اور کسی سے آنکھ چار کرنے کی ہمت اس کو نہ ہوتی تھی۔ بھائی بھی خاموش رہے۔ گاڑی کے رکتے ہی انجو اتر کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ شرم کے مارے رات کا کھانا بھی اس نے نہیں کھایا۔

دوسرے دن شام کو ولی عہد سوئج گڑھ مسرور و شاد کام رخصت ہوئے بڑے نواب صاحب نے ان کو ڈھائی سو روپے ناشتہ کے دئے۔ چچا اور ان کے اے ڈی سی کو بھاری خلعت ملے۔ امام ضامن ایک اشرفی کا نوبی کی طرف سے باندھا گیا۔

(۱۳)

ہوا یُوں ــــــ کہ عید کے چوتھے روز صبح ہی صبح ابھی چھوٹی بہو صاحب کنگھی چوٹی کر کے بیٹھی ہی تھیں کہ جنرل صاحب بے حد پریشان آئے اور کہا: "منجو کا تار آیا ہے، اس کی طبیعت بہت خراب ہے، آج رات کی گاڑی سے ہی چلنا ہوگا، میں نے درجہ ریزرو کرنے کے لئے دروغہ کو بھیج دیا ہے۔ تم تیاری کر لو۔"

وہ تو یہ کہہ کر باہر چلے گئے اور چھوٹی بہو صاحب کے پاس مجمع ہو گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں کوئی منجو بی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ کسی نے علی مشکل کشا کا دونا مانا، کسی نے بی بی کی پڑیا۔ مغلانی گود پھیلا کر کہہ رہی تھیں اللہ پاک ہماری منجو بی کی ساتھ خیر کے گود بھرے۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ بڑی غریب نواز صاحبزادی ہیں۔" بی ماں منجو کی ظلمن ساس کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ اور چھوٹی بہو صاحب کا غصہ تو ویسے ہی ناک پر رکھا رہتا تھا، اس وقت چہیتی بیٹی کے ماندے ہونے کی خبر ملی تو ان کے مزاج کا پارا پوری ڈگری پر پہنچ گیا۔ میدہ اور شہاب رنگ غصے اور رنج کی ملی جلی کیفیت کے باعث بالکل گلابی ہو رہا تھا۔ پھول سے عارض تمتمائے تھے خدا خدا کر کے شادی کے تین سال بعد ہزاروں منتوں مرادوں اور آرزوؤں سے

منجو بی کے یہاں خوشی کی امید ہوئی تھی۔ اور ابھی چھٹا مہینہ ان کو لگا تھا بلقیس بھی وہ ماں کی طرح نازک اندام۔ سخت گرمی پڑتے ہی بیمار ہو گئیں۔ ساس یہ سمجھ رہی تھیں کہ نئی نویلی دلہن شہر کی ہے، اس لئے ناز کرتی ہے، اور ہم دیہاتی عورتوں سے اپنے کو بہتر سمجھتی ہے۔ ورنہ ایام حمل میں ہر عورت کی طبیعت ہی معمولی طور پر کسل مند تو رہتی ہی ہے۔

لیکن جب منجو کی طبیعت دن بدن نڈھال ہوتی گئی تو ان کے دولھا کوٹھی کا انتظام کرنے کے لئے کشمیر سدھارے۔ میاں کے جانے کے چار دن بعد منجو کی طبیعت یکایک بہت بگڑ گئی۔ اسقاطِ حمل کے آثار شروع ہو گئے تو اس نے گھبرا کر باپ کو تار دلوا دیا۔

کھانے کا دسترخوان بچھا تو بھلا چھوٹی بہو صاحب سے تو اس پریشانی میں کیا کھایا جاتا۔ وہم کے مارے دسترخوان پر بیٹھ گئیں۔ اور کسی نے بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد چھوٹی بہو صاحب کا سامان بندھنا شروع ہوا اور چیخ و پکار مچتی رہی، بیچاری چھمو ایک تو بہن کی بیماری سے پریشان تھی دوسرے ماں نے بوکھلا دیا تھا۔ گرمی الگ اوسان باختہ کئے دیتی تھی، چھوٹی بہو صاحب حسبِ عادت تمام الم غلم سامان لے جا رہی تھیں اور چھمو جز بز ہو رہی تھی۔ غرضیکہ لیلیٰ اور عنبر کی مدد سے خدا خدا کر کے شام تک ماں کا سامان اس نے بندھوایا۔ ساتھ جانے والیوں نے بھی گٹھڑی بقچی سنبھالی، ناشتہ بھی پک کر تیار ہو گیا۔

منجھلی بہو صاحب ایک ہفتے سے مہاراج کی سالگرہ میں شرکت کرنے کے لئے میاں کے ساتھ جودھپور گئی ہوئی تھیں۔ قیصر دلہن بیمار بنو بی کو لے کر بمع انجو عطن کے پندرہ دن ہوئے دلی آئی تھیں۔ بیچاری بنو کی صحت کمسنی کی شادی اور بھری جوانی کی بیوگی نے بالکل تباہ کر دی تھی۔ کبھی اس کو

اختلاجِ قلب کی شکایت ہوتی کبھی دورانِ سر۔

رات کے آٹھ بجے کہاروں نے بسم اللہ کہہ کر پالکی ڈیوڑھی کے اندر لگادی۔ چھوٹی بہو صاحب ساس اور بڑی جیٹھانی کے گلے لگ کر اور سب سے مل کر، آبدیدہ ماماؤں مغلانیوں کے حلقے میں امام ضامنوں سے لدی ہوئی اللہ رسول کا نام لیتی منجو بی کی جان کی خیر مناتی پالکی میں بیٹھیں۔ مانی اور موتی دائی عنبر سامان کے ساتھ دو دو غر جی کے ہمراہ اسٹیشن چلی گئی تھیں۔ ایک خدمتگار پالکی کے ساتھ بھاگتا ہوا چلا۔ جنرل صاحب بمعہ اپنے اسٹاف کے فٹن میں روانہ ہوئے۔ اس قافلے کے جانے سے رنگ محل میں سناٹا ہو گیا کیونکہ سب بیویاں پریشان تھیں۔ اس لئے نوکر چاکر بھی چپ چاپ اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ لڑکیاں بھی کونوں میں دبکی آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتیں۔ سکندر زمانی بیگم بہو کے جانے کے بعد ان کی صحنچی میں آگئی تھیں اور ہر وقت چھمو کو نگاہوں میں رکھتیں۔ بڑی بہو صاحب فکر مند تھیں اس لئے نہ مصاحب لاڈو جان سے انھوں نے گانا سنا نہ مغلانی شمسی خانم کو کوئی نئی ٹھکن بتلائی۔ بس خاموش بیٹھی چھالیاں کترتی رہتیں۔ یا پھر اگر بہت دل گھبر آتا تو قصۂ اگر گل کی ورق گردانی کرنے لگتیں۔

چار روز بعد جنرل صاحب کا تار آگیا۔ منجو بی کا حمل اسقاط ہو گیا تھا مگر طبیعت ان کی اب ٹھیک تھی اور چھوٹی بہو صاحب نے ساس کو لکھا تھا کہ دو ہفتے بعد میں منجو کو لے کر کشمیر جاؤں گی۔ چھوٹی بہو صاحب کا خط آنے کے بعد رنگ محل کی چہل پہل اپنے معمول پر آگئی۔ لاڈو جان کے گانے کی آواز پھر گونجنے لگی۔ لڑکیوں کی چہلیں بھی شروع ہو گئیں۔ تاش پچیسی کی بازیاں بھی جمنے لگیں۔ اور بیت بازی کا پروگرام بھی ہونے لگا۔

شاید مرزا علیگڈھ کالج سے میعادی بخار میں مبتلا ہو کر آئے تھے بخار تو

اُن کا بخار تھے دن اُتر گیا تھا لیکن کمزور کافی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ بڑے محل میں نہیں رہتے تھے لیکن جب کوئی بیمار ہو جاتا تو تیمار داری کے لئے سکندر زمانی بیگم اس کو اندر ہی رکھتی تھیں۔ شاپور مرزا بھی کسل مند تھے اس لئے ان دونوں محل ہی میں تھے۔ جنرل صاحب کے چھوٹے صاحبزادے اختر میاں عرف چھٹن صاحب بھی گرمیوں کی تعطیل میں آئے ہوئے تھے، شاپور کے دونوں چچازاد بھائی شہاب اور نجمی بھی روزانہ شام کو آجاتے۔ پھر سب لڑکے لڑکیاں مل کر رات گئے تک کھیلتے رہتے یا باتیں کرتے۔ شاپور کی طبیعت ان سب کی وجہ سے بہلی رہتی تھی۔ انجو اور چھمو قیصر دلہن کی نکتہ چینی کی عادت سے واقف تھیں اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں۔ بڑی بہو صاحب بھی کچھ کم وہمی نہ تھیں۔ لڑکیوں لڑکوں کو ہنستے بولتے دیکھ کر ان کو اپنے خاندان کی ناک خطرے میں نظر آتی تھی۔ اس لئے جہاں شام کو یہ سب جمع ہوئے اور انھوں نے اپنی مغلانی شمسی خانم کو اشارہ کیا۔ مغلانی جی تسبیح ہاتھ میں لے کر ان سب کی حرکات کی نگرانی کرنے اس طرح آ بیٹھتیں جیسے سی آئی ڈی کا کوئی بڑا ذمہ دار افسر کسی مشتبہ گروہ پر نظر رکھتا ہے۔ مگر یہ سب بھی غضب کے چلتے ہوئے تھے۔ جہاں وہ آکر بیٹھیں، انھوں نے خواہ مخواہ ان کو جلانے کے لئے انگریزی اور فارسی میں باتیں کرکے اور تالیاں بجا بجا کر بلا وجہ ہنسنا شروع کر دیا۔ مغلانی بے چاری بظاہر تو خاموش بیٹھی تسبیح ہلاتی رہتی تھیں لیکن دل ہی دل میں ان شریروں کی اس بے موقعہ ہنسی اور باتوں پر کھولتی رہتیں۔

چھمو سب میں شوخ، تیز اور اس شیطانی گروہ کی سرغنہ تھی۔ اس نے ایک شام تجویز پیش کی۔ "ساتھیو، آج کل شرارت کے لئے فضا بہت سازگار ہے۔"

شاپور نے تائید کی اور پوری قوم نے ریزولیوشن پاس کر دیا۔ دوسرے دن شام کو دونوں وقت ملتے سکندر زمانی بیگم مغرب کی نماز کے لئے وضو کر رہی تھیں اور بڑی بہو صاحب نیچے چوکوں پر بیٹھی اپنی بالیوں میں پھول بھر رہی تھیں۔ قیصر دلہن چبوترے پر چہل قدمی کر رہی تھیں اور دزدیدہ نظروں سے ان لوگوں کو بھی دیکھتی جاتیں جو تیجیپی کھیلنے میں بہت منہمک تھے کہ ایک کالے رنگ کی مٹی کی ہنڈیا چبوترے کے سامنے والی سیڑھی پر گری اور لڑھکتی ہوئی آخری سیڑھی پر جا کر پھوٹ گئی۔ بیگم صاحب نے گھبرا کر کہا "الٰہی خیر! اے بوا دیکھنا کیا گرا؟" ـــــ

ان کی آواز کے ساتھ کہانی سنانے والی عزیز خانم مودی خانے والی غفورن بوا، بی کھولی تینوں لپک کر آئیں اور ان سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔ "اے ہے، بیوی! جادو کی ہنڈیا"

جادو کی ہنڈیا کا نام سن کر سب بیگموں کا رنگ فق ہو گیا۔ سکندر زمانی بیگم نے حکم دیا "کوئی اس کے قریب نہ جائے اور ڈیوڑھی پر کہو، بہو مہترانی کو جلدی دربان بلا لائے۔"

ہر عورت کے دل میں خیال تھا کسی میرے دشمن نے مجھ پر جادو کیا ہے، سب کے دل دھڑک رہے تھے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے اور چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ کوئی بیوی سورۂ جن پڑھ رہی تھی کوئی نادِ علی۔ مامائیں مغلانیاں اس ناشدنی کمبخت کو کوس رہی تھیں۔ جس نے بھرے گھر پر یہ ہنڈیا پھنکوائی تھی سب کے مل کر بولنے سے ہر طرف چاؤں چاؤں مچی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کی نہ سنتا تھا سب اپنی اپنی کہہ رہی تھیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ سب رومال منھ میں ٹھونسے اوندھے پڑے ہنس رہے تھے۔ ایک چھوٹی تھی جس کے

مُنھ پر مسکراہٹ تک نہ تھی اور وہ بگڑ بگڑ کر ان سب سے کہہ رہی تھی۔ "اے ناسمجھو، اتنا تو نہ ہنسو، کہیں بھانڈہ نہ پھوٹ جائے۔" اور جیٹھن صاحب جن سے یہ ہنڈیا چھٹّو نے پھنکوائی تھی بھولا بھالا مُنھ بنائے مزے سے اپنی دادی اماں کے پاس تخت پر پاؤں لٹکائے آسمان کی طرف نظریں جمائے اُڑنے والی پتنگوں کو دیکھ رہے تھے اور اس سارے ہنگامے سے بے نیاز تھے

کون خیال کر سکتا تھا کہ یہ دس سال کا معصوم بچّہ اتنی بڑی شرارت کر سکتا ہے۔

بھو مہترانی لہنگا پھڑکاتی آموجود ہوئی بیگم صاحب نے کہا۔ "اری بھو! یہ ہنڈیا معلوم ہوتا ہے کسی نے کسی پر ٹونا کر کے بھیجی ہے اس کو اُٹھا کر لیجا، اور پوچھ کیا بات ہے؟"

وہ مٹک کر بولی۔ "نہ بیگم صاحب۔ میری توہری بھری کوکھ ہے، نوج اس کو اُٹھاؤں، نہ جانے کس موئے نے یہ جادو ٹونا کیا ہے۔ ابھی اپنے سمدھی کو بلائے لاتی ہوں وہ اس کا گن وان ہے۔ سب جانے ہے، یہ کہہ کر وہ لپکا کر وہ گئی اور تھوڑی دیر بعد سمدھی کو لے کر آ گئی۔ بیگمات پردے میں ہو گئیں اس نے ٹوٹی ہنڈیا کے پاس بیٹھ کر مُنھ ہی مُنھ میں کچھ بڑبڑا کر ہنڈیا کے ٹکڑوں کو اور ان چیزوں کو جو اس میں سے نکلی تھیں اُٹھا کر سونگھا اور پھر کہا۔ "بیگم صاحب سے کہدو، یہ ہنڈیا کہیں اور جاتی تھی پر ڈھنت ٹھیک نہیں ہوئی۔ اس لئے بیچ میں گر گئی۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہاں گرنے کا کچھ اثر ضرور ہوتا، مگر اب میں منتر پڑھ کر پانی چھڑک دیتا ہوں، کچھ نہ ہوگا۔ ہاں تین دن اس جگہ کو کوئی لانگے نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور خدا جانے آدھ گھنٹے تک کیا اڑنگ بڑنگ کرتا رہا۔ پھر پانی چھڑک کر ٹوٹی ہنڈیا اور اس کی سب سیندور کلیجی وغیرہ

اپنی جھولی میں ڈال لیں۔ بیگم صاحب نے پانچ روپے دیکر اس کو رخصت کیا۔

ان سیڑھیوں سے دنوں تک کوئی نہ اترا۔ آنے جانے والیاں بھی بچ کر چلتیں۔ ہر ایک آنے والی کو یہ قصہ پوری تفصیل سے سنا دیا جاتا تھا۔ بڑی بہو صاحب نے چھوٹی دیورانی کو بھی کشمیر یہ واقعہ لکھ بھیجا، انھوں نے وہیں سے چھمّو کو تاکید لکھی کہ اپنے اور چھبن پر سے صدقہ اتروا دو۔ اس کے لئے جو پانچ روپے داروغہ جی نے چھمّو بی کو بھیجے اس کی مٹھائی منگا کر اپنے سب ہجولیوں کے ساتھ اس شریہ نے ہنس ہنس کر کھائی۔ اور اپنی اس دلچسپ شرارت پر اپنی پارٹی کے ساتھ بہت دن تک قہقہے لگاتی رہی۔

بڑی بہو صاحب لڑکیوں اور لڑکوں کو اس طرح ایک ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھ کر بہت جز بز ہوتی تھیں۔ ان کی وہمی طبیعت اس میل جول کا عجیب ہولناک نقشہ ان کے سامنے کھینچ دیتی تھی۔ اپنی دونوں دیورانیوں پر انھیں بہت غصہ آتا تھا۔ ایک دونوں نواسیوں کو چھوڑ کر جہ دھپور جا بیٹھی تھیں۔ دوسری الھڑ لڑکی کی جانب سے بے فکر ہو کر کشمیر کی سیر کر رہی ہیں اور جب بھی وہ ان کو آنے کی تاکید لکھتیں وہ اطمینان سے جواب دیتیں "آپ سے تو ہمارے بچے ہم سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ آپ وہاں ہیں تو ہمیں لڑکیوں کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بڑی بہو صاحب ان دونوں کی بے جا سعادت مندی پر منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ جاتیں۔ آخر ان کا دل نہ مانا انھوں نے سہاس سے کہا، "ممانی جان مجھے شہاب اور نجمی کا روزانہ شام کو آنا اچھا نہیں لگتا۔ انجم، عظمیٰ اور چھمّو تینوں ان کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلف ہنسی مذاق کرتی ہیں۔ خدانا کردہ شیطان کے کان بہرے اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو منجھلی اور چھوٹی میری جان کو آئیں گی۔ آپ تو نماز وظیفے میں لگی رہتی ہیں؟

بیگم صاحب بڑی بردبار اور جہاں دیدہ بیوی تھیں مسکرا کر بولیں۔ "اے ہے آفتاب دلہن تم بھی کمال کرتی ہو، شہاب اور نجمی بھی تو فرخ سیر کے پوتے ہیں کیسے آنے کو منع کر دوں۔ بھانجہ کیا کہے گا اور ایسے کون سے جوان ہیں ان کی ماں کا ہاڑ اچھا تھا اور شہباز مرزا بھی اپنے بھائیوں میں سب سے لمبے اور صحت مند ہیں اس لئے ان دونوں نے بھی قد نکال لئے ہیں۔ نجمی کی تو ابھی مسیں ہی بھیگ رہی ہیں بالکل بچہ ہے۔ لڑکیوں میں انجو ہی سب میں بڑی ہے۔ اس کی تو منگنی ہو چکی ہے پھر اللہ رکھے ڈر کاہے کا ہے۔ چھمّو بیشک شوخ اور کھلنڈری ہے لیکن ہے ویسے بالکل بھولی بھالی۔ عظمیٰ اور ستارہ تو اس سے بھی چھوٹی ہیں۔ یہ عمریں ہوتی ہی ہیں ہنسنے بولنے کھیلنے کودنے کی۔ سب برابر کے ہیں۔ ساتھ بیٹھ کر ان سب کا وقت اچھا گزر جاتا ہے اور شاپور کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ میرے تمہارے سامنے بیٹھ کر کھیلتے اور باتیں کرتے ہیں۔ کوئی بات بیجا دیکھوں تو میں منع بھی کر دوں، بے جا روک ٹوک سے بھی بچوں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔"

بڑی بہو صاحب نے ساس کی معقول بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا اپنے طور پر لڑکے لڑکیوں پر زیادہ تنبیہہ کرنے لگیں۔ ایک گرم شام کو جب ہوا بالکل بند تھی۔ یہ سب گھبرا کر محل کی چھت پر چلے گئے۔ بڑی بہو صاحب نے مغرب کی نماز ختم کی تو مغلانی شمسی خانم نے ان کو رپورٹ سنائی۔ "لو بی بی اب میں کیا کروں؟ میں نے تو فرضوں کی نیت باندھی، چھمّو بی سب کو لیکر کوٹھے پر چلی گئیں۔ بڑی بہو صاحب نے جوں توں کر کے تسبیح پوری کی، جلدی سے دعا مانگ کر کوٹھے پر گئیں۔ انجو اور عظمیٰ مہتابی پہ بیٹھی تھیں۔ شہاب کسی انگریزی فلم کی کہانی سنا رہا تھا۔ شاپور اور نجمی بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ یہ سب کہانی کی

دلچسپی میں اس قدر گم تھے کہ بڑی بہو صاحب سر پر پہنچ گئیں ان کو خبر نہ ہوئی۔ سب سے پہلے چھمو نے ہی ان کو دیکھا اور چہک کر بولی۔ "چچی اماں! اچھا ہوا کہ آپ بھی اوپر آگئیں نیچے تو بلا کا حبس ہو رہا ہے۔ یہاں تو کچھ ہوا ہے اور چاندنی بھی۔"

بڑی بہو صاحب نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "مجھے یوں تم سب کا کوٹھے پر آنا اچھا نہیں معلوم ہوا، اور شاپور تم تو ابھی کمزور ہو اتنی سیڑھیاں چڑھنی تم کو نہیں چاہیے تھیں۔ پرسوں ہی تم کو غسل کے بعد حرارت ہو گئی تھی۔ انجو تم ماشاءاللہ سمجھدار ہو، تم کو یہ خیال چاہیے تھا کہ اوپر آنا ٹھیک نہیں، کنواری لڑکیوں کو اونچ نیچ کا خیال رکھنا چاہیے۔ شام کے وقت اکثر مرد اپنے کوٹھوں پر آجاتے ہیں۔ کسی کی نظر پڑ جائے تم سب پر تو کیسی بری بات ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔"

انجو نے تو جواب نہیں دیا چنچل چھمو پھر بولی۔ "واہ، چچی اماں! یہاں سامنا کہاں کا، کس گھر کا ہو سکتا ہے۔ چاروں طرف جالیاں لگی ہوئی ہیں اور سب سے اونچا ہمارا ہی محل ہے۔ مغرب کے بعد تو اندھیرا ہو جاتا ہے، چاندنی کی ہلکی سی روشنی ہے، نیچے اس وقت بالکل گھٹ تھا۔ اس لئے ہم لوگ یہاں آگئے۔"

بڑی بہو صاحب نے تیز لہجے میں کہا۔ "چھمو تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ جب تمہاری ماں آجائے گی شوق سے روز شام کو کوٹھے کی سیر کیا کرنا۔ اب تو نیچے چلو۔"

بادلِ ناخواستہ سب کو بڑی بہو صاحب کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ ان پابندیوں کا سب سے زیادہ اثر چھمو لیتی تھی۔ کیونکہ فطری طور پر اس کی طبیعت آزاد تھی، وہ آزادی سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسنا بولنا اور سبزہ زار و سیر گاہوں میں گھومنا چاہتی تھی۔ کھلتے ہوئے پھولوں اور جھومتے ہوئے درختوں

کو دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس بند فضا میں بیچاری گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی اور حیدرآباد جانے کے دن گننے لگتی۔ جہاں نسبتاً اس کو آزادی میسّر تھی۔

---

(۱۴)

اپریل کا مہینہ شروع ہو گیا تھا مگر دلّی کا موسم ابھی تک اچھا تھا صبح خوش گوار ہوتی تھی اور راتیں کیف انگیز۔ شاہ رخ مرزا پھول پور کے نوعمر نوخیز نواب انٹرنس کا امتحان دے کر دلّی آ گئے تھے، ایک موٹر تو ہمیشہ ہی پھول پور ہاؤس میں رہتی تھی۔ نواب نے دلّی پہنچتے ہی اپنی پیکارڈ بھی منگا لی

شہاب ان کا ہمسن اور چچا زاد بھائی تھا۔ اس لئے دونوں کی بہت دوستی تھی۔ جب تک نواب دلّی رہتے شہاب ہر وقت ہی ان کے ساتھ بھی رہتا تھا۔ ٹھیرے تو شاہ رخ مرزا پھول پور ہاؤس میں تھے، لیکن بہنوں کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت رنگ محل ہی میں گزرتا تھا۔

بنّو بی کچھ دن سے پھر بیمار تھیں، قیصر دلہن اور بنّو بی پھول پور ہاؤس میں تھیں لیکن انجو عظمیٰ ستارہ منجھلی بہو صاحب کے پاس رنگ محل میں ہی ٹھیری تھیں انجو کا جہیز تیار کرانے میں منجھلی بہو صاحب ایک سال سے لگی ہوئی تھیں۔ دو دو مغلانیاں رات دن نئی نئی ٹکھن کے تلواں جوڑے تیار کرتی رہتی تھیں۔

منجھلی بہو صاحب اور بڑی بہو صاحب، دونوں بہت سگھڑ سلیقہ مند بیبیاں تھیں اور پھر سکندر زمانی بیگم کا تو کہنا ہی کیا، ان کے سلیقے کی تو تمام دلّی میں دھوم تھی۔

اس لئے انجو کا جہیز بہت معیاری تیار ہو رہا تھا۔ مگر شادی کی ابھی کوئی خبر نہ تھی، بڑے نواب صاحب سورج گڑھ والوں سے کچھ خوش نہیں تھے۔ دراصل ریاست کے خزانے میں ان کی شاہ خرچی کی بدولت روپیہ ہی اتنا نہیں تھا کہ انجو کی شادی شاہانہ شان سے کی جا سکتی۔ بڑے نواب صاحب نے مبارک محل سے جب سے نکاح کیا تھا نئی نویلی بیوی کی ناز برداریوں میں دل کھول کر روپیہ خرچ کر رہے تھے، نواب سورج گڑھ بھی کچھ بددل سے ہو رہے تھے، کیونکہ مرحوم نواب پھول پور کے سامنے ولی عہد کی سالگرہ اور عیدین کے موقع پر جو قیمتی تحائف بھیجے جاتے تھے وہ ان کی وفات کے بعد نہیں گئے۔

لیکن انجو بی اور نصرت علی خاں اب بھی برابر ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط بھیجتے رہتے اور پیار محبت کو استوار کرتے رہتے تھے۔

شاہرخ مرزا نواب ہو گئے تھے تو کیا۔ عمر تو ان کی ابھی پندرہ سال کی ہی تھی۔ دلی میں سیر گاہوں کی کمی نہیں۔ روزانہ شام کو اپنے سب ساتھیوں اور بہنوں کے ساتھ کبھی اوکھلے کی سیر کرتے کبھی قطب جاتے کبھی حوض خاص اور کبھی فیروز شاہ کے کوٹلے ۔۔ جب اس تفریح سے دل بھر گیا تو ان کو سینما کا خیال آیا۔ بولتی ہوئی تصاویر کچھ مہینوں سے ہی شروع ہوئی تھیں۔ بیلے انجلی کی ان دنوں دلی میں دھوم تھی۔ خیر لڑکے تو سینما چلے ہی جاتے تھے، لیکن رنگ محل کی لڑکیوں کے لئے بھلا یہ کب ممکن تھا کہ وہ فلم دیکھ سکیں۔ منجو بی نے کنوارپنے میں سینما دیکھنے کے لئے باپ سے ضد کی۔ جنرل صاحب کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ ان کی بیٹی سینما دیکھنے کے لئے جائے لیکن لاڈلی بیٹی کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ کافی روپیہ صرف کر کے انھوں نے رنگ محل میں ہی ایک اشتہاری انگریزی فلم کا انتظام کیا۔ کچھ تو جب صرف تین سال کی تھی جب فلم کے پردے پر چند صحت مند

بچوں کو دکھایا گیا تو چھمّو نے ان بچوں کو لینے کی بہت ضد کی تھی۔ لیکن بھلا یہ بچے چھمّو کو کیسے مل سکتے تھے۔ تصویر ختم ہوتے ہی چھمّو بچے کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتی رہی اور روتے روتے ہی رات کا کھانا بغیر کھائے سو گئی۔

شاہرخ مرزا کا دل چاہتا تھا کہ لڑکیاں بھی فلم دیکھیں، چھمّو کو اُردو کی بولتی تصویر دیکھنے کا سب سے زیادہ شوق ہو رہا تھا۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہو؟ اس لئے کئی دن تک یہ سب سر جوڑ کر غور کرتے رہے، آخر طے یہ پایا کہ چھمّو پہلے بڑی بہو صاحب کو رضامند کرے وہ سب سے زیادہ اس کی مخالف تھیں۔ لڑکیوں کا کہیں آنا جانا ان کو بالکل پسند نہیں تھا، ان کا مقولہ تھا " اوئی نوج ہمارے گھر کی لڑکیاں بھی اور اہلِ شہر کی طرح آئیں جائیں، نہ بُوا، مجھے یہ لڑکیوں کا مارے مارے پھرنا بالکل پسند نہیں، لڑکیاں گھر سے نکلیں اور ان کا دیدہ ہوائی ہوا، اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ اور دیکھو شیر کی نگاہ۔" ان کی دونوں دیورانیاں جیٹھانی کے کہنے پر صدقِ دل سے عمل کرتی تھیں۔

ویسے تو بڑی بہو صاحب کی ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھ سکتی تھی، مگر چھمّو ان کی بہت لاڈلی تھی۔ جس بات پر اڑ جاتی وہ ان سے کرا لیتی رہتی بھی وہ سب لڑکیوں میں تیز۔

انھوں نے ظہر کی نماز پڑھ کے پان کھانے کے لئے پٹاری کھولی ہی تھی کہ چھمّو ان کے گلے میں آ کر لٹک گئی، اور وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں " اے ہے، چھمّو! اب تو تم اللہ رکھے سیانی ہوتی جا رہی ہو، مگر حرکتیں وہی بچپن کی سی ہیں، انسانیت سیکھو، یہ کیا کہ گلے میں جھول گئیں۔"

چھمّو ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر دراز ہو گئی اور ننّھے بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔ " آں آں ہم تو سینما دیکھیں گے۔"

بڑی بہو صاحب نے مسکرا کر کہا۔ " وہ کیا چیز ہے اور کہاں ہے بو میں تم کو

دکھاؤں۔"

چھمّو نے بھولا مُنھ بنا کر کہا۔ "وہ جو بائیسکوپ ہوتا ہے، نا۔ اس کو ہی سنیما کہتے ہیں۔"

بڑی بہو صاحب بگڑ کر بولیں۔ "لو اور سُنو، بھلا اب تم کوئی بچہ ہو، جو تمہاری ہر ضد پوری کی جائے۔ ہمارے یہاں کی لڑکیوں نے یہ نگوڑے بازاری تماشے کبھی نہیں دیکھے۔"

ڈھیٹ چھمّو پر بڑی بہو صاحب کی خفگی کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا اور اس نے تیوری پر بل ڈال کے کہا۔ "پہلے یہ کھیل تماشے ہوتے ہی کب تھے جو لڑکیاں دیکھتیں۔ اور شاہرخ کہتے ہیں وہاں تو پردے کا پورا انتظام ہوگا۔ پھر کھیل دیکھنے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

بڑی بہو صاحب چھمّو کو تیز نظروں سے دیکھ کر بولیں۔ "تو یوں کہو، کہ تم سب اپنے بھجیوں کی وکیل بن کر مجھ سے بحث کرنے آئی ہو۔"

چھمّو نے دونوں ہاتھ بڑی بہو صاحب کے گلے میں ڈال کر لاڈ سے کہا —

"اچھی میری چچی اماں! ہم سب یہ تماشا دیکھنا ضرور چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں دکھا لائیں، سُنا ہے، اس میں بہت اچھے ناچ اور گانے ہیں۔"

بڑی بہو صاحب نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں بڑھاپے میں کیا دیکھوں گی تماشے جوانی تو گھر میں ہی گزری، اب یہ نگوڑا زمانہ ایسا آگیا ہے کہ جو نہ ہو تھوڑا ہے تم اپنی ماں سے اجازت لو وہ کہیں تو شوق سے جاؤ، میں منع کرنے والی کون ہوتی ہوں؟"

چھمّو نے دیکھا یوں کام نہ چلے گا، ٹھنکنا شروع کر دیا۔ "ہم تو سنیما ضرور دیکھیں گے اور آپ کو ہمیں دکھانا ہوگا۔"

بڑی بہو صاحب کے غصّے سے سارا گھر ڈرتا تھا ، مگر چھمّو کے لاڈ کر کے انھوں نے اس کو ایسا سر پر چڑھا لیا تھا کہ اس کی ضدیں اُن کو پوری کرنی پڑتی تھیں ، وہ چاہے جتنا بھی نصیحت کرتیں غصّہ دکھاتیں مگر یہ ڈھیٹ لڑکی اپنی بات منوا کر چھوڑتی تھی ۔ اس وقت بھی وہ برابر رٹ لگائے گئی تو بڑی بہو صاحب نے تنگ آکر کہہ دیا ۔ " اوئی چھمّو حد ہو گئی ۔ تم تو بالکل میری جان کو آگئیں جاؤ ، میرا سر نہ کھاؤ ، اچھا دیکھا جائے گا ۔ "

چھمّو نے جھٹ اُچک کر ان کو پیار کیا اور ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجاتی اُچھلتی ہوئی چلی گئی ۔ بڑی بہو صاحب نے اس کے چلے جانے کے بعد ہنس کر اپنی مصاحب لاڈو جان سے کہا ۔ " بڑی شوخ ہے یہ لڑکی بھی ۔ لے بُوا ! یہ بائیسکوپ کیا تماشا نکلا ہے ، جس کو دیکھو اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے ۔ اب بھلا ہمارے یہاں کی لڑکیوں نے کبھی بازاری تماشے دیکھے ہیں ۔ چھمّو کو تو جس بات کی لت لگ جاتی ہے پیچھا پکڑ لیتی ہے بڑی ضدن ہے ۔

لاڈو جان سر دتا گھما کر بولیں ۔ " بیوی میری ! اس میں ہرج ہی کیا ہے ، آج کل تو سب اچھے اچھے گھرانے کی بہو بیٹیاں تماشا دیکھنے جاتی ہیں ، وہ سڑک والے جج صاحب ہیں نا ۔ ان کی بیوی بھی اپنی لڑکیوں کو لے کر یہ کھیل دیکھنے گئی تھیں مجھے بھی بہت کہہ سن کر لے گئیں ۔ جہاں بیٹھی تھیں وہاں پورا پردہ تھا ۔ کیا مجال کہ پرندہ بھی پر مار سکے ۔ آپ بھی اسی طرح پردہ کرا کر چھمّو بی کو لے کر جائیے ، ان کی خوشی پوری ہو جائے گی ۔ "

بڑی بہو صاحب نے گلوری منہ میں رکھ کر کہا ۔ " بوا دیکھے چھمّو کی خوشی تو پوری کرنی ہی پڑے گی ، اب دیکھو ، چھوٹی دلہن سے ذکر کروں گی ۔ "

لاڈو جان نے کہا ، اے بھلا ! وہ آپ کے سامنے کیا بولیں گی ، سچ تو یہ ہے

کہ گانے اس کے اتنے اچھے ہیں کہ مجھ بڑھیا کا بھی دوبارہ سننے کو جی چاہتا ہے، لوکا گلا پایا ہے اس نگوڑی نے، جو لیسے لبی ہوئی ہے۔ یہ موئی ڈومنیاں آج کل کی تو خاک گانا نہیں جانتیں، یونہی بھائیں بھائیں کرتی رہتی ہیں۔"

بڑی بہو صاحب: "اے لاڈو جان اس گوہر کی ماں بدرن تو ایسا اچھا گاتی تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو اور کہرا تو بہت اچھا ناچتی تھی۔ گوہر نگوڑی کی تو صحت زیادہ بچے ہونے سے بگڑ گئی، آواز نہیں نکلتی، بدرن تو سنا ابھی مری ہے، تم نے بھی اس کا گانا سنا تھا۔ مگر بدرن کی ساس بسم اللہ تو ایسے غضب کی گٹکری لیتی تھی کہ مرد بھی عش عش کرتے تھے۔ بچپن کے ہونے پہ آئی تو بڑھی پھوس ہو گئی تھی۔ مگر جب تان لیتی تو دل کھنچتا تھا۔ منجھلے میاں کی شادی میں ڈومنیوں کے چار طائفے تھے۔ اور ان میں ایک سے ایک اچھی گانے والی تھی۔ اندھی وزیرن کا تو قبلے سے تعلق تھا۔ شاہی ڈومنی دلدار جان کی پوتی تھی عام طور سے شہر میں کہیں بھی نہیں جاتی تھی۔ ممانی جان سے شہزادی منیرا بیگم کا بہناپا ہے وہی اس کو لے کر آتی تھیں۔ میں نے مور چھنا اس کے گلے سے نکلتے دیکھا۔ ایک ٹھمری کا نرت جو اس نے کرنا شروع کیا تو دو گھنٹے لگا دئیے، جہاں پناہ کی غزلیں جب وہ گاتی تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ ہوئی جو غدر پہ جہاں پناہ نے لکھی تھی، اس سے سن کر سب کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں، اب نہ وہ گانے والیاں رہیں نہ گانا سننے والے رہے، دلّی کی رونق تو ساری ان موئے فرنگیوں نے لوٹ لی۔"

مصاحب لاڈو جان ٹھنڈا سانس لے کر۔ "اے ہاں بیوی وہ تو ٹھیک ہے پر اب ان بچوں کو کیا معلوم؟ کہ بادشاہی زمانے میں کیا ہوتا تھا، اب تو دلّی اجڑا دیار ہے۔ نہ اب وہ بسنت کی بہار رہی نہ پھول والوں کی سیر

کی رونق۔ یہی گھوڑے کھیل تماشے دیکھ کر آج کل کے لوگ دل بہلا لیتے ہیں' اب تو حکومت سوداگروں کی ہے۔ ویسا ہی زمانہ ہے۔"

بڑی بہو صاحب۔ "ہاں' بوا۔ کہتی تو ٹھیک ہو اور چھمّو کی خاطر مجھے بائیسکوپ جانا ہی ہوگا ورنہ وہ رو رو کر اپنے کو ہلکان کر لے گی اور مجھے دم لینا دوبھر کر دیگی۔"

لاڈو جان۔ "تو آپ چھوٹی بہو صاحب سے ابھی کیوں نہ پوچھ لیں۔ وہ بھلا کیا آپ کے سامنے بول سکتی ہیں۔"

بڑی بہو صاحب "ہاں' بوا! یہ تو میں جانتی ہوں کہ میری دونوں دیورانیاں میرا بڑا لحاظ کرتی ہیں۔ اللہ ان کو بچوں کی بہاریں دکھائے۔ میرے سامنے تو منجھلی بولے نہ چھوٹی، بہنیں بھی قربان کی تھیں' ایسی ہیں یہ دونوں۔ مگر بوا پھر بھی تو وہ ماں ہیں۔ پوچھ لینا چاہیئے۔ تم شمسی خانم کو بلاؤ، میں انجو کے دوپٹے پہ نئی وضع ڈال دوں۔

لاڈو جان نے گل چمن لونڈی کو آواز دے کر کہا۔ "بوا مغلانی کو بھیجدے۔"

بی مغلانی بقچی سنبھالے آگئیں۔ بڑی بہو صاحب نے قرمزی رنگ کی جالی کے دوپٹے پر سنہرے روپہلے کچے گوکھرو کو ملا کر گنگا جمنی ہزار گلے کا نمونہ ڈال کر گھڑی جو دیکھی تو پانچ بج چکے تھے۔ جلدی سے کلّی کر عصر کی نماز پڑھی۔ اور پھر ٹہلتی ہوئی چھوٹی بہو صاحب کے پاس پہنچیں۔ وہ نماز تو پڑھ چکی تھیں، مگر وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ جیٹھانی کو آتا دیکھ کر اپنی مغلانی کو اشارہ کیا۔ انھوں نے سینا چھوڑ پان بنا خاصدان ان کے سامنے رکھا۔ چھوٹی بہو صاحب نے جلدی جلدی تسبیح ختم کی، دعا مانگ کر جانماز طے کرتے ہوئے بولیں۔ "میں تو نماز پڑھ کر آپ کے پاس آنے والی ہی تھی۔ اچھا ہوا آپ آگئیں۔ لانا مغلانی وہ بار بیٹ کے تھان' جو صبح بدھ جی جنگلی مل کے یہاں سے لائے ہیں۔

بڑی بہو صاحب ۔" اے وہ تو خیر، دیکھ لوں گی، میں تو تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ چھمو کو وہ نگوڑے بائیسکوپ دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔ شاہرخ نے اس کو یہ لت لگا دی ہے اور وہ میری جان کھا رہی ہے کہ آپ چل کر ہمیں تماشا دکھالائیں۔"

چھوٹی بہو صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا " بھابی بیگم آپ نے اس ڈھیٹ لڑکی کو بہت سر چڑھا لیا ہے۔ مجھ سے تو کچھ کہتی نہیں، آپ کو ہر وقت ستاتی رہتی ہے، آپ بھی اگر ذرا گھرک دیں تو اس کی اتنی ہمت نہ ہو، اس کے باپ کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ وہ ہرگز یہ پسند نہ کریں گے کہ چھمو بائیسکوپ دیکھنے کے لئے جائے۔"

بڑی بہو صاحب ۔" ہاں، جنرل یوں تو انگریزوں کے ساتھ رہتے ہیں لیکن ان کو پردے کا بہت خیال ہے، مگر چھمو ابھی ایسی کون سی بڑی ہے پھر میں جو ساتھ جاؤں گی، پردے کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر جانے میں کیا ہرج ہے۔"

چھوٹی بہو صاحب نے ہنس کر کہا " یہ تو مجھے معلوم ہے کہ چھمو کی خوشی کے لئے آپ سب کچھ گوارا کر لیں گی، جب ہی تو وہ آپ کو ستاتی ہے، آپ شوق سے جائیں اور اس کو لے جائیں۔ میں کیا آپ کے سامنے تو وہ بھی نہیں بول سکتے۔ بھلا آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ چھمو آپ کی ہی ہے اور وہ مجھے ماں سمجھتی ہی کب ہے۔ آپ سے ہی لاڈ پیار اس کے رہتے ہیں۔"

بڑی بہو صاحب (خوش ہو کر) " پھولو پھلو، صدو سی سال سہاگن رہو مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مگر دلہن تم بھی چلنا۔"

چھوٹی بہو صاحب ۔" آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر یہ حیدرآباد میں ہیں

ان کی اجازت بغیر کیسے جاؤں۔ ادھر بے بی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ اسے کو بار بار جاکر دیکھتی ہوں۔ میں پھر کبھی چلی جاؤں گی، آپ اور بھابی جان جائیں چھمّو اور چھیٹن کو لے جائیں۔"

پردے کی اوٹ سے لگی شریر چھمّو ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی، اجازت ملنے کی خوش خبری اس نے انجو کو جا سنائی۔ انجو بی نے کوکا کے ہاتھ پرچہ بھائی کو پھول پور ہاؤس اجازت ملنے کا بھیجدیا۔ وہاں کیا دیر تھی۔ انھوں نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا۔ دوسرے دن پہلے شو کے لئے پورا باکس ریزرو کروالیا گیا۔

لڑکیوں کو تماشا دیکھنے کی خوشی میں رات بھر نیند نہ آئی۔ کیسا ہوگا، کیا ہوگا یہ ہر ایک لڑکی سوچ رہی تھی۔ صبح ہی سے سب نے جانے کی تیاری شروع کردی بار بار گھنٹہ دیکھا جانے لگا۔ نگوڑی سوئیاں تھیں کہ سرکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں خدا خدا کرکے بارہ کی توپ چلی، خاصہ لگا، مگر ساری صاحبزادیوں کے پیٹ تو تماشا دیکھنے کی خوشی میں بھرے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی اُلٹے سیدھے دو چار نوالے مار کر سب نے کلّی کر گلوریاں منھ میں رکھیں اور لباس تبدیل کرنے لگیں چھمّو ابھی آرام سے لیٹی پڑھ رہی تھی۔ اس نے انجو عطن کو سنورتے دیکھ کر کہا، اے تم تو اس طرح سج رہی ہو گویا تم ہی اس فلم میں پارٹ کروگی۔"

انجو بُرا مان کر بولی۔ "اے نوج، ہم تماشے میں کیوں پارٹ کرنے لگے؟"

چھمّو مسکرا کر۔ "کیوں اس میں ہرج ہی کیا ہے، یہ بھی تو ایک فن ہے، البتہ اس ملک میں اس کی بھی دُرگت بن گئی ہے۔"

انجو۔ "خیر ہوگا کچھ ــــ اب تم اُٹھوگی بھی۔ یا پڑی باتیں ہی بناتی جاؤگی۔ اب تو دو بجنے والے ہیں۔"

چھمّو اُٹھتے ہوئے بولی۔ "اے بھائی! کپڑے تو میرے اچھے ہی ہیں صبح ہی

تو غسل کیا تھا۔ برقعہ تو پہننا ہوگا۔ وہاں کون سی ٹی پارٹی ہے جو لباس تبدیل کیا جائے۔"

ابھی یہ دونوں باتیں کر ہی رہی تھیں کہ نواب شاہرخ آگئے، اور چھمو اُن کے آتے ہی اپنی ڈیوٹی کے لئے تیار ہو گئی۔ بڑی بہو صاحب کو جا کر جگایا۔ وہ اُٹھیں ظہر کی نماز پڑھی، پان کھایا۔ چھمو نے ان کو برقعہ پہنایا۔ مصاحب، لاڈو جان نے پانوں کی ڈبیہ سنبھالی۔ منجھلی بہو صاحب پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں، وہ بھی ساتھ ہو لیں۔ بیگمات کے لئے نیلے ریشم کے پردے لگی کار، رنگ محل کے پھاٹک پر لگا دی گئی۔ نوکر چاکر اصطبل میں ہو گئے۔ اور یہ سب برقعوں میں لپٹی لپٹائی گاڑی میں جا بیٹھیں، نواب شاہرخ بمع شاپور، شہاب، نجمی، چھٹن کے چند منٹ پہلے روانہ ہو گئے تھے۔

سیکریٹری نے سینما ہال کے پچھلے دروازے پر بیگمات کو اتروایا۔

بڑی بہو صاحب کا ہاتھ شاپور مرزا نے پکڑا، چھمو ان کے ساتھ ساتھ چلی۔ باکس میں بارہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ آگے کی چھ کرسیوں پر لڑکے بیٹھ گئے۔ پچھلی کرسیوں پر بڑی بہو صاحب اس طرح بیٹھیں کہ ان کی ایک جانب منجھلی بہو صاحب تھیں دوسری جانب چھمو تھی۔ پھر انجو، ستارہ، عطن بیٹھی تھیں۔ مصاحب لاڈو جان کے لئے مونڈھا اور لا کر رکھا گیا۔

چند منٹ بعد تصویر شروع ہو گئی۔ بڑی بہو صاحب نے ایک اشتہار دیکھ کر جس کو ایک قدآور مرد دکھا رہا تھا۔ یہ کہہ کر منہ پر نقاب ڈال لی "اے خاک یہاں پردہ ہے، یہ موا دیدوں میں دیدے ڈالے ٹکر ٹکر گھور رہا ہے"

منجھلی بہو صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اے بھابی بیگم! یہ کوئی آدمی نہیں ہے، تصویر ہے، آپ منہ کھول لیں۔"

کہانی شروع ہو گئی۔ بڑی بہو صاحب حیران نظروں سے تھوڑی دیر تو چپکی بیٹھی دیکھتی رہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ سین آیا۔ مجنوں لیلےٰ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔

اور گلی کوچوں میں لیلیٰ لیلیٰ کہتا پھرنے لگا تو ان سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگیں: "بُوا! یہ موا اس نگوڑی لڑکی کے پیچھے خواہ مخواہ کیوں دیوانہ ہو گیا۔ ایسی تو خوبصورت بھی نہیں۔"

سب لڑکیاں لڑکے اس تنقید پر منہ چھپا کر ہنسنے لگے۔ چھمو نے ان کو پھر سمجھایا "یہ تو تصویر ہے۔"

بڑی بہو صاحب نے لیلیٰ کو مجنوں کے لئے روتے اور گاتے دیکھا تو پھر بگڑ کر بولیں: "لے لو، غضب خدا کا۔ اس نگوڑی کے دیدے کا پانی تو بالکل ڈھل گیا ہے۔ کیسی بے حیا ہے۔ ایک غیر مردوئے کے لئے رو رہی ہے۔ ادئی نوج! ایسی بے غیرت ہوائی دیدہ لڑکی کوئی ہو، نہ ماں باپ کی شرم، نہ زمانے کا لحاظ، نہ خدا کا ڈر۔"

چھمو پھر زچ ہو کر بولی "چچی اماں! یہ تو بہت پرانا قصہ ہے، اس کہانی کو فلمایا گیا ہے۔

لیکن اب بڑی بہو صاحب کا غصہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ اب بھلا وہ اس کی کب سنتی تھیں۔ انھوں نے اونچی آواز سے کہا "خدا کی مار ہو اس تماشے کے بنانے والے پر۔ ایسے تماشے دیکھ کر تو لڑکیوں کے دیدے پھٹ جاتے ہیں۔ نگوڑا کیا بائسکوپ ہے کھلم کھلا بے حیائی لڑکیوں کو سکھاتا ہے قیامت کا قرب ہے۔ نگوڑے یہ کھیل تماشے کہیں شریفوں کے دیکھنے کے ہیں توبہ! توبہ! میں کیوں آئی یہاں!"

سین آیا کہ مجنوں نے خانہ کعبہ میں بھی جا کر لیلیٰ کے ملنے کی دعا کی، اور اور بڑی بہو صاحب کو اس کی اس حرکت پر اتنا غصہ آیا کہ انھوں نے بلند آواز سے کہا: "خدا غارت کرے اس نامراد کو۔ اس کی بے حیائی تو دیکھو، خدا

کے گھر میں بھی جا کر اس کو وہ نگوڑی کلمو نہیں یاد رہی۔ اللہ کا نام نہ رسول کا نام بس لیلےٰ ہی لیلےٰ نگوڑا جپے جاتا ہے۔ اے ہے! یہ بھی کوئی کھیل ہے، دور دفعان۔"

چھمّو تو اب دم سادھے خاموش بیٹھی ان کی صلواتیں سُن رہی تھیں، جانتی تھی کہ اس وقت میں نے ہوں بھی کی تو یہ اور بھی بگڑ جائیں گی۔ اور سب لڑکیاں بھی دل ہی دل میں "جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کر رہی تھیں۔ لڑکے البتّہ رومال منھ پر رکھے، بڑی بہو صاحب کی کامنٹری پر برابر ہنس رہے تھے۔ چھمو کے ہاتھ کو انھوں نے اس طرح پکڑ رکھا تھا، گویا اِن کے ہاتھ چھوٹتے ہی وہ کہیں بھاگ جائے گی۔

جنّت میں لیلےٰ مجنوں کے ملنے کے سین کا آنا تھا کہ بڑی بہو صاحب یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں "اے بس! بجھلی! چلیو، قسم سے حد ہو گئی۔ بڑا کفر ہے، کمبخت دنیا میں ہی جنّت دوزخ بھی اب بننے لگے۔ نابوا، میں نے تو کان پکڑا آئندہ یہ موا جہنمی کھیل دیکھنے سے۔ نہ گانا ڈھنگ کا نہ کوئی اور بات۔ گناہ بے لذّت ہے۔"

بھلا ان کے اُٹھنے کے بعد کون بیٹھ سکتا تھا۔ سب لڑکیاں بادلِ ناخواستہ اُٹھیں۔ لڑکے البتّہ بیٹھے دیکھتے رہے۔ چھمو نے اس کو ہی غنیمت جانا کہ یہ آن تو ٹوٹی۔ اس کو پوری امید تھی کہ پھر جب وہ چاہے گی، بڑی بہو صاحب سے ضد کر کے رو دھو کر ان کو اپنے ساتھ لے آئے گی۔"

---

(۱۵)

انجو کی منگنی ہوئے چار سال سے بھی اوپر ہو چکے تھے، لیکن ان کے مرحوم والد کے بعد بڑے نواب صاحب کے برتاؤ سے نواب سورج گڑھ دن بدن بدل ہوتے گئے اور آخر انھوں نے اپنے دیوان سے مشورہ کرنے کے بعد لکھ بھیجا۔

"مرحوم نواب پھول پور سے میرے مراسم دوستانہ تھے اس لئے میں نے ولی عہد کی نسبت کی تھی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد صورتِ حالات بالکل بدل گئی ہے، اس لئے میں یہ رشتہ قائم رکھنا نہیں چاہتا۔"

بڑے نواب صاحب تو دل سے یہی چاہتے تھے کہ انجو کا رشتہ سورج گڑھ میں نہ ہو، ورنہ شادی کا انتظام اتنے بڑے پیمانے پر کرنا ہوگا جس کے لئے کافی روپے کی ضرورت ہے۔ اس لئے انھوں نے نواب سورج گڑھ کو رسمی طور پر یہ جواب دیدیا کہ "آپ اگر اپنے لڑکے کا رشتہ ہمارے یہاں نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں۔" ساتھ ہی جتنے تحائف انجو کے لئے آتے رہے تھے واپس بھجوادئے۔ مگر جب انھوں نے انجو سے انگوٹھی اور لاکٹ منگوایا تو اس نے یہ چیزیں نہ دیں اور رو رو کر بُرا حال کر لیا۔

ولی عہد کو انجو نے خط لکھا۔ "میرے دادا جان اور آپ کے والد نے تو

ہمارا یہ رسمی رشتہ توڑ دیا۔ مگر آپ نے جو پیمانِ وفا مجھ سے کیا تھا، مجھے اس پر اعتماد ہے۔ اگر ہم دونوں کے دل ایک ہیں تو اوپر والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرے ابا حضور نے مجھے آپ سے منسوب کیا تھا۔ میں ان کی کی ہوئی منگنی کو کیسے توڑ سکتی ہوں؟ اور لوگوں کی مجھے پرواہ نہیں ہے مگر آپ خدا کے لئے مجھے نہ بھول جائیے گا۔"

ولی عہد نے جواب دیا۔ "تم مطمئن رہو عزیز از جان! میں جو قول تم سے کر چکا ہوں اس پر پابند رہوں گا۔ ابا جان کے رشتہ توڑ دینے سے ذرا نہ گھبراؤ۔ میری شادی تمہارے علاوہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔"

اور باپ نے جب انجو کی تصویر اور منگنی کی انگوٹھی ان سے منگوائی تو ولی عہد نے صاف کہہ دیا۔ "میں خواہ مخواہ اتنی اچھی منسوبہ کو کیوں چھوڑ دوں؟ مجھ سے پوچھے بغیر میری منگنی توڑنے کا ابا جان کو حق نہیں۔ مجھے تو انجو کا اب پہلے سے بھی زیادہ خیال ہے کیونکہ بے چاری بن باپ کی لڑکی ہے۔ بھائی بھی کم سن ہے۔ دادا اپنی عیش و عشرت میں ایسے پڑے ہیں کہ نہ ان کو جوانمرگ بیٹے کا رنج ہے نہ یتیم پوتا پوتی کا خیال۔"

دیوان جب یہ جواب لے کر نواب کے پاس گیا تو انھوں نے غصے میں خودسر بیٹے کو نظر بند کر دیا۔ مگر وہ بھی ضد میں باپ سے کچھ کم نہ تھا۔ اس نے کہہ دیا۔ "جان جائے پر آن نہ جائے، میں تو اسی لڑکی کو بیاہ کر ہی لاؤں گا جس کے ساتھ میرا نام چار سال سے لیا جا رہا ہے۔ خواہ مجھے ساری عمر قید رکھا جائے، مگر میں ایک بھولی اور معصوم لڑکی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

انجو کو نظر بندی میں بھی طول طویل محبت نامے ولی عہد بھیجتے رہے۔ دونوں چھوٹے بھائی ان سے ملے ہوئے تھے، اس لئے خطوط انجو کے بھی ان کو مل جاتے تھے

ولی عہد کے خط پاکر تو انجو مطمئن ہو جاتی۔ لیکن اِدھر اُدھر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور منگنی ٹوٹنے کا اعلان کیا جا رہا تھا اس سے اس کے دل پر بہت اثر ہوتا تھا۔ کنواری لڑکی، کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی، ہر وقت کڑھتے رہنے سے اس کی طبیعت نڈھال رہنے لگی۔ منجھلی بہو صاحب کو پہلے یہ خبر ملی کہ نواب سورج گڑھ نے منگنی توڑ دی، پھر کچھ دن بعد انجو کی بیماری کی اطلاع پہنچی، وہ پریشان ہو کر بھوپال پور گئیں اور انجو عظمیٰ کو ایک ہفتے بعد اپنے ساتھ لے کر دلی آگئیں۔ نواب شاہرخ گرمی کی تعطیلوں میں بمع شاپور مرزا کے حسب معمول شملے گئے ہوئے تھے، اور مہاراج نابھ کے مہمان تھے۔ مہاراج ان کے باپ کے گہرے دوست اور مخلص انسان تھے، مرحوم نواب کے بعد بھی بچوں کے ساتھ بہت محبت بھرا برتاؤ کرتے رہے۔ گرمی کی تعطیلوں میں ہمیشہ لڑکوں کو اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ اور بھتیجے بھتیجے کہتے ان کا منہ خشک ہوتا تھا۔ یہ سب بھی ان کا حقیقی چچا کی طرح ہی احترام کرتے تھے۔

نواب شاہرخ کو انجو کی منگنی ٹوٹنے اور پھر اس کی علالت کی اطلاع ملی، پھر نانی کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ انجو کو لے کر دہلی آگئی ہیں، اور وہ بہت پریشان اور مضمحل رہتی ہے۔

شاہرخ مرزا کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ انجو کی ٹوٹی ہوئی نسبت کو پھر کس طرح جوڑا جائے اور نواب سورج گڑھ کو منانے کے لئے کونسا طریقہ استعمال کیا جائے۔ جب اُن سے یہ گتھی کسی طرح نہ سلجھی تو مہاراج سے کہا۔

انھوں نے کہا "بھتیجے گھبراؤ نہیں، نواب سورج گڑھ نے یہ بہت

نازیبا حرکت کی کہ مرنے والے کو زبان دے کر پھر گیا۔ دراصل تمہارے دادا کی سرد مہری کے برتاؤ سے وہ بدظن ہو گیا۔ بہر حال میں نواب کو سمجھا کر لکھوں گا کہ اتنے عرصے کی لگی ہوئی منگنی کو نہ توڑے۔" یقین ہے کہ وہ میرا کہنا مان لے گا۔ تم انجو عظمیٰ کو یہاں بلوا لو، دلّی میں بھی گرمی بہت ہے یہاں آکر یقین ہے انجو کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

شاپور مرزا جا کر بہنوں کو شملے لے آئے، انجو کی طبیعت خوشگوار فضا اور اچھے موسم کی بدولت سنبھل گئی، اور بھائیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے دل بھی بہل گیا۔

چھمّو نے اس کو یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا تھا کہ "جب نصرت علی خاں برابر خط بھیج رہے ہیں تو پھر تم کیوں گھلی جا رہی ہو" پھر شوخ چھمّو نے چٹکی بجا کر کہا۔" اری بنّو! تیری نشیلی آنکھوں کا مارا تو پانی بھی نہیں مانگتا اس کو تو شہید کر چکی ہے پھر کیا غم ہے۔" اور تھرک تھرک کر وہ بہت دیر تک گاتی رہی۔" وہ دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" اس کے بھونڈی آواز سے گانے اور رنگ برنگ کے منھ بنانے پہ انجو ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن گئی تھی۔ اور پھر اس کے بعد اس کی مایوسی دُور ہو گئی تھی۔

مہاراج کا خط پاکر نواب سوچ کر شرمندہ تو بہت ہوئے، مگر ایک تو کسی کمبخت نجومی نے یہ کہہ دیا تھا۔" سرکار! آپ کی ہونے والی بہو اپنے شوہر پہ بہت بھاگوان ہے۔ اس کے ریاست میں قدم رکھتے ہی وہ نواب ہو جائیں گے۔" اس کا مقصد یہ تھا کہ نواب صاحب بہو کے آتے ہی آنجہانی ہو جاتے۔ بھلا وہ یہ کیسے گوارا کر لیتے کہ بہو کو لا کر اپنے لئے خطرہ مول لیں۔ دوسرے بیٹے کی ضد ! ان کو اور بھی غصہ آگیا۔ انھوں نے انجو سے ولی عہد

کی شادی نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ مہاراج کو لکھا "آپ کو میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں، میں نے جو بہتر سمجھا وہ کیا!"

مہاراج نے اس خط کے جواب میں بہت طعن و تشنیع کا خط لکھا۔ غرضیکہ دونوں کی خوب تُو تُو میں میں ہوئی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ جون کا پورا مہینہ اس خط و کتابت میں گزر گیا۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں شاہرخ مرزا بہنوں کو لے کر دلّی آ گئے۔ وہ تو پھول پور ہاؤس میں ٹھہرے، انجو عظمیٰ نانی کے پاس رنگ محل میں رہیں۔

شاہرخ مرزا اب کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ولی عہد سوہن گڑھ کا خط ملا "میں دونوں بھائیوں کی مدد سے ابّا جان کی قید سے نکل آیا۔ آجکل ہم تینوں نانی اماں کے پاس بڑودے ہیں۔"

انجو یہ خبر پا کر بہت مسرور ہوئی، پھمّو کو بھی خوش ہو کر اس نے خط دکھایا۔ وہ تھرک کر بولی۔ "سنو، بنّو! اب دیر کرنے کا موقع نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کے دباؤ میں آ کر یہ نگوڑا ابھی بدل جائے اور تم بیٹھی ٹسوے بہاتی رہو۔ اس کو لکھ بھیجو۔ شاہرخ آجکل یہیں ہے تم آؤ، اور دو بول پڑھا کر لے جاؤ۔"

انجو لجا کر بولی "اے ہے، پھمّو! تم بھی حد کرتی ہو، وہ کیا کہیں گے، بے شرمی کی بھی انتہا ہے۔ میں یہ کیسے لکھوں کہ مجھ کو بیاہنے کے لئے آ جاؤ۔"

پھمّو کو ناک منھ بنا کر "تم نہیں تو کیا تمہارے فرشتے لکھیں گے۔ دل میں تو بیگم صاحبہ کے لڈّو پھوٹ رہے ہیں اور چلی ہیں شرمانے، اے لی شرمیلی بیگم، پھر یہ لمبے لمبے خط تم لکھتی ہو، اپنے چہیتے کو ——— یا کوئی اور؟ وہی مثل ہے نو سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔"

غرضیکہ شوخ پھمّو نے انجو سے خط مار مار کے ولی عہد کو لکھوا ہی دیا۔ اور دوسرے ہفتے شاہرخ مرزا کو ولی عہد کا تار ملا۔ "میں شادی کرنے کیلئے آنا چاہتا ہوں۔"

اور تار کے ملتے ہی شاہرخ مرزا گھبرائے ہوئے نانی کے پاس آئے اور ان سے مشورہ کیا کہ کیا جواب دیا جائے۔ انھوں نے کہا۔ "مصلحت یہی ہے کہ چپ چپاتے نکاح کر کے انجو کو رخصت کر دیا جائے۔ ادھر دادا مخالف ہیں اور ادھر نواب سوئج گڑھ —— وہ تو کہو لڑکی کی قسمت اچھی ہے کہ ولی عہد ابھی تک بات پر اڑا ہوا ہے، اور یہ بہت ہی اچھا موقعہ ہے کہ وہ خود آنا چاہتا ہے۔"

شاہرخ مرزا نے منظوری کا تار ولی عہد کو بھیج دیا اور رنگ محل میں کھلبلی مچ گئی۔ جہیز تقریباً انجو کا سب تیار تھا۔ لیکن ایک دم جو گھر میں شادی پھیل گئی تھی اس سے سب بیویاں بے اوسان ہو رہی تھیں۔ انجو دل میں تو بہت مسرور تھی لیکن شادی کا چرچا ہوتے ہی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ اور حمیدہ اپنی سہیلی کی شادی کی خبر پا کر خوشی کے مارے کھلی جاتی تھی۔ منجھلی بہو صاحب صبح سے رات گئے تک انتظامات میں منہمک رہتیں۔ ۱۴ر اگست کی شام کو ولی عہد نصرت علی خاں دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ دلی پہنچ گئے۔ سکندر زمانی بیگم نے ۲۰ر اگست کی تاریخ انجو کے عقد کی مقرر کر دی اور شادی کا کام زور شور سے ہونے لگا — رنگ محل میں سفیدی ہی تین دن میں کہیں جا کر ہوئی۔ ایک تو اتنا بڑا محل پھر برسات کا موسم۔ کبھی بارش ہوتی کبھی دھوپ نکلتی۔ بیویوں کو مصروفیت کے مارے دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ کبھی بنارسی تھان دیکھ رہی تھیں کبھی زیور — چینی کے برتنوں کے جوڑ ملائے جا رہے ہیں تو تانبے کے برتن قلعی کے لئے بھیجے جا رہے ہیں۔ دو محل کچھپر کھٹ کا پردہ بیونت رہی ہیں۔ چار اوچھ سینے میں مصروف ہیں۔ صبح نماز کے بعد سے جو سینا اور کام پھیلتا تو آدھی رات تک سب اس میں مصروف رہتیں۔ چھوکری نیند اور بھوک سب خوشی کے مارے اڑ گئی تھی۔ بال بچے کام میں مصروف۔ تمام دن ادھر سے ادھر پھیرکی کی مانند پھرتی رہتی تھی۔ عطن کو ڈانٹتی جاتی۔ "کام کرو

کام، باتیں نہ بناؤ۔"

ننھی بے بی تک بھی بنارسی، والے لیلا رام کے یہاں کی ساڑھیوں کا بھاؤ تاؤ کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ کام بھی توڈبل تھا اور وقت تھوڑا۔

ولی عہد سورج گڑھ کے یہاں کون سے اہلکار بیٹھے تھے جو تیاری کرتے، وہ تو نانی سے چار زیور اور ڈھائی ہزار روپیہ لے کر آئے تھے، وہی انھوں نے لاکر دیدئے تھے۔ منجھلی بہو صاحب نے ڈیڑھ ہزار روپیہ تو ان کو واپس کر دیا ایک ہزار میں میت کا سرخ کارچوبی جوڑا حاجی علی جان کے یہاں جلدی جلدی تیار کرایا۔ اور بری کا ضروری سامان عطر، تیل، مہندی، جوتی، رومال اور سواسون چھوہارے منگوائے۔ زیور جو آیا تھا سب بیش بہا تھا۔ کانوں کی ہیرے کی بجلیاں تھیں اور ہیرے کا ٹیکہ اور ایسا ہی نکلیس۔ سونے کی ڈائمنڈ کٹ گجراتی جنج کی ٹُبک، پازیب تھی جس میں بجائے گھنگھروؤں کے آبدار سڈول موتی لگے ہوئے تھے۔

جمعرات کی شام کو انجو کو مایوں بٹھایا گیا۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے خوب دل کھول کر ابٹنا کھیلا۔ ایک نے دوسرے کی گت بنائی۔ چھمّو نے سب سے زیادہ اودھم مچایا۔ کہیں دس بجے رات تک یہ ہلڑ ختم ہوا، بڑی بہو صاحب کا چیخنے چیخنے گلا بیٹھ گیا جب۔ کہیں لڑکیاں کھوں کھوں کھل کھل کرتی منھ دھونے غسلخانے میں گئیں اور لڑکے ہنستے ہوئے باہر بھاگے۔ دسترخوان بڑھایا گیا، تو بارہ بج چکے تھے۔ انجو کی مہندی سات سہاگنوں نے لگائی۔ اس کے بعد سوتا کون — سلائی بھی ہوتی رہی، گانا بھی ہوتا رہا۔ چار بجے سب ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹی تھیں۔ صبح کی اذان ہوتے ہی وضو کر جلدی جلدی نماز پڑھ کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ بارش بھی پچھلے پہر سے خوب ہوئی۔ کہیں خدا خدا کر کے دن نکلے جاکر تھمی۔ مگر ابر اب بھی تھا۔ اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ صبح نو بجے سے مہمان

بیویوں کی آمد شروع ہوگئی تھی، اور پھر دن چڑھتے چڑھتے تو محل میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، صبح دس بجے نواب زادی انجمن آرا بیگم کا عقد ولی عہد سورج گڑھ نصرت علی خاں سے بعوض سوا لاکھ مہر بخیر و خوبی ہوگیا۔ ہر طرف مبارک سلامت کا شور ہوا۔ نفیری کی سُریلی دُھن نے نغمہ شادی سنایا۔ ریاست کے قوال مبارکبادی کے ترانے گانے لگے۔ دولہا کا چھوٹا شربت دُلہن کے لئے آیا۔ ناک میں نتھ ڈال کر انجو کو شربت پلایا۔ وہ رسمی طور پر نہیں واقعی اپنے چاہنے والے باپ کو یاد کر کے اس وقت روتے روتے بے حال ہوگئی، کاش وہ زندہ ہوتے تو آج وہ کتنے خوش ہوتے۔ کتنی دھوم سے انھوں نے منگنی کی تھی۔ نہ جانے کس قدر شان شکوہ سے وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی کرتے اور کیا کچھ اس موقع پر اس کو دیتے اب تو بس فرض ادا ہو رہا ہے، ادھر دادا ناخوش تھے، ادھر خسر کا یہ وجہ ختم تھا۔ چھمّو روتی ہوئی سہیلی کے گلے میں بانہیں ڈال کر خود بھی رو دی، لیکن پھر جلدی سے آنسو پونچھ کر بولی۔ "بہن اس وقت رو کر بدشگونی نہ کرو۔ خدا کا شکر ہے تم اپنی مرضی کے مطابق بیاہی گئیں۔ اور تمہارا دولہا تمہارا محبوب بھی ہے۔ لو جلدی سے منھ دھولو، تم نے تو رو رو کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا ہے" (مسکرا کر) "دولہا میاں آرسی مصحف کے وقت یہ دیکھیں گے کہ تم بجائے شگفتہ ہونے کے بسور رہی ہو تو کچھ خوش نہ ہوں گے۔"

شوخ چھمّو کی فقرہ بازی پر انجو مسکرا دی، چھمّو نے سلابچی آفتابہ منگوا کر انجو کا منھ دھلوایا، پھر اس کو سنوارا۔ ابھی دوپٹے میں وہ عطر مل رہی تھی کہ منو دُلہن کہتی ہوئی آئیں "اے ہے چھمّو! تم نے تو بہت دیر کر دی، دُلہن کو جلدی سے تیار کرو، دولہا تو آ بھی گیا۔"

چھمّو کھلتی کلی کی طرح مسکرا کر بولی "لیجئے، دُلہن بھی تیار ہے۔"

منوّر دلہن نے انجو کو دوپٹہ اوڑھا کر بسم اللہ کہہ کر گود میں اُٹھایا، چھمّو اس کے فرشی پائجامے کے پائنچے اور سہرے کو سنبھالتی پیچھے چلی۔

ولی عہد سورج گڑھ ماشاء اللہ اب نوخیز لڑکے نہیں بیس² سالہ جوان رعنا تھے ان کا سرخی مائل چمپئی رنگ پیازی بھاری مندیل سے مل رہا تھا، جیغہ و سرپیچ لگائے زرتار اور پھولوں کے بھاری سہرے اور شاہانہ لباس میں وہ پھوٹے نکل رہے تھے، حسن بیوی نے بھی ان کو دیکھا خوش ہو کر کہا۔ "ماشاء اللہ چشمِ بد دُور چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

دلہن کو آتا دیکھ کر دولہا تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا، ڈومنیوں نے لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ "آ دیکھ لے بنّے! بنّو ہماری چاند سی۔"

اور انجو واقعی چاند جیسی تو تھی، حسن و جمال اس نے اپنی خوروش ماں سے ترکے میں پایا تھا۔ ماں کی طرح وہ حسین نہ تھی۔ لیکن پھر بھی خوبصورت ماں کی بیٹی تھی، ذکیہ بیگم کے دل رُبا حُسن کا عکس انجو کی صورت میں نمایاں تھا۔ موزوں نقشہ سُرخی مائل گندمی رنگ، کھنچی ہوئی بھویں۔ مخمور آنکھیں۔ سیاہ لانبے گھنگھریالے بال، گداز جسم۔ اس پر عروسی جوڑے اور بیش بہا زیورات سے لدی ہوئی پھولوں سے سجی ہوئی انجو اس وقت قدرت کا حسین ترین شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔

آرسی مصحف کرانے دولہا کی جانب سے چھوٹی بہو صاحب بیٹھیں۔ کنبے میں جتنی بھی شادیاں ہوتیں آرسی مصحف وہی کراتی تھیں۔ اللہ ان کا سا خوش نصیب سب لڑکیوں کو کرے، میاں ان کے نام کے فریفتہ تھے۔ گو دکھی اللہ رکھے بھری پُری تھی، دلہن کو سنبھالے منوّر دلہن بیٹھی تھیں، قرآن شریف لا کر بیچ میں رکھا گیا۔ دولہا دلہن کے سر پہ سرخ بنارسی دوپٹہ ڈال دیا گیا۔ چھوٹی بہو صاحب کے کہنے کے مطابق دولہا نے تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دلہن

کے منھ پر دم کی - قرآن شریف اپنے ہاتھ میں لے کر چھوٹی بہو صاحب نے کہا۔ "کہو،
میاں ! بیوی میں تمہارا غلام ہوں، آنکھیں کھولو۔"

اور نصرت علی خاں نے جو ہمیشہ ہی انجو کو خطوں میں لکھتے تھے۔ "میں تمہارا غلام ہوں۔" (مسکرا کر) آہستہ سے کہا: "انجو، تمہارے سامنے تمہارا غلام حاضر ہے آنکھیں کھولو۔"

انجو نے یہ محبت بھری آواز سن کر بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے اس کے من مندر کا دیوتا اس کا پریتم موجود تھا۔ دو شرمیلی شیلی آنکھیں اس کو تاکتی رہی تھیں۔ شوق پر دلہناپے کا حجاب غالب آگیا، اور اس نے لجا کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔

چھوٹی بہو صاحب نے پوچھا۔ "دلہن نے آنکھیں کھولیں؟"

ولی عہد نے مسکرا کر کہا۔ "جی ہاں !"

چھوٹی بہو صاحب نے دولہا کو پہلے اپنا منھ دکھایا پھر سب کو ہٹا کر

آسمان ———

ڈومنیاں گانے لگیں :-

میری ہریالی گھونگھٹ کھولو
اک لکھ دوں گا گھونگھٹ کھولو
دو لکھ دوں گا منھ سے بولو

دولہا نے چھپر کھٹ میں بیٹھ کر دلہن کی مانگ میں صندل بھرا پھر وہ تو باہر سدھارا، دلہن کو آرام کرنے کے لئے لٹا دیا گیا۔ اب کھانے کی دھوم مچی۔ بارہ بج چکے تھے۔ پردہ کرا کر دیگیں دروغہ جی نے نیم والے سائبان میں پہنچا دیں دسترخوان دونوں دالانوں میں بچھائے گئے۔ کھانا نکلوانے قیصر دلہن اور منور دلہن

بیٹھیں۔ سکندر زمانی بیگم بھی یہیں بیٹھی تھیں۔ عظمیٰ اور ستارہ، چھمّو، احمدی بیگم کھانا کھلوا رہی تھیں۔ کھانا کھاتے کھلاتے تین بج گئے۔ اس کے بعد انجو کا جہیز مہمان بیگمات کو دکھایا گیا۔ منجھلی بہو صاحب کے سلیقے کی بدولت جہیز بہت اچھا تھا۔ ہر جوڑے کی کٹ نئی اور وضع دلکش تھی۔ علاوہ لباس شب خوابی کے ہلکے بھاری چالیس جوڑے تھے۔ بیس ساڑھیاں۔ پچیس چاندی کے برتن اور دو سونا نبے کے۔ ہیرے زمرد کا ایک بیش بہا سیٹ تو نواب مرحوم نے انجو کے لئے خود ہی بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ ماں کے زیوروں سے انجو کے حصے میں یاقوت کے بالے، فیروزے کی تجھلیاں اور نو نگوں کا ہار۔ فیروزے کی نو گریاں، یاقوت موتی کے دست بند، سونے کی چمپا کلی اور جوشن، اور پاؤں کے سونے کے جھانجن آئے تھے۔ چندن ہار نانی نے دیا۔ شاہرخ مرزا کی جانب سے ہیرے زمرد کا جھومر تھا — بڑی بہو صاحب نے آرسی دی اور سکندر زمانی بیگم نے سرخ کارچوبی دوشالہ — چھوٹی بہو صاحب نے موتی اور زمرد کی دو لڑی داہن کو دی اور دولہا کو ایک سو ایک سلامی کا دیا۔ چھمّو نے چاندی کا کشمیری کام کا عطر دان دیا۔ اور بھی قریبی عزیزوں نے انگوٹھیاں، بندے، چاندی کے گلدان وغیرہ دئے۔

دولہا کو خلعت چودہ پارچے کا بمع مالائے مروارید اور کلغی کے بڑے نواب صاحب نے دیا۔ سلامی میں گیارہ سو نواب شاہرخ کی جانب سے اور ڈھائی ہزار اور سب کی جانب سے دیا گیا۔ غرضیکہ جہیز کافی اچھا منجھلی بہو صاحبہ کی بدولت ہو گیا۔ اور پھول پور کی شان کے مطابق نہیں، تو ایسا بھی نہ تھا کہ نام رکھا جاتا۔ بڑے نواب صاحب تو عقد سے ایک دن پہلے ہی شاہرخ مرزا کے ارجنٹ تار ملنے کے بعد پہنچے تھے اور صرف سات ہزار روپیہ لائے تھے ست ہزار سادگی سہی، مگر پھر بھی تو ایک رئیس کی بیٹی کی شادی تھی جو دوسری بڑی لیا

سے بیاہی جارہی تھی۔ مگر بڑے نواب صاحب نے نواب شاہرخ سے کہا۔ خدا نے ہیں تو اس وقت پانچ ہزار ہی تھا۔ دو ہزار تو میں قرض لے کر آیا ہوں۔ نواب شاہرخ کی ابھی بساط ہی کیا تھی جو دادا کو کچھ کہتے۔ منہ تک کر رہ گئے اور جوں توں کر کے اس میں ہی پوت پورا کیا۔ پھر بھی کچھ روپیہ منجھلی بہو صاحب کا اٹھ گیا۔ مگر نانی نواسے اس سے خوش تھے کہ انجو کی شادی تو ہو گئی۔ دن جھلکیوں ہی باقی تھا کہ انجو بی رخصت ہو کر پھول پور ہاؤس گئیں۔

دوسرے روز صبح کو شاہپور مرزا بہن کو لے کر آ گئے۔ چھمّو نے اپنی پیاری سہیلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انجو خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی۔ اس کی انگلی میں ایک اور بیش بہا ہیرے کی ہلال نما انگوٹھی نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔

تمام دن چہلوں میں گزرا۔ شام کو انجو کو سبز بھاری کار چوبی جوڑا اور سب زیور پہنا کر افشاں سے مانگ بھری گئی۔ پھولوں کا گہنا پہنایا گیا۔ پہلے دولہا دلہن نے پھولوں کی چھڑیوں اور گیندوں سے چوتھی کھیلی۔ اس کے بعد سالیوں نے دولہا کی خبر لی۔ شوخ چھمّو مہمان بیویوں کے ہجوم میں چھپی ہوئی دولہا کو تاک تاک کر مار رہی تھی۔ اس کی شگفتہ صورت کبھی کبھی نظر آتی۔ پھر بجلی کی مانند کوند کر وہ چھپ جاتی تھی۔ جب ہر جانب سے بہت ہی یورش ہوئی تو پھر دولہا گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ شاہرخ مرزا اور شاہپور مرزا بھی بہنوئی کی رفاقت میں سینہ سپر رہے تھے، وہ بھی دولہا کے ساتھ چلے۔ چھوٹی بہنوں نے لڑکیوں کو ڈھائی سو روپے دئے اور بہت کہا سنا تو عظمیٰ اور ستارہ نے جوتا لا کر دیا۔

نواب شاہرخ تو بہنوئی کے ساتھ باہر چلے گئے۔ لیکن شاہپور نے شہاب اور منجھی کے ساتھ مل کر وہ آفت مچائی کہ لڑکیاں بھی پناہ مانگ گئیں۔ دو چار مہمان بیویوں کے بھی اس ہڑبونگ میں چوٹ لگ گئی۔ بڑی بہو صاحب پان چھالیہ،

بانٹنے میں مصروف تھیں، انھوں نے جو یہ دھما چوکڑی مچتی دیکھی تو پائنچے سنبھالتی چیختی ہوئی لڑکوں کی جانب چلیں۔ ان کو دیکھتے ہی سے شریر شاپور بیج... اپنے ساتھیوں کے کودتا، پھلانگتا باہر بھاگ گیا۔ لڑکیاں پہلے ہی مارے کے ڈر تھے کونوں میں دبک گئی تھیں۔

دو دن بعد دولھا دلہن سدھائے۔ نصرت علی خاں دلہن کو لے کر نانی کے پاس گئے اور وہاں کچھ دن رہ کر اپنا ماہ عسل گزارنے بمبئی چلے گئے۔

انجو کے لئے اتنا بڑا شہر اور یہاں کا طریقِ زندگی سب حیران کن تھا، اس نے آنکھ کھول کر دتی، بھوپال کے علاوہ اور کیا دیکھا تھا۔ پھر جہاں بھی جاتی پردے میں رہتی۔ عمر کے بیس سال چار دیواری میں ہی گزرے تھے۔ اب اپنے چاہنے والے شوہر کے ساتھ وہ سینما کی پارٹیوں، کلبوں، تفریح گاہوں میں آزادی سے گھومتی تھی، ہر چیز کو دیکھ کر خوش بھی ہوتی اور حیران بھی۔

مجلسی زندگی کے آداب سے وہ پوری طرح واقف تھی، خود کہیں باہر نہیں گئی تھی تو کیا — بھوپال میں تو آزاد خیال فیشن ایبل خواتین مخصوص تقاریب میں آتی ہی رہتی تھیں۔ اس کے شستہ انداز، پیاری صورت، شرمیلی ادائیں، مغلئی طرز کے زرکار بیش بہا ملبوس کو بمبئی کی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ وہ ان سب کے ساتھ پوری طرح سے گھل مل گئی تھی۔ اور بےحد نصرت علی خاں یہ دیکھ کر بہت خوش تھے کہ ان کی چہیتی بیوی کو فیشن ایبل عورتیں بھی پسند کرتی ہیں۔

چھمّو کو وہ ہر خط میں لکھتی تھی۔ "میں بہت خوش ہوں، نصرت کو پا کر اب میری کوئی آرزو باقی نہیں، وہ بےحد اچھے ہیں۔ دُعا کرتی ہوں کہ تم کو بھی انہی جیسا چاہنے والا شوہر ملے۔"

خوشی کے گہوارے میں جھولتے ہنستے کھیلتے انجو کے دو مہینے گزر گئے۔

پھول پور سے دسہرے دربار کا بلاوا آ گیا۔ شاہرخ مرزا تو برابر ایک مہینہ سے بہن بہنوئی کو بلا رہے تھے۔ لیکن نہ تو نصرت علی خاں کا ہی دل چاہتا تھا کہ بیوی کو وہاں چھوڑ کر پھر تنہائی کی زندگی بسر کرے، نہ انجو ہی اپنے محبوب شوہر کو چھوڑ کر جانا چاہتی تھی۔

دسہرے سے چار دن پہلے یہ دونوں پھول پور پہنچ گئے۔ وہاں ان دنوں خوب رونق تھی۔ شاہرخ مرزا کے کلاس فیلو اور پھوپھیاں، چچا اور خاندانی سب جمع تھے۔ دسہرے کا دربار پھول پور میں ہمیشہ عیدین سے زیادہ بارونق ہوتا تھا۔ دنوں پہلے سے چہل پہل رہتی اور مہینوں پہلے سے اس کی تیاری قلعے میں شروع ہو جاتی تھی۔

بیس دن پھول پور رہ کر انجو اور نصرت علی خاں نابھ جاتے ہوئے ایک ہفتہ دہلی ٹھیرے۔ میاں کی وجہ سے انجو ٹھیری تو پھول پور ہاؤس میں تھی مگر اکثر اس کا تمام دن پھمو کے ساتھ رنگ محل میں گزرتا تھا۔ اتنے تھوڑے عرصے میں ہی اس میں کافی تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ اب بجائے غرارے یا تنگ پائجامے کے فیشن ایبل قیمتی ساڑھیاں پہنتی تھی، پیپ سٹک کا استعمال بھی قرینے سے شروع کر دیا۔ کھلی آب و ہوا میں رہنے اور خوشی کے باعث اس کا جسم گداز ہو گیا تھا اور رنگ میں چمک آ گئی تھی۔ پھمو کو اپنی سیر و تفریح کے قصے سنا سنا کر انجو نے گھر بیٹھے بمبئی کی سیر کرا دی۔ چلتے وقت وہ اپنی چہیتی سہیلی سے بھینچ بھینچ کر گلے ملی۔

مہاراج نابھ نے ان دونوں کی بہت آؤ بھگت کی۔ اور بڑے اصرار سے دس روز مہمان رکھا۔ چلتے وقت ولی عہد کو خلعت مع دو شالے کے دیا

اور انجو کو تار بانے کی ساڑھی، سچے موتی ٹکی چولی اور ہیرے کے بُندے دئے۔

ولی عہد بیوی کو لے کر پھر نانی کے پاس بڑودے چلے گئے۔ وہاں ان کو رہتے ہوئے ڈھائی مہینے ہوئے تھے۔ یکایک دیوان سورج گڑھ کا تار ملا۔ "نواب صاحب کو پرسوں رات فالج کا دورہ ہو گیا۔ فوراً آئیے۔" نصرت علیخاں تار پاتے ہی موٹر سے سورج گڑھ روانہ ہو گئے، دونوں چھوٹے بھائی کالج سے چند گھنٹے پہلے پہنچ چکے تھے۔ وہ جس وقت پہنچے تو نواب صاحب غافل تھے۔ دو ڈاکٹر ان کا غور سے معائنہ کر رہے تھے۔ نصرت علی خاں نے باپ پر جھک کر کہا۔ "ابا جان"

نواب صاحب نے بیٹے کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم آ گئے نصرت! کیا دلہن کو بھی لائے ہو؟"

نصرت علی خاں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "جی، میں تو پریشان ہو کر جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی چلا آیا۔ وہ نانی اماں کے پاس ہیں۔"

نواب صاحب نے بمشکل کہا۔ "اچھا، اب دلہن کو بلوالو، میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

نصرت علی خاں نے کہا۔ "بہت بہتر!"

پھر دونوں ڈاکٹروں سے الگ لیجا کر پوچھا، "حالت کیسی ہے؟"

وہ دونوں سر ہلا کر بولے۔ "حالت ٹھیک نہیں ہے۔ فالج بائیں جانب گرا ہے۔ اس لئے دل پر بھی خفیف سا اثر ہے اگر دوسرا حملہ پھر ہوا تو ان کا بچنا مشکل ہے۔"

ولی عہد نے چچا کو نانی اور بیوی کے لینے کے لئے بھیجا۔ خود باپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

سورج گڑھ بڑودے سے دو گھنٹے کے راستے پر تھا۔ انجو بی معہ نانیا ساس

کے شام کے لگ بھگ سورج گڑھ پہنچ گئیں۔ سوتیلی ساس نے ان کا استقبال بہت خوش دلی سے کیا۔ صبح چائے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ساس کے ہمراہ خسر کے آداب کو گئیں۔ نواب صاحب جب ہوشیار ہوئے تو بیوی نے کہا۔

"دلہن آپ کے آداب کو آئی ہیں۔"

نواب نے شرمائی گھبرائی گھونگھٹ سے منہ چھپائے انجو کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔ اور کہا۔ "بیٹی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں کہ تم کو لانے کے لئے خود نہ جا سکا۔ نصرت نے بہت اچھا کیا کہ جو عہد میں نے تمہارے باپ سے کیا تھا اس کو پورا کیا۔ ورنہ مرنے کے بعد مجھے اپنے دوست سے کیسی ندامت ہوتی تم اب میری بھول کو معاف کر دو۔

انجو تو سر جھکائے چپکی بیٹھی رہی۔ ولی عہد نے کہا "بابا جان! توبہ، توبہ، آپ کو انجو سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کا غلام ہوں اور یہ آپ کی لونڈی۔ آپ کو ہم دونوں پر پورا حق حاصل ہے۔ جو چاہیں کہیں اور جیسا سلوک چاہیں کریں۔

نواب صاحب پھر کچھ دیر بعد غافل ہو گئے۔ بایاں ہاتھ اور پاؤں بالکل بیکار ہو گیا تھا۔ زبان میں بھی لکنت تھی۔ بمبئی کے تمام اچھے ڈاکٹر ان کو دیکھنے آئے، مگر ان کا حال جوں کا توں رہا۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ جنوری میں سردی زیادہ ہوتے ہی نواب صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔ دوسرا دورہ پڑتے ہی زبان بھی بند ہو گئی اور وہ بالکل بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں تیسرے دن شام کو ان کی زندگی کا سورج ڈوب گیا۔

اس طرح نجومی کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ انجو بی شادی کے چھ مہینے بعد ہی ولی عہد بیگم سے نواب بیگم بن گئیں۔

نواب صاحب کے انتقال کی خبر دہلی اور پھول پور پہنچی۔ تو پھول پور سے تو بڑے نواب صاحب نے شاپور مرزا کو دیوانِ ریاست کے ساتھ ماتمی خلعت دے کر بھیجا اور دہلی سے منجھلے بھیا بیوی کے پہنچے۔

انجوبی ابھی بالکل الھڑ اور ناتجربہ کار تھیں۔ نانی کے پہنچ جانے سے ان کو بہت تقویت ملی۔ محل کا پورا کارخانہ اب انجوبی کے ہاتھ میں تھا۔ نصرت زمانی بیگم سرکارِ محل ان کا خطاب تھا۔ ساس بے چاری جو کل تک مالک و مختار تھیں اب بہو کا منھ دیکھتیں اور ہاں میں ہاں ملاتی رہتیں۔

بھلا امیروں کو رنج ہی کب ہوتا ہے اور نصرت علی خاں کی تو کشیدگی کافی دن تک باپ سے رہی، چہلم تک تو رسمی طور پر ریاست میں ماتم کیا گیا۔ اس کے بعد نواب کی مسند نشینی کی تیاری شروع ہو گئی۔

سورج گڑھ میں روپے کی کمی نہ تھی۔ خزانہ بھرا ہوا تھا، مرحوم نواب رنگین مزاج تھے مگر فضول خرچ نہیں۔ اور پھر نصرت علی خاں کی والدہ بمبئی کے ایک کروڑپتی تاجر کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ شاہانہ جہیز اور جائداد کے علاوہ قیمتی زیور کے ساتھ چالیس لاکھ نقد بھی لائی تھیں پھر کیا کمی تھی۔ دل کھول کر جشنِ مسند نشینی کی تیاری کی گئی۔ انجوبی کے لئے اور زیور کے ساتھ الماس نگار نیم تاج بھی بنا اور جشن کے روز پہننے کے لئے فرشی پائجامے کا جوڑا دو ہزار کی لاگت سے تیار کرایا گیا۔ اس کے علاوہ اتنی ساری قیمتی اور فیشن ایبل ساریاں اور لباس نواب نصرت علی خاں اپنی چہیتی بیگم کے لئے لائے کہ دو الماریاں بھر گئیں۔

مسند نشینی میں شرکت کے لئے نواب شاہرخ مع عطن کے آئے اور منور مرزا بیوی بچوں کو لے کر گئے۔ نواب نصرت علی خاں کے جتنے کلاس فیلو دوست اور قریبی ریاستوں کے رئیس تھے سب کو ہی مدعو کیا۔ پورے ایک ہفتے مسند نشینی کا جشن ہوتا

رہا۔ رقص و سرود کی محفلیں جمی رہیں، ———

انجم بی ابھی نواب بیگم ہو کر پوری خوش ہونے بھی نہ پائی تھیں کہ انھوں نے میاں کے برتاؤ میں نمایاں فرق محسوس کیا۔ پہلے کچھ دن تو انھوں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ مہمان داری ہو رہی ہے۔ دوست احباب آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے نواب مصروف رہتے ہیں۔ مگر جب مہمان سب رخصت ہو گئے، اور میاں کئی راتوں تک غائب رہے تو انجم بی کو بہت ملال ہوا۔ لحاظ کے مارے ان سے تو کچھ نہ کہہ سکیں۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہیں۔ شاید رستے یہ سن کر ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ نواب رات گئے تک ناچ رنگ کی محفل میں بیٹھے شراب پیتے رہتے ہیں اور ایک خوبصورت لڑکے سے چہل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لڑکا ان کے ایک بمبئی کے آوارہ منش دوست نے ان کو تحفے میں دیا تھا۔

انجم کے بھولے دل کو سخت صدمہ پہنچا، اس رات وہ سو نہ سکی اور تمام رات کروٹیں بدل کر گزار دی۔ وہ سکھ کے دن اور حسین کی راتیں انجم کے تصور میں آ رہی تھیں، جب اس کا محبوب شوہر ہر دم اس کے پاس رہتا تھا اور ہر وقت اس کی ناز برداری کرتا رہتا تھا۔

رئیس ہوتے ہی ریاست کی ذمہ داریوں عیش و عشرت کی فراوانی نے اس کے محبوب شوہر کو چھین لیا۔ اب وہ ایک باوقار بیگم تو تھی لیکن خوش نصیب بیوی نہیں۔ کاش یہ کچھ نہ ہوتا وہ پہلے کی طرح اس کو چاہتا، اس سے محبت کرتا۔ اس نے سوچا اور بے ساختہ ایک سرد آہ اس کے لبوں پر آ گئی۔

انجم پریشان تھی، اور منجھلی بہو صاحبہ بھی نواسی کی وجہ سے فکرمند تھیں مگر منورو دلہن کو سوچ کر جیسے شان و شکوہ نے بالکل بوکھلا دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی تھیں کہ نواب کے چھوٹے بھائی سے کسی طرح امینہ کی نسبت ہو جائے

تو سورج گڑھ سے کچھ اپنا بھی سلسلہ قائم ہو جائے۔ اپنی چھوٹی سی لڑکی کو جو بالکل دادی کی شکل تھی بنا سنوار کر رکھتیں۔ اور اس خیال میں محو ہو کر انھوں نے اپنے جانے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ منجھلی بہو صاحب کو اب بہو بیٹے کا یہاں رہنا ناگوار تھا۔ وہ بہت غیور بیوی تھیں، خود بھی نہ رہتیں، لیکن جب بھی وہ جانے کا ذکر کرتیں، انجو رونے لگتی، اس لئے مجبور تھیں۔ انھوں نے منور مرزا سے کہا: "تم دونوں میاں بیوی کب تک یہاں بیٹھے رہو گے۔ تم کو یہاں آئے مہینے کے قریب ہو گیا۔ تمہارے باپ تو مسند نشینی کے دو روز بعد ہی چلے گئے، شاہرخ مرزا بھی عطن کو لے کر سدھارے۔ شاپور کو اور مجھے انجو نہیں جانے دیتی۔ اس کے میاں کا رنگ بے رنگ ہے۔ ان راجہ رئیسوں کے کرتوت تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس پر نئی مصیبت پڑی ہے، اس لئے پریشان ہے۔ میں مجبور بیٹھی ہوں لیکن تم کو جلدی چلے جانا چاہیئے۔"

منور مرزا نے بیوی سے اسی دن کہہ دیا: "سامان درست کر لو، ہم پرسوں صبح واپس چلیں گے۔"

منور دلہن سورج گڑھ کے عالیشان محلوں اور یہاں کے شاندار ساز و سامان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی بادل ناخواستہ رخصت ہوئیں۔

---

(۱۶)

مارچ کے آخری دن تھے مگر موسم ابھی تک خاصا اچھا تھا، صبح و شام ہلکی سی خنکی ہو جاتی تھی۔ رنگ محل میں موسم کی دلکشی یوں بھی اچھی معلوم ہو رہی تھی کہ جنرل صاحب کے بڑے صاحبزادے قمر میاں پانچ سال بعد آکسفورڈ سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آ رہے تھے۔

یوں تو اولاد کس کو پیاری نہیں ہوتی، پھر چھوٹی بہو صاحبہ کے تو سبھی بچے اللہ آمین کے تھے، ہاتھوں چھاؤں پلے تھے، کسی کو چھینک بھی آ جاتی تو صدقے بیلے اترنے لگتے۔ منگل کے منگل تو تیل ماش اتارا ہی جاتا تھا۔

مگر قمر تو باپ کا چہیتا اور ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ مزاج بھی ایسا اچھا تھا کہ اپنے پرائے سب ہی اس کو عزیز رکھتے تھے۔

چھوٹی بہو صاحب نے یہ مناسب سمجھا کہ قمر کے آنے سے پہلے شہر سے باہر چلی جائیں۔ اس لئے اپنی سول لائن والی کوٹھی کرایہ داروں سے خالی کرا لی اور پہلی اپریل کو اس میں منتقل ہو گئیں۔ بتن بی اور منجھو بی دونوں بھائی کے آنے سے پہلے پہنچ گئیں۔ چھو تو ان دنوں بات بات پر کھلی جاتی تھی، قمر اس کا بہت چہیتا بھائی تھا۔ تمام دن یہ اٹھاتی دھرتی۔ نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی

کمروں کی آرائش و زیبائش میں لگی رہتی۔ جنرل صاحب بیٹے کو لینے ممبئی جانا چاہتے تھے۔ مگر جس دن ان کو جانا تھا، اس روز صبح ہی سے ان کی طبیعت ناساز ہوگئی ذیابیطس کے نامراد مرض نے ان کی صحت کو گھن لگا دیا تھا، اور اب وہ آئے دن بیمار رہتے تھے۔

۹ اپریل کی صبح کو قمر دلی آنے والے تھے، چھوٹی بہو صاحب کو مارے خوشی کے رات بھر نیند نہ آئی، اور چھمو بھی تقریباً جاگتی ہی رہی۔ جنرل صاحب بھی منھ اندھیرے اُٹھ بیٹھے اور مع عزیز و احباب کے چھ بجے اسٹیشن پر بیٹے کی پیشوائی کے لئے پہنچ گئے۔ ٹرین اپنے وقت پر آئی۔ جنرل صاحب ابھی فرسٹ کلاس کے ڈبوں کی جانب نظر لگائے قمر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ ان کے گلے سے آلگا۔ بھلا جنرل صاحب اس کو پہچانتے بھی کیسے۔ جب وہ ولائت گیا تو سولہ سال کا دُبلا پتلا لڑکا تھا، اب ماشاءاللہ ۲۲ سال کا جوان رعنا تھا۔ لندن کی خوشگوار آب و ہوا نے قمر کے گندمی رنگ کو سرخی مائل کر دیا تھا اور جسم گداز ہوگیا تھا۔ باپ سے ملنے کے بعد اپنے احباب اور سب عزیزوں سے قمر نے معانقہ کیا۔ سب نے اتنے ہار ڈالے کہ قمر کا منھ پھولوں میں چھپ گیا۔

بینڈ جنرل صاحب کے ایک عزیز ہندو دوست گردھاری لال جی لائے تھے جو پورے جوش و خروش سے مبارکبادی کے ترانے سنا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے ہی ایک گھنٹہ گذر گیا۔ پھر یہ جلوس موٹروں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ قمر کار کے رکتے ہی جلدی سے اتر کر ماں کے سامنے جھک گئے، جو بہت دیر سے دروازے میں کھڑی اس کی راہ تک رہی تھیں۔ انھوں نے اس کو گلے سے لگا کر پیار کیا۔ منجو بی اور بہن بی بھی ملیں۔ چھمو بھی دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اس کو دیکھ کر قمر حیران رہ گئے۔ جب وہ گئے تھے، چھمو چھوٹی سی شوخ لڑکی تھی۔

اب ماشاءاللہ بہت لمبی ہو گئی تھی۔ بے بی کونے میں شرمائی کھڑی تھی، اس کو قمر نے گود میں اُٹھا لیا۔

تیل ماش اور صدقے کے ٹکے، مٹھائی کے کونڈے سب رشتہ دار اور ملنے والی بیگمات لے کر آئیں۔ ملنے والوں کا تانتا چار دن تک لگا رہا۔ ایک آتا ایک جاتا۔ چھوٹی بہو صاحب نے جو اتنے دن بعد بیٹے کو دیکھا تھا۔ تو حال یہ تھا کہ رات کو قمر کا پلنگ اپنے پاس ہی بچھواتیں۔ اور رات کو جب کھلی ان کی آنکھ کھلتی بیٹے کا منہ اُٹھ کر دیکھتیں اور خدا کا شکر کرتیں۔ کچھ دن بعد فرصت ملی تو قمر کے مستقبل کے متعلق ماں باپ نے مشورہ کیا۔ قمر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھتا مگر امتحان کے دنوں میں میعادی بخار اس کو ہو گیا۔ اس لئے امتحان نہ دے سکا بیرسٹری کی ڈگری قمر نے اچھے نمبروں سے لی۔ وہ غیور طبیعت کا آزاد خیال نوجوان تھا، اور پریکٹس کرنا چاہتا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ قمر کو کوئی اچھا عہدہ مل جائے۔

چھوٹی بہو صاحب نے کہا۔ "تم بیٹے کو لے کر آئندہ مہینے شملے جاؤ۔ یہاں گرمی بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اچھا ہے ایک مہینہ باہر رہ آؤ تمہاری طبیعت ہمیشہ اس موسم میں نڈھال ہو جاتی ہے۔ وہاں موسم خوشگوار ہو گا۔ تمہاری صحت بھی کچھ ٹھیک رہے گی۔ اور پھر اپنے یوروپین دوستوں سے قمر کو بھی ملوا دینا اور ان سے اس کی ملازمت کے متعلق مشورہ بھی کرنا۔"

جنرل صاحب نے اپنی بیوی کی اس تجویز پر صاد کر دیا، اور ایک ہفتے بعد قمر کو لے کر شملے چلے گئے۔ ان کے ایک عزیز دوست پارلیمنٹ کے قانونی ممبر تھے، ان سے قمر کے لئے مشورہ کیا۔ وہ بولے "میرے بھائی قمر جیسے لائق لڑکوں کے لئے بھلا ملازمتوں کی کیا کمی ہے، ہمارے محکمے میں ہی دو مہینے بعد ایک جگہ نکل آئے گی۔

پانچ سو روپے سے دو ہزار تک کی اس میں ترقی ہے۔"

جنرل صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "ہاں، یہ جگہ قمر کے لئے بالکل موزوں ہے۔"

مگر قمر انگریز گورنمنٹ کی ملازمت کو غلامی سمجھتا تھا، اس لئے باپ کے سامنے تو خاموش ہو گیا۔ دلّی واپس آ کر ماں سے صاف کہہ دیا۔ "میں نوکری نہیں کروں گا، پریکٹس کرنا چاہتا ہوں، تاکہ کچھ وقت قوم و ملک کے لئے بھی کام کرنے کے لئے دے سکوں، آپ ابا جان سے کہہ دیجئے، مجھے ملازمت کرنے پر مجبور نہ کریں۔

انھوں نے میاں کو سمجھایا کہ "قمر جوان اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ اپنا بُرا بھلا سمجھتا ہے۔ ہم نے پڑھا دیا لکھا دیا، اپنا فرض پورا کر دیا، اب اپنے مستقبل کے بنانے کا ذمہ دار وہ خود ہے، چاہے جو کرے، اس کی مرضی کے خلاف آپ کو اس کو مجبور کرنا نہیں چاہیئے۔"

جنرل صاحب کو غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن بیوی کے سامنے کہہ ہی کیا سکتے تھے اور بات تھی بھی معقول —— تیوری پر بل ڈال کر خاموش ہو گئے۔

دلّی میں غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس لئے چھوٹی بہو صاحب حیدرآباد جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ پچھلے دو سال سے وہ گرمی میں بھی دلّی رہی تھیں۔ جنرل صاحب نے منجو بی کی شادی کے چند مہینے بعد پنشن لے لی تھی۔ مصارف حسبِ معمول تھے اور آمدنی اب کم ہو گئی تھی۔ اس لئے حیدرآباد کا سفر مجبوری سے ملتوی کرنا پڑا تھا۔

قمر نے شملے سے واپس آ کر خانگی حسابات دیکھے، گھر کی حالت پر نظر ڈالی۔ ان کو یہ پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ بلیماروں والی دونوں دکانیں اور رنگ محل کے پشت والی حویلی تیس ہزار کے عوض منجو بی کی شادی کے بعد رہن رکھ دی گئی ہیں سود صرف ایک سال تک ہی دیا گیا تھا۔ اور ڈھائی سال سے سود کی رقم

بھی چڑھ رہی تھی۔ قرضہ سینتیس ہزار تک پہونچ گیا تھا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ جنرل صاحب کی پنشن کے بعد اخراجات میں کمی کی جاتی۔ لیکن نہ میاں کو اس کا خیال تھا نہ بیوی کو اس کی فکر۔ ان دونوں نے جز رسی اور عاقبت اندیشی سیکھی ہی نہ تھی۔ چھوٹی بہو صاحب حسبِ عادت خرچ کیئے جاتی تھیں۔ اور جنرل صاحب کی داد و دہش بھی بدستور جاری تھی۔ چھمو ابھی ایسی سمجھدار نہ تھی جو ان کو سمجھاتی اور پھر بھلا چھوٹی بہو صاحب کب کسی کی سننے والی تھیں۔ساس نے اور بڑی جیٹھانی نے دو چار مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی کہ "اللہ رکھے تمہارا کچا ساتھ ہے۔ میاں کی صحت ٹھیک نہیں، اب ذرا ہاتھ روک کر اٹھاؤ۔"

لیکن ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا، جتنا بھی روپیہ آتا بے فکری سے خرچ کر دیتیں۔ بازار کا قرضہ ہر مہینے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

قمر نے ایک دن ماں کو خوش دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ "بھابی اماں! آپ نے چھوٹی آپا کی شادی پر جائداد گروی کی یہ اچھا نہیں کیا۔ بہتر تو یہ تھا کہ آپ دونوں دکانیں الگ کر دیتیں۔ اس طرح حویلی تو بچ جاتی۔ قرض لینا آسان ہے اور دینا مشکل۔ یہ مہاجن تو خون چوستے ہیں۔ سود بھی ان کا چند سالوں میں، اصل برابر ہو جاتا ہے۔ اس طرح لاکھوں کی جائداد کوڑیوں کے مول ان کو مل جاتی ہے۔"

چھوٹی بہو صاحب ٹھنڈا سانس لے کر بولیں۔ "میاں میں نے مجبور ہو کر یہ کیا۔ انور، تمہارے جانے کے چھ مہینے بعد ولایت جانے کی ضد کرنے لگا، آخر اس کو بھیجنا ہی پڑا۔ یوں بنک کا سارا روپیہ ختم ہوا۔ منجو کی شادی ٹھیری تو چار ہزار باقی تھے۔ بھلا بتاؤ اتنے تھوڑے روپے میں مَیں کیا کر سکتا تھا

وہ تو یوں کہو کہ جہیز میں نے پہلے ہی نک سے سکھ تک سب تیار کر لیا تھا۔ لیکن اوپر کے خرچ کو بھی تو درکار تھا۔ اور دو چار چیزیں جو ضروری رہ گئی تھیں۔ وہ بھی بنانی تھیں۔ بہن کی شادی پر تو پہلا کار تھا۔ روپیہ بھی ہاتھ میں تھا۔ میں نے بے دریغ خرچ کیا تھا۔ صرف کھانے کی فرد ہی گیارہ ہزار کی تھی۔ بارہ دن تو تمہارے باپ نے برات کو رکھا تھا۔ منجو بھی تو آخر میری ہی بیٹی تھی۔ اس کی شادی کیسے چپ چپاتے کر دیتی۔ پھر بھی زیادہ دھوم دھام میں نے نہیں کی، برات کو دو دن ہی رکھا۔ روپیہ بھی بہت دیکھ بھال کر اٹھایا۔ اس پر بھی دس ہزار سے اوپر ہی اٹھ گیا۔ تم اپنے باپ کو جانتے ہو دنیا بھر کے خدائی خوار خوشامدخورے ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ جو بھی سوال کرے یہ آنکھ بند کر کے دئے جاتے ہیں اپنے جوہری سے ایک مفت خورے کو ڈیڑھ ہزار کا زیور بنوا کر دیا۔ وہ تو لے کر ایسا غائب ہوا کہ اس کا پتہ نہ چلا۔ اس کا روپیہ بھی مجھے ہی بھرنا پڑا۔ ببن کے دونوں لڑکوں کے ختنے ہوئے، اس تقریب پر خالی ہاتھ کیسے جاتی۔ اس میں بھی چار ہزار کے قریب اٹھ گیا۔ غرض ادھر ادھر کا ملا کر بیس ہزار کا قرضہ ہو گیا تھا۔ پھر ہر مہینے تم دونوں بھائیوں کو ہزار روپیہ بھیجنا پڑتا تھا۔ اس لئے پہلے میں نے دکانیں رکھیں پھر حویلی۔ جب سے ان کی پنشن ہوئی ہے، میں تو خرچ کی وجہ سے حیدرآباد بھی نہیں گئی۔ دانت سے پکڑ کر اٹھاتی ہوں۔ جب بھی ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے باپ کا علاج الگ ہو رہا ہے، ان کی صحت جیسی ہو رہی ہے تم دیکھ رہے ہو۔ سینکڑوں روپیہ اٹھ رہا ہے، اور کوئی فائدہ نہیں۔"

قمر نے کہا۔" یہ تو ٹھیک ہے کہ ضروری اخراجات کو کم نہیں کیا جا سکتا لیکن نوکر ہمارے یہاں ضرورت سے بہت زیادہ ہیں، ان میں کمی ہونی چاہیئے۔

چھمّو دبی زبان سے بولی۔ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔"

چھوٹی بہو صاحب بیٹے کی بجائے چھمّو پر بگڑ کر بولیں۔ "اب تم ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہو، کفایت کر کے دکھاؤ تو جانیں۔"

قمر نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "بھابی امّاں! فضول غصّہ کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اب ہم سب کو سوچ کر اخراجات کو کم کرنا ہی ہوگا۔"

چھوٹی بہو صاحب اس معقول بات کا جواب کیا دیتیں۔ بڑبڑاتی ہوئی عصر کی نماز کو چلی گئیں۔

قمر نے باپ سے کہا۔ "میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ قرضہ دونوں دکانوں اور حویلی کو بیچ کر ادا کر دیا جائے۔ فی الحال کوئی اور صورت روپے کی ادائیگی کی نہیں ہے بلکہ اخراجات کے لئے کچھ روپیہ بنک میں ہونا بھی ضروری ہے۔"

جنرل صاحب تو فوجی سیدھے سادے آدمی تھے۔ انھوں نے بیٹے کی رائے کو مان لیا۔

قمر نے ایک کلاس فیلو دوست کے والد کو بیچ میں ڈال کر مہاجن سے سود کی نصف رقم کم کرائی اور ایک مہینہ دوڑ دھوپ کر کے حویلی اور دکانیں بیتالیس ہزار میں فروخت کر دیں۔ بیتیس ہزار کے قریب اصل اور سود ملا کر قرضے کا گیا۔ باقی دو ہزار روپیہ بازار کا دینا تھا، وہ دیا۔ اور آٹھ ہزار روپیہ بنک میں رکھ دیا۔ یوں قرض کی مصیبت سے تو نجات ہوئی۔ لیکن اتنی اچھی خاصی جائداد ہاتھ سے نکل گئی۔

جولائی کے آخر میں جنرل صاحب بمع بیوی بچوں کے حیدر آباد سدھارے قمر نے گھر کا انتظام چھمّو کے سپرد کیا۔ اس نے اپنی عمر سے زیادہ ہوشیاری سے خانہ داری کا کام سنبھال لیا۔ حیدر آباد پہنچ کر بھی جنرل صاحب کی سادگی

کی بدولت قمر کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

چھوٹی بہو صاحب کو باپ کے یہاں سے جو ترکے میں گاؤں ملا تھا اس کا حساب قمر لینے بیٹھے تو اکرم میاں نے جو جنرل صاحب کے رشتے کے بھتیجے ہوتے تھے، خوب غبن کی تھی۔ گاؤں میں جو پختہ حویلی تھی اس کو انھوں نے رہن کر دیا تھا اور آموں کے باغ کو بیچ ڈالا تھا۔ کاشتکاروں پر سختی کر کے نذرانے بھی خوب وصول کیے تھے۔ اُدھر جنرل صاحب کو پچھلی فصل پر انھوں نے اگاہی کا آدھا ہی روپیہ بھیجا تھا اور یہ لکھا تھا "کانگرس والوں نے کاشتکاروں کو بہکا دیا ہے وہ دیتے ہی نہیں میں کیا کروں۔"

غرضیکہ ان حضرت کو دو مہینے مغز مارنے کے بعد قمر نے نکالا اور ایک دیانتدار سن رسیدہ عزیز کے سپرد گاؤں کا انتظام کیا۔ جنرل صاحب نے قمر کے آنے کی خوشی میں اس فصل کا چوتھائی لگان کاشتکاروں کو معاف کر دیا۔

چھوٹی بہو صاحب کو مالی پریشانی کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا، تو انھوں نے قمر کے لیے دُلہن کی تلاش شروع کر دی۔

قمر نے جو ماں کا خیال اس جانب پایا تو چھمّو سے کہا۔ "بھابی اماں سے کہدو، ابھی میں یہ زریں طوق اپنے گلے میں ڈالنا نہیں چاہتا، ابھی تو میرے مستقبل کا مسئلہ سامنے ہے، جب تک میری معقول آمدنی ذاتی نہ ہوگی، میں شادی نہیں کروں گا۔ انور ابھی ولائت ہی ہیں۔ ابا جان کی صحت ٹھیک نہیں ہے، گھر میں آمدنی کم خرچ زیادہ ہے۔ اس حالت میں شادی کا خیال کرنا بھی بے وقوفی ہے۔"

ماں کو بیٹے کی معقول بات پر توجہ دینی ہی پڑی انھوں نے باقاعدہ تلاش تو چھوڑ دی مگر ہر محفل اور ہر شادی میں اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کو وہ اب بھی

نظر غور سے دیکھتی تھیں۔ جنرل صاحب کو بیوی سے بھی زیادہ بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ اپنے ہر عزیز اور دوست سے یہی کہتے تھے۔ "ہمارے قمر کے لئے کوئی اچھی لڑکی بتاؤ۔"

قمر نے پریکٹس شروع کر دی تھی۔ جنرل صاحب جب حیدر آباد میں ملازم تھے کوٹھی ان کو ملی ہوئی تھی، اب چھوٹی بہو صاحب دو مہینے تو اپنے میکے میں رہیں جب قمر نے یہاں رہنے کا ہی ارادہ کر لیا تو گلشن پلی پہ ایک خوبصورت مختصر بنگلہ لے لیا اور اس میں سب منتقل ہو گئے۔

قمر کی پریکٹس ابھی برائے نام تھی، جاننے والوں کے مقدمے تو وہ اکثر مفت ہی کرتے تھے۔ بس اتنا ہر مہینے مل جاتا کہ ان کا جیب خرچ نکل آتا تھا۔

جنرل صاحب کی طبیعت حیدر آباد آکر اور بھی مضمحل ہو گئی، اس لئے چھوٹی بہو صاحب تین مہینے بعد ہی گلشن کو قمر کے پاس چھوڑ کر دتی بمع چھمو کے چلی آئیں۔

---

(۱۷)

کوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن دھوپ کی تیزی اور ہوا بند ہونے کے باعث فضا گھٹی ہوئی تھی۔ چھمو کو لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا جوں جوں عمر بڑھتی گئی اس کا یہ شوق بھی ترقی کرتا گیا۔ مضمون نگاری کی مشق وہ بہت دنوں سے پوشیدہ طور پر کرتی رہتی تھی۔ لیکن کسی رسالے میں مضمون دینے کی ہمت اس لئے نہ ہوتی تھی کہ خاندان بھر میں انگلیاں اُٹھ جاتیں۔ قمر میاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ چھمو بہت اچھا لکھ لیتی ہے تو انھوں نے کہا "واہ بھلا تم رسائل کو اپنے مضامین کیوں نہیں دیتیں؛ اتنا اچھا تو لکھ لیتی ہو"

چھمو نے جب اپنا پہلا تاریخی مضمون ایک اردو کے مشہور رسالے میں دیا تو قیصر دلہن نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا "اوئی بُوا توبہ، غضب خدا کا اب کسی اور کو کیا کہیں، ہمارے یہاں کی بھی کنواری لڑکیاں اخباروں میں چھپنے لگیں"

بڑی بہو صاحب کو بھی چھمو کی یہ دیدہ دلیری بُری تو لگی مگر وہ اس کو اتنا چاہتی تھیں کہ صرف زیر لب ہی بڑبڑا کر رہ گئیں۔ زیادہ بُرا بھلا نہیں کہا۔ اس کے بعد چھمو باقاعدہ ملک کے معیاری رسائل میں مضامین اور کہانیاں دینے لگی۔

آج بھی وہ ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بلا کے حبس نے اس کی طبیعت مضمحل کر دی تھی۔ برقی پنکھے کے نیچے بھی پسینہ چلا آرہا تھا۔ اس بیہودہ موسم سے تنگ آکر پنسل اس نے ہاتھ سے رکھ دی۔ اور ایک رسالہ میز سے اُٹھا کر اس کو اُلٹنے پلٹنے لگی۔ بے بی تالیاں بجاتی آئی۔ "آہا انجو آپا آرہی ہیں، ہمارے لئے چاکلیٹ اور بولتی گڑیا تو ضرور لائیں گی۔ چھمو چونک کر بولی۔ بے بی تم سے کس نے کہا۔ بے بی چہکی۔ ابھی شاید بھیا کا تار آیا ہے چچی اماں کے پاس، وہ کل رات کو انجو آپا کو لے کر آرہے ہیں۔

چھمّو کے لئے یہ خبر بہت مسرور کن تھی کہ اس کی پیاری سہیلی پورے ایک سال کے بعد دہلی آرہی تھی۔ اس لئے اب اس سے لکھا جا رہا تھا نہ پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ آخر اُٹھ کر منجھلی بہو صاحب کے پاس جا کر اس خبر کی تصدیق کی اور پھر اپنی لڑکپن میں ساتھ کھیلی سہیلی سے ملنے کے دل خوش کن خیالوں میں کھو گئی۔

دوسرے روز رات کو انجو بی ریل سے اتر کر نانی کے سلام کو تھوڑی دیر کیلئے آئیں، کیونکہ اب وہ ایک رئیس کی بیگم تھیں، بھلا رنگ محل میں کہاں ٹھہر سکتی تھیں ان کے ساتھ پورا اسٹاف، نند اور منجھلے دیور بھی تھے۔ نواب سورج گڑھ نے اپنے ایک عزیز دوست راجہ کی شاندار کوٹھی مانگ لی تھی۔ نانی اور سب بزرگ بیویوں کو آداب کر کے انجو بی چھمّو سے خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملیں، اور صبح ہی آنے کا وعدہ کر کے کوٹھی سدھاریں۔

صبح نو بجے ابھی چھمّو غسل کر کے نکلی ہی تھی کہ انجو بی آگئیں۔ تھوڑی دیر اور سب سے ملنے باتیں کرنے کے بعد حسبِ عادت چھمّو اور انجو الگ بیٹھ کر باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ چھمّو نے اطمینان سے انجو کو دیکھا تو اس کی صورت بہت

اتری ہوئی نظر آئی، حالانکہ انجو نے بہت قیمتی آسمانی رنگ کی فرنچ ساڑھی اور اور سفید اعلیٰ ساٹن کا خوبصورت تراش کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ موتیوں کا ہلکا ہلکا زیور انجو کی دلکش صورت پر کافی پھبن دے رہا تھا۔ مگر منھ پر پاؤڈر کی گہری تہہ بھی جلد کو شگفتگی نہ بخش سکی تھی، رخساروں کی سرخی بھی ہلکی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے بجائے خمار کے پریشانی نمایاں تھی۔ ہونٹوں کی خشکی کو لپ اسٹک کا شوخ رنگ بھی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ البتہ جسم کافی گداز ہو گیا تھا۔ چھمو کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ انجو کی ازدواجی زندگی نواب، نواب صاحب کی رنگ رلیوں کی بدولت ناخوشگوار ہو گئی ہے۔ لیکن خود انجو نے کبھی اس کو خطوں میں ان واقعات کی تفصیل نہیں لکھی تھی، اس لئے چھمو نے انجو کے گلے میں باہیں ڈال کر محبت بھرے انداز سے کہا۔ اری میری پیاری یہ کیا ہو گیا نصرت علی خاں جو تمہارے اتنے شیدا اور عاشقِ زار تھے۔ اب انھوں نے یوں آنکھیں کیسے پھیر لیں۔ کسی نے سچ کہا ہے "مرد اور طوطے کا اعتبار کبھی بھی نہیں کرنا چاہیئے۔"

انجو ٹھنڈا سانس لے کر۔ "کیا بتاؤں چھمو کتنا حسرت ناک انجام ہوا ہے میری اس معصوم محبت کا جو میں نے ایک فریب کار کی باتوں میں آکر پہلی اور شاید آخری بار کی۔ کاش نصرت یوں مجھے لمبے لمبے خط نہ لکھتے اپنی محبت کے سنہری جال میں نہ پھنساتے۔ پھر میں انکی ہر حرکت کو برداشت کر لیتی جس طرح اور نوابوں کی بیویاں صبر کر لیتی ہیں، اگر نصرت تو صرف میرا شوہر ہی نہیں محبوب بھی تو ہے۔ شوہر کی بے وفائی تو برداشت کی جا سکتی ہے مگر محبوب کی بے رخی تو دل توڑ دیتی ہے۔ میرا دل بھی نصرت نے سنگِ جفا سے چور چور کر دیا ہے۔ ان ٹکڑوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کے سوائے اب

میرے پاس کچھ کرنے کو نہیں ہے، کاش یہ قیمتی لباس یہ بیش بہا زیور اور یہ سارا عیش و آرام لے کر صرف نصرت، مجھے وہ محبت دیدیں جس کا اقرار وہ اپنے خطوں میں کرتے تھے یا چند مہینے تک جیسے انھوں نے مجھ سے کی، میں نصرت کو پا کر سب کچھ دے سکتی ہوں اور سوکھے ٹکڑے کھا کر خوش رہ سکتی ہوں، پر آہ! اب میری خوشی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ آرائش و زیبائش کے سامان کو دیکھ کر میں مطمئن رہ سکتی ہوں۔ لیکن میں تو اب بھی طوعاً پہنتی ہوں، ہر وقت میرا دل روتا رہتا ہے، زیور اور لباس پہن کر خوش بھی کیسے رہ سکتی ہوں، جب ان کو دیکھنے والا ہی مجھ سے غافل ہے تو پھر یہ سب بیکار ہی ہیں۔

پھوپھو انجو کی یاس آمیز باتوں سے متاثر ہو کر۔ "مگر یہ نواب کو ہوا کیا؟ جو تم جیسی چاہنے والی بیوی کو یوں بھلا بیٹھے۔

انجو۔ "چاہنے کو تو اب بھی وہ میری چاہت کا دم بھرتے ہیں کبھی کبھی اپنی رات کی حرکات پر نادم ہو کر صبح میرے قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں۔ میرے لئے نئے نئے ڈیزائن کے بیش بہا زیور منگاتے ہیں۔ طرح طرح کے لباس تیار کراتے ہیں۔ اور اکثر کہتے ہیں کہ "انجو تم مقدس دیوی ہو اور میں تمہارا گنہگار پجاری"۔ مگر یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ روزانہ میں ان کی پسندیدہ ساڑیوں میں سے ایک ساڑی پہن کر اپنے کو زیوروں سے آراستہ کرتی ہوں اپنی زیب و زینت پر گھنٹوں صرف کرتی ہوں، اور اسی طرح بن سنور کر بالوں میں پھول سجا کر شام کی چائے پر ان کا انتظار کرتی ہوں۔ لیکن اکثر پہلے ہی اطلاع ملتی ہے "سرکار کے پاس تو باہر کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے وہ نہیں آسکیں گے"۔ میں تنہا ہی چائے پی لیتی ہوں۔ اور بہت دیر انتظار کرنے کے

بعد سیر کے لئے چلنے کو شاپور کو بھیج کر تقاضہ کراتی ہوں، وہ جواب لے کر آتا ہے۔ "شاپور، تم اپنی بہن کو لے کر سیر کر آؤ۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔" یا کبھی خوش قسمتی سے وہ آتے بھی ہیں تو ان کے ہمراہ ان کا چہیتا منظورِ نظر گلاب بھی آتا ہے۔ وہ بات مجھ سے کرتے ہیں، مگر ان کی نظریں گلاب کی بلائیں لیتی رہتی ہیں۔

میں خود ایسے موقعوں پر کہ گلاب بھی ان کے ساتھ ہو، سیر کو جانے سے انکار کر دیتی ہوں اور مخملی صوفے پر بنی سنوری گڑیا کی طرح اکتائی ہوئی سی بیٹھی دریچے سے باہر بے مصرف نظریں ڈالتی رہتی ہوں، اور اس زمانے کو یاد کرتی ہوں جب یہ نصرت میرے پانے کے لئے اتنے بے چین رہتے تھے۔

اسی طرح شام سے رات ہو جاتی ہے اور کوئی خواص یہ پیغام لا کر دیتی ہے۔ "سرکار آپ کو یاد کر رہے ہیں۔" میں بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر باہر جاتی ہوں لیکن یہاں کی محفل میرے لئے اور بھی کوفت کا باعث ہوتی ہے۔ ان کے ایک پہلو میں ان کا آوارہ مزاج شرابی دوست راج کمار ہوتا ہے۔ دوسری جانب میں بیٹھتی ہوں۔ سامنے عشوہ گر طوائف ناچ رہی ہوتی ہے۔ اور خوشامدی مصاحب نواب کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ گلاب شراب کے جام دیتا جاتا ہے، نصرت اور راجکمار فحش مذاق طوائف سے اور گلاب سے کرتے جاتے ہیں اور پیتے جاتے ہیں۔ میں اس وقت شرم سے زمین میں گڑی جاتی ہوں۔ راج کمار کی ہوس کار نظریں مجھے اپنے جسم پر پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اکثر مذاق کرتے وقت ترچھی نظروں سے مجھے دیکھتا جاتا ہے گویا اس کی مخاطب طوائف نہیں میں ہوں۔ مگر میرے محمود شوہر کو اس پر غصہ نہیں آتا۔ شراب خانہ خراب نے اس کی ساری غیرت و خودی

کی قدریں ضائع کر دی ہیں۔ اب وہ صرف ایک بدمست شرابی ہو کر رہ گیا ہے
میں تنگ آکر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد اس بیہودہ محفل سے اُٹھ آتی ہوں، اور کپڑے
بدل کر اکثر بغیر کھانا کھائے غم و غصے کی حالت میں بستر پر جا پڑتی ہوں اور کبھی
کبھی تمام تمام رات یونہی کروٹیں بدل کر گزار دیتی ہوں۔ صبح اُٹھ کر میں اپنے
معمولات میں لگ جاتی ہوں۔ نصرت دوپہر کو بارہ بجے تک غسل کر کے چائے
پی کر میرے پاس آتے ہیں۔ اس وقت وہ رات سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں
کہاں رات والا شرابی عیاش بے حس نواب اور کہاں یہ شریف بامحبت چاہنے
والا شوہر۔ نصرت کے یہ دو رُخ ایک دوسرے سے کتنے الگ ہیں۔ اس وقت
میرے شوہر کو میری ذرا سی تکلیف بھی گوارا نہیں ہوتی۔ میری ہر ادا کو وہ سراہتے
ہیں۔ سچ تو یہ ہے اس وقت کی نصرت کی چاہت مجھے پھر زندہ کر دیتی ہے۔
اور پھر میں اس کو جان سے زیادہ چاہنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ دو بجے ہم دونوں
مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے اور پندرہ بیس منٹ آرام لینے کے بعد
نصرت، ریاست کے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے اپنے آفس میں چلے جاتے ہیں
اور میں پھر دوسرے دن تک کے لئے تنہا رہ جاتی ہوں۔

چھمو اپنی پیاری سہیلی کی یہ المناک روداد سن کر دل تھام کر رہ گئی۔
"روپیہ یوں انسان کو پلٹ دیتا ہے۔ اس کو معلوم نہ تھا۔ اس نے عہد کر لیا
کہ کبھی کسی امیر کبیر کو وہ اپنی زندگی کا ساتھی نہ بنائے گی۔"

انجو شام کو چلتے وقت یہ وعدہ چھمو سے لیکر رخصت ہوئی کہ چار دن چھمو
انجو کے ساتھ جا کر رہے گی۔

چھمو حسب وعدہ دوسرے روز بعد صبح ہی انجو بی کے یہاں اپنی انا کی لڑکی کلثوم کو
لے کر پہنچ گئی۔

انجو بی اپنی چہیتی سہیلی کی آمد کی خوشی میں آج صبح ہی تیار ہو کر بیٹھ گئی تھیں دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ انھوں نے اپنے اے ڈی سی سردار بیتاب سنگھ اور دیوان منصور علی خاں کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ جب تک پھپھو بی یہاں ہیں آپ لوگ باہر ہی رہا کریں۔ روپے کی تو کمی نہ تھی دونوں وقت میز پر اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے ہوتے تھے۔ علن بھی بڑی بہن کے پاس آئی ہوئی تھی۔ لیکن اب چھمو کی نظروں میں یہ شاندار کوٹھی اور شاہانہ ساز و سامان اور انجو بی کے نفیس زرکار لباس اور بیش بہا زیور سب بے حقیقت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ سب کچھ تو تھا جس کے لئے انجو کی شاداب جوانی دن بدن کمہلائی جا رہی تھی۔

بظاہر انجو بی بہت خوش رہتی تھیں۔ ان کو اس کا پورا احساس تھا کہ چھمو کے علاوہ اور کوئی ان کا غم گسار نہیں ہے۔ ددھیال والے تو سب ہی اس شادی کے خلاف تھے اور ان کی شان و شوکت دیکھ کر جلے جاتے تھے۔ اسی لئے وہ اپنے کو مسرور اور شادکام دکھانے کے لئے اور بھی بہت اہتمام سے کام لیتی تھیں۔ صبح و شام نت نئے لباس پہن کر زیور سے سج کر کبھی خود کہیں ملنے جاتیں کبھی اوروں کو بلاتیں۔ سب کے سامنے بہت شگفتہ چونچال نظر آتیں۔ بات بے بات قہقہے لگاتی تھیں۔ غازہ، لپ اسٹک کا استعمال چہرے کو شگفتہ بنانے کے لئے بڑی فیاضی سے کرتی تھیں۔ ان کی سنگھار میز سامان آرائش کی خاص دکان معلوم ہوتی تھی۔ سگرٹ بھی اب وہ پینے لگی تھیں۔ چھمو کے آجانے سے انجو بی کا لڑکپن پھر واپس آگیا تھا۔ اب وہ تمام دن چھمو کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف اپنے حال سے بے خبر ہو کر دلکش ماضی میں کھو کر مگن رہتی تھیں۔ آگرے کی سیر بھی ہوئی اور قطب، حوض خاص پر پکنک بھی، سینما بھی دیکھا اور تھیٹر بھی۔ روزانہ دوپہر کو چھمو کمرہ بند کر کے پازیب

پہن کر ناچتی بھی تھیں، گاتی بھی تھیں۔ ان دنوں میں انجو بی اتنا ہنسی اور خوش رہیں کہ پورے سال کی کوفت دُور ہو گئی، ان کے رخساروں پر بھی سرخی آ چلی تھی، اور آنکھوں کے حلقے بھی کم ہو گئے تھے۔

وہ اپنے میاں سے منجھلے دیور کے لئے رشتہ تلاش کرنے کے واسطے کہہ کر دلی آ گئی تھیں۔ سوریج گڑھ میں تنہائی سے ان کا دل گھبراتا تھا۔ سوتیلی ساس الگ محل میں رہتی تھیں۔ اس لئے انھوں نے سوچا دیورانی بیاہ لائیں، تو کچھ تو دل بہلے گا۔ اور چھمّو سے صلاح کر کے بہن بی کی بڑی نند کی لڑکی نسیمہ کے لئے منصور علی خاں کا پیغام انھوں نے حیدرآباد بھجوا دیا۔

نسیمہ چھمّو کی ساتھ کی کھیلی نک سک سے درست سانولی سلونی ذہین اور سمجھ دار اور معقول لڑکی تھی۔

دہلی آئے ہوئے انجو بی کو ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا، لیکن ان کا دل یہاں لگا ہوا تھا۔ اور کچھ دن وہ اور یہاں رہنا چاہتی تھیں۔ نواب صاحب ہر خط میں بیوی کو آنے کی تاکید لکھتے۔

منصور علی خاں کا پیغام نسیمہ کے لئے منظور ہو چکا تھا۔ انجو بی نے سردار پرتاب سنگھ کو منظوری کا خط آتے ہی ایک بھاری بنارسی ساڑی، بلاؤز، ہیرے اور یاقوت کی انگشتری، نیکلس اور پانچسو روپے مٹھائی کے دیکر حیدرآباد بھیجدیا۔ وہاں سے دولھا کے لئے انگوٹھی، بھاری بنارسی مندیل، دو درجن رومال اور ڈھائی سو روپے مٹھائی کے لئے آئے۔

سردار پرتاب سنگھ کی واپسی کے بعد انجو بی بادل ناخواستہ جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ ان کی سالگرہ آ گئی۔ شادی کے بعد یہ ان کی دوسری سالگرہ تھی اور یہ اچھا موقعہ ان کو اپنی شان و شوکت میکے میں دکھلانے کا تھا۔ انھوں نے

پورے خاندان کی بیگمات کو مدعو کیا۔ چھمو تو ایک دن پہلے ہی سے براجمان ہو گئی تھی۔ رات گئے تک عطن کے ساتھ مل کر وہ خوب گاتی بجاتی رہیں۔ صبح ہی نواب صاحب کا محبت اور طول طویل دعائیہ جملوں سے بھرا ہوا تار انجو کو ملا۔ ان کے لمبے لمبے محبت آمیز خطاب بھی آتے تھے۔ ان خطوں کو دیکھ کر اب انجو کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ آجاتی جیسے زخمِ دل کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہوں۔ یوں تو وہ روز ہی قیمتی لباس پہنتی تھیں لیکن اس دن تو عباسی رنگ کی ایسی قیمتی زرکار ساڑی پہنی کہ اس پہ آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ یاقوت کے زیور اور موزوں سنگھار نے انجو کے حسن کو دو آتشہ کر دیا۔ منصور علی خاں نے بھاوج کو چمپیلی اور گلاب کے پھولوں کا بہت بڑا کنٹھا پہنایا۔ پارٹی کوٹھی کے وسیع لان میں ہوئی تھی۔ چونکہ بیگمات میں سے اکثر پردے والیاں تھیں اس لئے بوائے بٹلر میزیں لگا کر ہی ہٹ گئے تھے۔ انجو بی کی یورپین مصاحب مس احمد کی نگرانی میں بی مغلانی اور شبو سب کام کرا رہی تھیں۔ عطن اور عزیزہ مہمان بیویوں کی تواضع میں مصروف تھیں۔ انجو بی اپنی بھاری ساڑھی سنبھالے ایک مخملی کوچ پر بیٹھی تھیں اور ان کے ارد گرد خاندان کی بزرگ بیگمات یا اور بہت معزز مہمان خواتین ہی بیٹھی تھیں۔

منجھلی بہو صاحب کو اپنی ساس اور جیٹھانی کی خاطر سے فرصت نہ تھی۔ جو اور طرف توجہ کرتیں۔ بڑی بہو صاحب بڑے بھتیجے کی بیوی تھیں۔ انجو کی ہزاروں خوشامدوں سے وہ پہلی مرتبہ آج اس کے یہاں آئی تھیں تو پھل اور مٹھائی سے بھری دو کشتیاں ساتھ لائی تھیں۔ بھلا بیٹی کے گھر خالی ہاتھ کیوں جاتیں، اور اکیس روپیہ تحفے کے الگ دئے۔

سکندر زمانی بیگم نے اپنے توشک خانہ سے منگوا کر ایک شال کشمیری

کام کا رومال دیا اور چھوٹی بہو صاحب نے کنول کے پھول کی صورت کا چاندی کا عطردان دیا!

چھمو نے دیوانِ غالب کا مصور نسخہ دیا تھا۔ اور بھی حسبِ حیثیت سب نے تحفے یا روپے دئیے۔ انجو بی حسبِ معمول ہنس ہنس کے بیگمات سے باتیں کر رہی تھیں۔ سگرٹ کے کش پر کش لگا رہی تھیں۔ اور گفتگو میں کسی نہ کسی طرح نواب سورج گڑھ کا ذکر وہ لے آتی تھیں۔ "سرکار نے یہ کہا، سرکار نے وہ کہا۔ سرکار مجھے اتنا چاہتے ہیں۔ سرکار کے خط برابر بلانے کے آرہے ہیں میں ابھی دلّی اور ٹھیرنا چاہتی ہوں۔ لیکن سرکار نے لکھا ہے کہ "انجو اب تم کو گئے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ جلدی آؤ میں تمہارے بغیر بہت گھبرا رہا ہوں" اور ان باتوں کی سننے والیاں انجو کو ایک خوش نصیب بیگم سمجھ کر رشک کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن کون جان سکتا تھا اس حسرت نصیب نازنین کے اس دکھ کو جو اپنی محرومیوں پہ بجائے رونے کے ہنسنے کے لئے مجبور تھی۔

---

(۱۸)

جنرل صاحب کی صحت ویسے تو مسلسل پانچ سال سے خراب تھی، لیکن اب چار مہینے سے تو دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ ذیابیطس کے نامراد مرض نے رفتہ رفتہ ان کی طاقت ختم کر دی۔ علاج بھی انھوں نے باقاعدہ نہیں کیا۔ جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ لیکن مرض میں افاقہ نہیں ہوا۔ قمر باپ کو دیکھنے کے لئے کورٹ کی تعطیل ہوتے ہی دلی آئے تھے۔ بیس روز رہ کر چلے گئے۔ انور اکتوبر کے آخر میں پانچ سال ولایت رہ کر آگئے تھے اور باپ کی تیمارداری بہت اچھی طرح کر رہے تھے۔ لیکن جنرل صاحب کی صحت کو اچھی غذا اور دوا بحال کر سکی نہ دیکھ بھال ہی۔ بلکہ دسمبر شروع ہوتے ہی سردی بڑھی تو ان کا کمزور جسم سخت سردی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جاڑے کی پہلی بارش ہوتے ہی ڈبل نمونیہ ان کو ہو گیا۔ دو ڈاکٹر صبح و شام دیکھنے آتے رہے اور انور ہر وقت باپ کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ جنرل صاحب کے دونوں خدمتگار باری باری رات بھر جاگتے تھے، دن بھر نرس بھی رہتی تھی۔ چھوٹی بہو صاحب کو ان دنوں کنگھی چوٹی کا ہوش تھا نہ خریداری کا۔ صدقے خیرات نذر نیاز اپنے چاہنے والے شوہر کے لئے سارے جتن کر رہی تھیں۔

سکندر زمانی بیگم کے اوسان بھی بجا نہ تھے۔ جب سے جنرل صاحب کو نمونیہ ہوا تھا کہتیں کچھ تھیں منھ سے نکلتا کچھ تھا۔ رات دن جانماز پہ بیٹھی یہ دُعا کرتی رہتی تھیں "اللہ اس کی بیماری مجھے دیدے، میں اس کی بلائے کر مر جاؤں۔"

چار دن بعد ذرا جنرل صاحب کی طبیعت سنبھلی۔ سب کی جان میں جان آئی۔ معالج ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں، طاقتِ برداشت ان کے جسم میں بالکل نہیں ہے۔ اگر پھر نمونیہ کا حملہ ہوا تو جانبر ہونا ممکن نہیں۔ احتیاط پوری کی جا رہی تھی۔ مگر قدرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ ترمدی کے شروع میں نمونیہ جنرل صاحب کو پھر ہوا۔ اور اس حملے کے دو دن بعد جنرل صاحب خدا کے یہاں سدھائے۔ بوڑھی ماں حسرت سے مرنے والے کو تکتی رہ گئی۔ چہیتی بیوی لاڈلے بچوں کو چھوڑ کر، قمر میاں کی شادی کا ارمان لیکر جنرل صاحب رخصت ہو گئے۔ دنیا ایک نیک سخی سچے اور بہادر انسان سے خالی ہو گئی۔

کیا اندازہ ہو سکتا ہے اس بدنصیب ماں کے غم کا جس نے بھری جوانی میں بیوگی کا داغ کھایا اور تین ننھے بچوں کے سہارے اپنی غم نصیب زندگی گزاری۔ اس بیوی کے دل سے کوئی چاہنے والے شوہر کا غم پوچھے جو بیاہ کرنے کے بعد سے اچھے سے اچھا کھاتی اور بہتر سے بہتر پہنتی رہی۔ جو شوہر کے راج میں سونے میں پیلی اور موتیوں میں سفید رہتی تھی۔ اور وہ بدنصیب بچے کیسے شفیق باپ کا ماتم نہ کرتے جس نے ان کے آرام کے لئے اپنا دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لی تھی۔

بن بی باپ کے انتقال کے دو گھنٹے بعد میاں کے ہمراہ دلی پہنچیں، وہ باپ کی بہت لاڈلی تھیں، ان کا غم کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ چھوٹی

بہو صاحب کا سرخ و سفید رنگ غم کے مارے زرد ہو گیا تھا۔ چاند سا منہ فق تھا۔ ان کے بکھرے ہوئے بال، سفید کپڑے اور ننگے ہاتھوں کو دیکھ کر ہر آنے والی دھاڑیں مار مار کر روتی تھی۔ سکندر زمانی بیگم میں غم کے مارے رونے کا بھی دم نہ رہا تھا۔ بڑے بیٹے کے مرنے سے ہی وہ غمگین رہتی تھیں چھوٹے کے جانے سے تو بالکل نیم جاں ہو گئیں۔ بڑی بہو صاحب چھمو کو سنبھالے بیٹھی تھیں، وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔

انور ننگے سر ننگے پاؤں کبھی اندر آ کر ماں کو سمجھاتا کبھی باہر جاتا۔ منجھلے صاحب کو منور مرزا سنبھالے ہوئے تھے، ان کی فرطِ الم سے حالت تباہ تھی، اس طرح کانپ رہے تھے جیسے لرزے کا بخار چڑھا ہوا ہو۔

منجھلی بہو صاحب سارا انتظام اندر کا سنبھال رہی تھیں اور روتی بھی جاتی تھیں۔ باہر جرنل صاحب کے داروغہ ان کے آخری سفر کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ مرنے والے سے گویا کسی کا رشتہ ہی نہیں رہتا ادھر سانس نکلا ادھر جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ سکندر زمانی بیگم پیٹتی رہیں، چھوٹی بہو صاحب بین کرتی رہیں اور جرنل صاحب کے جانے کا سامان ہوتا رہا۔ غسل کے بعد جرنل صاحب کی میت کو دیوان خانے کے وسیع برآمدے میں رکھ دیا۔ دو حافظ تلاوتِ کلام پاک کرتے رہے۔ اندر محل میں بھی بہت ساری بیویاں قرآنِ پاک پڑھ کر مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچا رہی تھیں۔ دو بجے تک سب عزیز و اقارب، دوست احباب جمع ہو گئے اور جنازہ اٹھایا گیا بیگمات کو دیوان خانے میں بلا کر صورت دکھا دی گئی تھی۔ جرنل صاحب کی صورت اپنے دونوں بھائیوں سے اتری ہوئی تھی۔ لیکن مرنے کے بعد ان کی پیشانی چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرے نہیں بلکہ سو رہے ہیں۔

پلنگ کو پہلے منجھلے صاحب، منور مرزا، قیصر مرزا اور انور نے کلمہ پڑھ کر اٹھایا منجھلے صاحب برابر کانپ رہے تھے اس لئے ان کو اب بھی ان کا منشی سنبھالے ہوئے تھا۔ پلنگ کے پیچھے پیچھے چھٹن روتا ہوا جا رہا تھا۔ قدرت نے اس بارہ سال کے بچے کو بھی یتیم کر دیا تھا۔ جنازے کا اٹھنا تھا کہ سکندر زمانی بیگم (ہائے مرے دولھا کی سواری چلی) کہہ کر بیہوش ہو گئیں۔ چھوٹی بہو صاحب کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور وہ غم کے مارے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ بین بی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں، اور سب کے رونے اور بین کرنے سے پورا محل گونج رہا تھا۔ چھمو کو بہت رونے سے متلی سی ہونے لگی۔ وہ نڈھال پلنگ پر پڑی تھی۔ چھ سال کی بے بی سب کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگی تھی۔ منجھلی بہو صاحب نے اس کو گود میں لے کر پیار کر کے کہا "تم کیوں روتی ہو بے بی؟" تو وہ آنکھیں مل کر بولی۔ "بھابی اماں، دادی اماں، بڑی آپا، چھمو آپا سب رو رہی ہیں، ابا جان مر گئے، ہمیں بھی رونا آتا ہے۔" منجھلی بہو صاحب نے کہا۔ "ارے تمہارے ابا جان تو قمر میاں ہیں۔ یہ تو قمر، ریاں اور بین کے ابا جان مرے ہیں۔" ننھی بے بی کے آنسو تھم گئے، اور وہ پھر اپنی ہم سن لڑکیوں میں جا کے کھیلنے لگی۔

چھوٹی بہو صاحب نے جنازے کے ہمراہ پانچ من گندم کئے تھے۔ اور شام کو سوا من کی خمیری روٹی اور دو من سیر حلوے پر فاتحہ دلا کر غریبوں کو تقسیم کیا گیا۔

جنرل صاحب کو اپنی خاندانی ہڑوارے قطب صاحب میں رکھا گیا۔ مغرب کے بعد سب مرد واپس آئے۔ منجھلے صاحب ماں کے گلے لگ کر بہت روئے۔ تین بھائیوں میں اب ایک وہ غمزدہ ماں کے سامنے رہ گئے تھے۔ ماں بیٹے کی نظر میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ پھر منجھلے صاحب نے انور اور چھٹن

کو گلے لگایا۔ بہن چھو کو پیار کیا۔ سکندر زمانی بیگم کو چھوٹے بیٹے کے غم نے ادھ موا کر دیا تھا وہ صدمے کے مارے دوہری ہوگئیں، مگر موت انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے بے چاری جی رہی تھیں۔ رات کو کھانا قیصر مرزا کی سسرال سے آیا۔ دوسرے روز ملکہ بیگم نے کھانا دیا۔

دلی کے دستور کے مطابق سارے قریبی عزیز اندر باہر جمع تھے۔ پھول قمر میاں کے آنے بغیر کیسے ہوتے۔ حیدرآباد دُور بھی تو بہت ہے، اس لئے چوتھے دن پھول کئے گئے۔

قمر میاں تیسرے دن شام کو پہنچے تھے۔ ان کو حیدرآباد باپ کے مرنے کی خبر نہیں دی گئی تھی۔ لکھا تھا سخت علیل ہیں۔ جب ان کو دلی پہنچ کر یہ علم ہوا کہ اب چاہنے والا باپ اس دنیا میں نہیں ہے تو دامنِ صبر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماں کے قدموں میں سر رکھ کر ان کی ہچکی بندھ گئی۔ ماں نے اپنے آنسو پونچھ کر بیٹے کو گلے سے لگایا۔ اب یہی بیٹا ان کی زندگی کا سہارا تھا۔

منجو بی صبح ہی پہنچی تھیں۔ صالحہ بیگم، قیصر دلہن، بنو بی، منور مرزا کے سسرال والے سب ہی آگئے تھے۔ قمر کو اس کا بہت ملال تھا کہ باپ کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ بے بی قمر کے آنے سے بہت خوش تھی اور ہر ایک سے چہک کر کہتی تھی آہا ہمارے بھائی جان آگئے۔

چھو بھائی کے گلے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ مگر کیا اس رونے سے اس کے پیارے ابا جان اب واپس آسکتے تھے۔ یہ رونا تو عمر بھر کا رونا تھا۔

چھوٹی بہو صاحب نے جس حوصلے سے دونوں لڑکیوں کی شادیاں کی تھیں اُسی طرح میاں کا مرنا بھی کر رہی تھیں۔ موت کا دروازہ یوں بھی ہر ایک کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ پھر جرنل صاحب کے احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا، جو بھی سنتا

دوڑا چلا آتا۔ شہر سے زیادہ پردیسی لوگ تھے۔ چھوٹی بہو کے میکے والے تو غیر تھے ہی۔ اپنے پرائے سب اس اچھے انسان کو یاد کر کے روتے تھے۔ جس کی مثال اس دنیا میں اب کم ملے گی۔ جو بات کا پورا دھن کا پکا تھا، جو ساری عمر ہر طرح اپنے عزیزوں دوستوں کی خدمت کرتا رہا اور جو کبھی کسی کی امارت، دولت سے مرعوب نہیں ہوا۔ تمام عمر خلق خدا کی خدمت کرنی جس کا شیوہ رہا ہو۔ چھوٹوں بڑوں کئی دن تو منوں کھانا پکا تھا۔ اندر باہر آدمی ہی آدمی تھے۔ اس کے بعد چہلم تک لوگوں کا تانتا لگا رہا۔

چہلم پر سب جمع ہوئے۔ قمر و انور کی رسم دستار بندی ہوئی۔ سب عزیزوں دوستوں نے ان دونوں کو دوشالے دئے۔ چہلم کے دوسرے دن سب رخصت ہوئے۔ منجو بی کا پاؤں بھاری تھا۔ اسقاط کے تین سال بعد یہ پھر خوشی کی صورت دکھائی دی تھی۔ اس لئے وہ شملہ سدھاریں۔ نین بی بھی عدت تک ماں کے پاس رہیں۔ قمر میاں نے چہلم کے بعد جو جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اب بینک میں تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سب جرنل صاحب کی علالت اور مرنے میں اٹھ گیا۔ پنشن جرنل صاحب کی ان کے مرنے کے بعد بند ہو گئی تھی۔ بس اب دلی کی جائداد کے چار سو روپے ماہوار آتے تھے یا گاؤں کے ڈھائی ہزار سال رہ گئے تھے۔ قمر کی پریکٹس ابھی برائے نام تھی۔ ان کا اپنا خرچ بھی اس میں بمشکل پورا ہوتا تھا ماں کی کیا مدد کر سکتے تھے۔ چھٹن صاحب کی تعلیم کا خرچ تھا، بے بی کو بھی ایک سال سے اسکول میں قمر میاں نے داخل کر دیا تھا۔ اتنا سارا خرچ اور آمدنی کم، کیونکر کام چلے گا یہ فکر چھوٹی بہو صاحب کو دن رات کھائے جاتا تھا۔ میاں کی زندگی بھر انھوں نے بے فکری سے روپیہ اٹھایا تھا۔ ان پر میاں کا غم بھی تھا اور خرچ کا فکر بھی۔ اب وہ

سوچتی تھیں کاش انھوں نے پہلے خیال کیا ہوتا اور کچھ پس انداز کر کے رکھتیں تو اس وقت کام آتا۔ لیکن صرف سوچنے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ قرض پر زیادہ دن گزارہ کیسے ہو سکتا تھا۔

ماں بیٹے نے صلاح کر کے ان دو سو اشرفیوں میں سے جو جنرل صاحب نے شاہان مغلیہ کے زمانے کی بہت شوق سے خریدی تھیں پچاس اشرفیاں فروخت کیں تاکہ کچھ مہینے تو گزارہ ہو سکے۔ نوکروں کا پورا عملہ تھا جنرل صاحب کے بوڑھے بیرا کی پنشن کر دی گئی۔ دونوں خدمتگاروں اور خانساماں کو الگ کر دیا گیا۔ ڈیوڑھی کا دربان، باورچی، داروغہ جی باہر رہے۔

محل میں اناؤں، ماماؤں کی پوری فوج تھی۔ قمر میاں کی انّا اور انور کی انّا کو اب چھوٹی بہو صاحب نے رو دھو کر رخصت کیا۔ بی مانی، عنبر، لیلا اور صلاتی رہیں۔ مودی خانے والی غفورن بوا کو منجو بی کے ساتھ کر دیا تھا۔ مین بی کی انّا ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ نوکر کم ہوئے تو خرچ بھی آدھا رہ گیا۔ گھر کا سب انتظام کر کے قمر میاں حیدر آباد سدھارے۔ ان کی کوشش سے جنرل صاحب کی وفات کے تین مہینے بعد ان کی ایک مہینے کی بقیہ پنشن بھی مل گئی اور چھوٹی بہو صاحب کو ڈھائی سو روپیہ ماہوار الاؤنس ملنے لگا چھٹن صاحب کی تعلیم ختم ہونے تک ان کے لئے بھی سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا تین مہینے کا جو چڑھ گیا تھا وہ بھی ایک دم مل گیا۔ انور میاں ابھی تک چھوٹی بہو صاحب کے پاس رہتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ پانچ سال تک ولائت میں متواتر ناکامیاب ہوتے رہنے کے باعث زود رنج ہو گئے تھے۔ چھوٹے سے بات بات پر الجھتے اور اکثر ماں سے بھی ردوکد کرتے رہتے تھے۔ چھوٹی بہو صاحب کو اب خرچ کفایت شعاری سے کرنا پڑتا تھا

وہ میاں اب کہاں تھے جو اُن کی تیوری پر بل دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے، اور ان کی خوشی کے لئے روپے کی پرواہ مطلق نہ کرتے تھے۔ پھر بھی اپنی عادت سے مجبور تھیں۔

منجو بی کے یہاں شادی کے چھ سال بعد بچہ ہونے والا تھا۔ آخر کچھ تو اس کی تیاری ان کو کرنی تھی۔ بچے کے لئے انواع اقسام کے کپڑے رضائیاں دلائیاں، نہالچے، سوزنیاں سلوا رہی تھیں۔ عدت ختم ہوتے ہی وہ منجو بی کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ بی مائی کو بڑھاپے کا جوڑا دیکر دائی کے ہمراہ اپنے جانے سے ایک ہفتہ پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ آپ سب سامان تیار کر کے مع گچھو اور سیمہ بی کے شملہ پہنچیں۔ انور میاں پہنچا کر دلّی واپس چلے گئے۔ چھوٹی بہو صاحب کے شملہ پہنچنے کے دسویں دن خدا نے منجو بی کو ایک تندرست بچی کی ماں بنا دیا۔

منجو بی کی ساس چار دن پہلے پہنچی تھیں۔ ان کو لڑکا ہونے کی خوشی تھی، لڑکی ہونے کی خبر سے ناک بھوں چڑھا کر خاموش ہو گئیں۔ مگر چھوٹی بہو صاحب کے لئے تو یہ لڑکی لڑکوں سے بڑھ کر تھی، خدا نے بچے کی شکل تو دکھائی۔ میاں کو یاد کر کے افسردہ ہو گئیں۔ ان کو منجو کے صاحب اولاد ہونے کا بڑا ارمان تھا۔

صالحہ بیگم بھی شملہ میں ہی تھیں۔ برابر چچا زاد بہن سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ جس دن سے چچی آئی تھیں اکثر آتیں اور تمام دن یہاں رہتیں۔ اب بھی بچی ہوتے ہی آ گئیں۔ چھوٹی بہو صاحب اگر میاں زندہ ہوتے تو خدا جانے اس خوشی کے موقعہ پر کیا کچھ اٹھا تیں۔ اب بھی انھوں نے بچی کو ٹھنڈے گرم ملا کر پچاس فراک، دس بھاری بھاری کرتے ٹوپی اور سوزنیاں، پوتڑے، نہالچے، کوٹ گرم، روئی کی صدریاں، اونی چھ سوٹ

دُلائیاں، رضائیاں دئے، دو کنستر گھی کے میوہ اور زچہ خانے کا سب سامان دیا۔ دائی کو نال کشائی کے پچیس روپے دئے۔ چھٹی والے دن، نواسی کو فیروزے کی چھوٹی چھوٹی ڈنگریاں اور موتیوں کی دو لڑی دی۔ منجو کو بھاری بنارسی ساڑی اور ان کی ساس کو بنارسی دوپٹہ دیا۔ چھٹی کے دوسرے روز عقیقہ ہوا۔ بچی کا نام رعنا سلطان رکھا گیا۔ چھوٹی بہو صاحب منجو کو ایک مہینے کا چلّہ نہلا کر دلّی واپس آگئیں۔ اور ان کے دلّی پہنچنے سے پندرہ دن قبل کلکتہ جا چکا تھا۔ دار وغہ جی سے معلوم ہوا کہ شملہ جاتے وقت جو سونے کا زیور انور میاں کی معرفت چھوٹی بہو صاحب نے بینک میں رکھوایا تھا، وہ ساڑھے تین ہزار میں فروخت کر کے کلکتہ سدھار گئے ہیں۔

یہ خبر سن کر چھوٹی بہو صاحب سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ کیونکہ اس زیور میں ان کی پازیب، چھپکوں اور کنٹھے کی جھانجن جوڑیوں، بے بی کی جھانجن کے علاوہ جبن بی اور منجو بی کے جھانجن بھی شامل تھے۔ یہ دونوں پچھلی مرتبہ اس لئے جھانجن یہاں رکھوا گئی تھیں کہ جھانجن پہنتے اب انھیں شرم آتی تھی، اور کوئی اچھے نمونے کا زیور بنوانے کا ارادہ تھا۔ چھ ہزار سے زیادہ کا زیور انور نے اونے پونے فروخت کر دیا تھا۔ اپنا تو خیر گیا جو گیا چولہے میں، مگر بیاہی بیٹیوں کا زیور اب وہ کیسے واپس کر سکیں گی، اور پھر اتنے کبھی دوبارہ بنوانا مشکل ہی تھا۔ پہلا زمانہ ہوتا تو اتنے زیور کی پرواہ چھوٹی بہو صاحب کو نہ ہوتی۔ اب تو ہر طرف خرچ ہی خرچ تھا۔ پیسے کا نام نہ تھا، وہ اب اس وقت کو پچھتا رہی تھیں، جب یہ زیور بینک میں رکھوایا۔ ان کا سب زیور ہمیشہ بڑی بہو صاحب کی تحویل میں رہتا تھا۔ کیونکہ وہ کبھی دہلی رہتیں، اور کبھی حیدرآباد جاتیں۔ بڑی بہو صاحب گھر سے بہت کم نکلتی تھیں، اس لئے

منجھلی اور چھوٹی دونوں دیورانیوں کا زیور ان کی تجوری میں بند رہتا تھا۔
اتفاق کی بات کہ اشرفیاں جب نکالیں تو چھوٹی بہو صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ
اپنے ہی جیسے بچے لڑکیوں کے لئے بھی بنوا دیں اس لئے پاؤں کے سیٹ اور جیٹھانی
سے نکلوا کر رکھ لئے تھے۔ جب شملہ جانے لگیں تو ان کے جانے سے کچھ دن پہلے
بڑی بہو صاحب گرمی سے گھبرا کر منور مرزا کے پاس بہادر گڑھ جا چکی تھیں۔
انھوں نے ساس سے کہا۔ اماں جان یہ زیور آپ رکھ لیں۔ سکندر زمانی بیگم
نے کہا "اے دلہن میرے ہوش تو اس اب رکھنے ڈھکنے کے لائق نہیں۔ آئے
دن روپے پیسے کھوتی رہتی ہوں۔ انور نے کہا۔ بینک میں رکھوا دیجئے۔ آکر
نکال لیجئے گا۔ اور انھوں نے بیٹے کی صلاح پہ عمل کیا۔ آخر وہ بھی تو ان کا لڑکا
تھا کوئی غیر تو نہ تھا۔ پھر کیسے اعتماد نہ کرتیں۔

بین بی اور انجو بی کو پھوپھو سے یہ خبر ملی تو انھوں نے ماں کو لکھا "بھابی اماں
آپ ذرا فکر نہ کریں آپ نے اور ابا جان نے ہمیں ہمیشہ دیا ہے ایک چیز اگر ہماری
گم ہوگئی تو کس بات کا غم ہے۔ آپ کا ہی دیا ہوا تو تھا۔ انور بھی چھوٹا ہے اچھا ہے
اس کے کام آگیا"

انور میاں کے لئے کلکتہ جانا اچھا ہی ہوا۔ ایک اچھا سا فلیٹ لے کر
وہ دو مہینے خوب ٹھاٹ سے رہے۔ باپ کا نام اپنی لیاقت اور اچھی طرح
رہنے، کھلانے پلانے کی وجہ سے ایک انگلش فرم میں ان کو چھ سو روپے ماہوار
کی نوکری مل گئی۔ پھر سو روپے سال کی ترقی تھی۔ اور ڈھائی ہزار تک کا گریڈ
تھا۔ چھوٹی بہو صاحب کو نوکر ہونے کے بعد انور نے خط لکھا اور بے اطلاع
زیور فروخت کرنے کی معافی مانگی تو چھوٹی بہو صاحب کو یہ اطمینان ہوا کہ زیور
اتنا ہاتھ سے گیا تو بلا سے لڑکا تو ٹھکانے سے نوکر ہو گیا۔ اور اب انور کی

جانب سے وہ بے فکر ہوگئیں۔ قمر کی پریکٹس بھی اب خاصی چل نکلی تھی، اپنا اور چھٹن کا خرچ وہ نکال لیتے تھے۔ ماں کو بھی جب دلی آتے وہ چار سو دے جاتے تھے۔ چھٹو کے لئے بھی ضرور ساڑی یا کوئی اور چیز لاتے۔ چھٹو کی شوخی شگفتگی باپ کے مرنے کے بعد بہت کم ہوگئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح دھڑلّے بے پرواہ خوش دل چھٹو نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت گھر کے حساب کتاب ماں کی دلجوئی میں گزرتا تھا۔

انجو بی جرنل صاحب کا انتقال جب ہوا تو بمبئی کے ہسپتال میں تھیں، بچہ ہونے کے لئے انھوں نے آپریشن کرایا تھا اس لئے نہ آسکیں۔ دسہرے پر پھولپور جاتے ہوئے وہ دلی ٹھہریں۔

چھٹو باپ کے غم میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے سہیلی سے زیادہ حال احوال نہیں پوچھا۔ بظاہر وہ خاصی خوش اور موٹی نظر آرہی تھی گویا اس نے اب اپنی اس زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔

---

(۱۹)

شاہرخ مرزا اب اپنی عمر کی اٹھارہ منزلیں پوری کر چکے تھے اور تین مہینے سے تعلیم ختم کرنے کے بعد بھوپال پور واپس آ گئے تھے۔ واپس آتے ہی ان کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ شاہرخ کی نسبت تو مرنے والی ماں نے اپنی بھانجی یعنی صالحہ بیگم کی بڑی لڑکی فریدہ سے ٹھہرائی تھی۔

سوا مہینے کا چلّہ نہا کر جب صالحہ بیگم دلّی آئی تھیں تو ذکیہ بیگم نے فریدہ کو گود میں لے کر کہہ دیا تھا: "آپا بیگم یہ تو میرے شاہرخ کی دُلہن ہے۔ میں نے دعا مانگی تھی اللہ کرے لڑکی ہو۔ اللہ نے میری دعا سُن لی۔"

صالحہ بیگم نے مسکرا کر منظوری دیدی تھی اور ذکیہ بیگم روز اس ننھی سی بچّی کو گود میں لے کر بیٹھ جاتیں اور سہرے سہاگ گواتیں۔ فریدہ تھی بھی بہت پیاری صورت کی۔

لیکن افسوس ذکیہ بیگم کو تو شادی کیا منگنی بھی باقاعدہ کرنی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ بھری جوانی میں ناشاد و نامراد رخصت ہوئیں۔ نواب فرید دل بخت کا خیال تھا کہ انجوبی کی شادی کے ساتھ شاہرخ مرزا کی منگنی بھی بہت دھوم سے کریں گے۔ لیکن انگوٹھی دُلہن کی بن کر آئی تو نواب صاحب کو انتقال کئے

بھی بیس روز ہو چکے تھے۔

شاہرخ مرزا کی مسند نشینی کی تقریب جب ہوئی تو بڑے نواب صاحب نے یہ انگوٹھی بذریعہ پارسل فریدہ کے لئے بھیج دی۔ شاہرخ مرزا اپنی منسوبہ کو جو اُن کی خالہ زاد بہن بھی تھی بہت چاہتے تھے، اس کی ہر ادا پہ جان دیتے تھے۔ رشتے کنبے کی بات تھی اس لئے کوئی خاص پردہ نہ تھا۔ جب بھی صالحہ بیگم دلی آتیں شاہرخ مرزا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر دلی آ دھمکتے۔ پھر جہاں بھی فریدہ بیٹھی ہوتی وہاں پہنچ جاتے۔ بے چاری چھوٹی سی لڑکی گھبرا جاتی تھی اور شرمانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ لیکن بھلا یہ حضرت کہاں ماننے والے تھے۔ خالہ کی خوشامد کر کے کبھی ان کو لے کر کوٹلہ جاتے کبھی قطب۔ فریدہ بھی برقعے میں ملفوف شرمائی لجائی ساتھ ہوتی تھی۔ شاہرخ مرزا بات کرتے تھے چھوٹی بہن نوشابہ سے لیکن ان کا روئے سخن ہوتا فریدہ کی جانب تھا۔ غرضکہ شاہرخ کا رومان فریدہ کے ساتھ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ فریدہ کی شمع حسن پر نوعمر نواب شاہ رخ پروانہ وار فدا تھے۔ پھر بھلا تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیوں نچلے بیٹھتے۔ اپنی ہونے والی دلہن کے لئے بیش بہا قیمتی زیورات اور نفیس نت نئے لباس تیار کرا رہے تھے۔ مہمانوں کی جو اس موقعہ پہ شریک ہونے والے تھے لمبی چوڑی فہرست بنائی گئی تھی۔ ایک اور محل فریدہ کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ بڑے نواب صاحب کو بھی پوتے کی خوشی منظور تھی۔ انھوں نے بھی اس کی شادی کے لئے کافی روپیہ جمع کر لیا تھا اور جو حکم شاہرخ مرزا دیتے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

صالحہ بیگم بھی بہت دنوں سے جہیز فریدہ کا بنا رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ مری بیٹی کسی طرح اپنی بڑی بہن سے کم نہ رہے۔ صالحہ بیگم کے میاں کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی اور یہ اس ریاست کی بیگم تھی جس کے وہ دیوان

تھے۔ صالحہ بیگم کے میاں کی خوشی نہ تھی کہ ابھی اپنی کمسن لڑکی کی شادی کریں، وہ کہتے تھے چھوٹی عمر کی شادیاں ہمیشہ صحت کو برباد کر دیتی ہیں۔ فریدہ تھی بھی نازک اندام اور عمر ابھی اس کی پندرہ سال کی ہی تھی۔ لیکن جب پھول پور کا دیوان خریطہ بڑے نواب صاحب کا لے کر آیا تو صالحہ بیگم نے میاں کو اصرار کر کے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے راضی کر ہی لیا۔ اور دیوان صاحب نے با دلِ ناخواستہ نومبر کی پچیس تاریخ شادی کے لئے دیدی۔ تاریخ کا ٹھہرنا تھا کہ مبارک سلامت کے شور سے پھول پور کا قلعہ گونج اٹھا۔ ریاست کے قوال اور طوائفیں روزانہ مبارکبادی کے ترانے گاتے تھے۔ رات کے بارہ ایک بجے تک یہ محفل فرخ محل میں جمی رہتی تھی۔ بیگمات بھی پردے کے پیچھے سے گانا سنتی رہتی تھیں۔ ڈومنیاں بھی بنوبی کے محل میں شام کو اکثر سہرے سہاگ گانے آجاتی تھیں۔ شاہرخ مرزا اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ہی قیصر دلہن، بنوبی، عظمیٰ، ستارہ کو لے کر دلی آگئے۔ منجھلی بہو صاحب بھی ان کے آتے ہی پھول پور ہاؤس میں آگئیں، لباس اور زیور سب ان کی رائے سے تیار ہو رہے تھے۔ نومبر کے پہلے جمعہ کو ریت کا سرخ تامی رکا جوڑا سب رشتے دار خواتین کو جمع کر کے قطع کیا گیا۔ سات سہاگنوں نے بیٹھ کر اس جوڑے کو سیا۔ ڈومنیوں نے خوب گلا پھاڑ کر مبارکبادیاں گائیں اور جھولی بھر انعام پایا۔ سارے کنبے میں مٹھائی بٹی اور باقاعدہ شادی کا کام پھیل گیا۔ لیکن انسان سونچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ یہاں یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ صالحہ بیگم کا خط آیا کہ فریدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں پچیس نومبر کو شادی ہونا ناممکن ہے۔ اس کو آخر اکتوبر میں تین دن مسلسل بخار رہا۔ اس کے بعد برابر ڈیڑھ ہفتے سے روزانہ دوپہر کو حرارت ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں شادی کیسے کی جا سکتی ہے۔ لڑکی کی صحت ٹھیک نہیں۔

اور اس کے کمزور جسم کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

خالہ کا یہ خط پاتے ہی شاہرخ مرزا بہت پریشان ہو گئے۔ فریدہ کی علالت سے ان کے دل کا چین رخصت ہو گیا۔ رات انھوں نے آنکھوں میں کاٹی اور صبح ہی خالہ کو تار دیا کہ میں کل فریدہ کو دیکھنے کے لئے پہنچ رہا ہوں۔ اور ربیع شاپور کے رات کی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔ صبح سات بجے ٹرین پہنچی، تو دیوان صاحب خود اپنے ہونے والے داماد کی پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ انھوں نے شاہرخ مرزا کو گلے لگایا اور پھر شاپور کو۔ ان دونوں کو ساتھ لیکر گھر گئے۔ دیوان صاحب کی دو منزلہ عالیشان کوٹھی بھی اتنی وسیع تھی کہ پورا محل معلوم ہوتی تھی۔ یہ پہنچے تو صالحہ بیگم اطلاع ملتے ہی بھانجے سے ملنے کے لئے آ گئیں۔ اور دونوں بھانجوں کی پیشانیاں چومیں، اور چٹا چٹ بلائیں لیں۔

شاہرخ مرزا نے پہلا سوال یہ کیا کہ "خالہ اماں فریدہ اب کیسی ہیں؟"

صالحہ بیگم مسکرا کر "گھبراؤ نہیں۔ اچھی ہیں۔ اللہ پوری شفا دے۔ بڑی دھان پان لڑکی ہے۔ موسم بدل رہا ہے۔ شاید اسی لئے اس کی طبیعت پر اس تبدیلی کا اثر ہوا۔ چلو چائے پیو۔"

شاہرخ مرزا نے کہا۔ "میں پہلے فریدہ کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

صالحہ بیگم۔ اے میاں اب آئے ہو تو فریدہ کو بھی دیکھ ہی لینا۔ ابھی تو وہ سو کر اٹھی ہے۔ ہاتھ منھ دھو رہی ہوگی۔ تمہارے خالو کو آفس جانے کی جلدی رہتی ہے۔ آٹھ بھی بج چکے، آؤ ناشتہ کر لو۔ شاہرخ مرزا بادلِ ناخواستہ ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ لیکن ان کا خیال فریدہ کی جانب ہی رہا۔ خالہ خالو کی باتوں کا ہوں ہاں کر کے بیدلی سے جواب دیتے رہے اور انھوں نے ناشتہ

بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔ البتہ شاپور مرزا کی پوری توجہ ناشتے کی جانب تھی۔ اور ہر چیز کی تعریف کر کے کھانے میں مشغول تھے۔ فریدہ کی گورنس نے آکر کہا۔
"فریدہ بی بی کا ناشتہ یاقوت لے چلو" اور شاہرخ مرزا نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا۔" خالہ اماں میں فریدہ کو اب تو دیکھ آؤں"۔

صالحہ بیگم۔ تو یہ تم نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور کھڑے ہو گئے۔ اچھا جاؤ دیکھ آؤ۔ اور شاہرخ مرزا نوشابہ اور شاپور کے ہمراہ فریدہ کے کمرے میں گئے۔

وہ گہرے نیلے رنگ کے گرم لباسِ شب خوابی پر سرخ دو شالہ اوڑھے بیٹھی آج کا اخبار دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے نگاہ اٹھائی تو شاہرخ مرزا سے لڑ گئی اور اس نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

شاہرخ مرزا فریدہ کی مسہری کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گئے اور اس کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔" کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ اس بے موقعہ علالت نے سارا پروگرام درہم برہم کر دیا۔ میں خوش تھا کہ اب کچھ دن بعد میرے تاریک گھر کو تم منور کر دو گی۔ مگر ابھی فلک کج رفتار کو یہ منظور نہیں۔

فریدہ منھ سے تو کچھ نہ بولی۔ البتہ اس کے لبِ لعلیں پر اک حیا آمیز تبسم رقص کرنے لگا۔

شاہرخ مرزا نے دیکھا۔ فریدہ کا نازک جسم اور بھی کاہیدہ ہو گیا ہے۔ اس کے چمپئی رنگ میں سرخی کے بجائے زردی جھلک رہی ہے، اور مخمور آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہیں۔ چونکہ وہ شاہرخ مرزا کی موجودگی سے بے طرح گھبرا رہی تھی اور شرم کے مارے سمٹی جا رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی شرمیلی منسوبہ کو اور

زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے اس کے ہاتھ کو لبوں سے لگا کر یہ کہہ کر کمرے سے نکل آئے۔ "خدا تم کو جلد صحت دے اور ہم پھر باقاعدہ مل سکیں"۔

شاپور اور فریدہ دونوں سگے بہن بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ اس لئے شاپور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ملا کر فریدہ کو ہنساتا رہا۔ نوشابہ کے ساتھ ہی شاہرخ مرزا پھر خالہ کے پاس آ گئے۔ دیوان صاحب بھی بیوی کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد وہ تو دفتر چلے گئے۔ اور شاہرخ مرزا صالحہ بیگم سے فریدہ کے علاج کے متعلق پوچھنے لگے۔ انھوں نے کہا نواب صاحب کا خاص ڈاکٹر فریدہ کا معالج ہے، اس کا خیال ہے خون کی کمی کے باعث فریدہ کو حرارت ہوتی ہے۔ اور کوئی فکر کی بات نہیں۔ فولاد کے انجکشن اس کو دئے جا رہے ہیں۔ مکمل آرام اور تبدیلِ آب و ہوا کی ڈاکٹر نے ہدایت کی ہے۔ نواب صاحب بمع بیگم صاحب کے آئندہ ہفتے بمبئی جا رہے ہیں۔ وہاں کا موسم بھی معتدل ہوگا، یہاں تو اب سردی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بڑی بہن فریدہ کو اپنے ساتھ لے جانے کو کہتی ہیں، یقین ہے، سمندری ہوا سے اس کی صحت بالکل بحال ہو جائے گی۔

شاہرخ مرزا "ہاں خدا ان کو صحت دے، کیسا رنگ میں بھنگ اس وقت ہوا ہے۔ شادی کی تمام تیاریاں ہو چکی تھیں۔ اور یہ بیمار ہو گئیں۔

صالحہ بیگم بولیں۔ اے میاں، جب تک حکمِ خدا نہ ہو بندہ کیا کر سکتا ہے۔ میں نے تو کتھا تک پکوا لیا، چھالیہ بھی کتروا لی۔

لیکن اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ خدانکردہ اگر یہ لڑکی شادی کے بعد بیمار ہوتی تو تمہارے خالو میرا جینا دوبھر کر دیتے، وہ تو پہلے

ہی ابھی شادی کرنی نہیں چاہتے تھے۔ یہی کہے جاتے تھے، ابھی اس کی عمر بہت چھوٹی ہے اور کمزور سی لڑکی ہے۔ تم بھی فضول پریشان ہوتے، اچھا ہے کہ کچھ مہینے میں اس کی صحت بحال ہو جائے گی۔

شاہرخ مرزا دوسرے دن شام کو دتّی آ گئے اور چار دن بعد پھول پور مع بیگمات واپس چلے گئے۔

بڑے نواب صاحب نے جب پوتے سے شادی کے ملتوی ہونے اور فریدہ کے بمبئی جانے کی خبر سُنی تو بولے بیٹا! تم ابھی بچّہ ہو۔ تمہارے خالو دراصل تم سے اپنی لڑکی کی شادی کرنا نہیں چاہتے۔ بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر انھوں نے ہاں کر لی، ورنہ اتنی معمولی سی بیماری کے لئے شادی روکنا کیا ضروری تھا۔ موسم جب بدلتا ہے، نزلہ زکام بخار اکثر ہو ہی جاتا ہے۔ کچھ دن بعد لڑکی کی طبیعت بحال ہو جاتی۔ بھلا منگنی ہوئی لڑکی کو بہن کے ساتھ بھیجنے کی ان کو کیا ضرورت ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ نواب ریاض رنگین مزاج ہے۔ بڑی بہن تو اس کی بیوی ہے، سالی پر بھی اس کی نظر ہے۔ صحت ذرا فریدہ کی خراب ہوئی، تو اس کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ اپنے ڈاکٹر کو سکھا دیا ہوگا کہ تبدیلِ آب و ہوا کا مشورہ دے۔ اس طرح فریدہ ساتھ جا سکتی ہے۔ صالحہ بیگم تو سیدھی ہیں انھیں بھلا ان چالوں کی کیا خبر۔ وہ ریاست تو ان باتوں کے لئے ہمیشہ سے بدنام ہے اسی نواب ریاض کے باپ میرے دوست تھے۔ ان کا طریقہ یہی تھا کہ ایک بہن سے شادی کرتے تھے، چند سال بعد اگر چھوٹی سالی اچھی ہوئی تو وہ بھی یونہی محل میں داخل ہو جاتی تھی۔ دیکھ لینا یہی اب ہوگا۔ بھلا بیٹا باپ کے نقشِ قدم پر کیوں نہ چلے گا۔ اب فریدہ کا خیال تم چھوڑ دو۔ اس سے تمہاری شادی کبھی بھی نہ ہو سکے گی۔ ویسے بھی ایک غیور خوددار انسان ایسی لڑکی

سے کبھی شادی کرنی پسند نہیں کرے گا جو ان مشتبہ حالات سے گزری ہو۔

نادان متلون مزاج شاہرخ مرزا دادا کی اس گفتگو سے گھبرا گئے۔ شرم اور غصے سے ان کا منہ سرخ ہو گیا۔ اور غضب آلود لہجے میں بولے ـ "میری منگیتر نواب ریاض کے ساتھ ہرگز نہیں جائے گی۔ میں ابھی خالو جان کو تار دیتا ہوں کہ فریدہ کو بمبئی جانے کی اجازت میں نہیں دے سکتا۔"

بڑے نواب صاحب نے دیکھا کہ ان کا وار سادہ لوح پوتے پر بھرپور پڑا ہے۔ آہستہ سے بولے۔ اگر انھوں نے تمہارا کہنا نہیں مانا تو بات بھی جائیگی۔ اور شاہرخ نے بھرائی ہوئی آواز سے بات کاٹ کر کہا تو میں یہ منگنی توڑ دوں گا کسی کی پرواہ نہیں کروں گا۔"

بڑے نواب صاحب کا مقصد حل ہو گیا۔ وہ کچھ خاندانی سیاست کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ فریدہ پھول پور کی بیگم بنے۔

شاہرخ مرزا نے اپنے سکریٹری کو بلا کر تار کا مضمون خالو کے لئے لکھوایا اور تاکید کی کہ ابھی یہ تار دے آؤ۔

تیسرے دن صبح تار کا جواب آگیا۔ دیوان صاحب نے لکھا تھا۔ "فریدہ کے جانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور ڈاکٹر کا مشورہ یہی تھا اس لئے وہ کل رات کو اپنی بہن کے ساتھ بمبئی گئی۔"

شاہرخ مرزا یہ تار پا کر غصہ سے نیم پاگل ہو گئے، ان کا تمام جسم غصہ کے مارے بید کی مانند کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور دماغ بالکل درہم برہم ہو رہا تھا۔ کتنی دیر تک تو غصے میں بھرے ٹہلتے رہے۔ پھر اپنی خواب گاہ میں مسہری پر گر کر جو رونا شروع کیا تو آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے دو روز یونہی گزر گئے، نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ بس روئے جاتے تھے۔

آخر جس لڑکی کو لڑکپن سے اپنا سمجھا تھا جس کی اتنے دن تک پرستش کی تھی اس سے یکایک تعلق توڑ لینا کیسے ممکن تھا۔ دل اور دماغ میں جنگ ہو رہی تھی، دل کہتا تھا کہ بھلا اس دلربا صورت کو میں کیسے بھول سکتا ہوں جس کو بالے پن سے میں نے اپنا سمجھا ہے۔ دماغ کہتا تھا کہ یہ خودداری کے خلاف ہے کہ جو چیز اپنے قبضے میں نہ ہو اس کا خیال رکھا جائے۔ بڑے نواب صاحب قریب کی ایک ریاست میں کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے، دوسرے دن شام کو واپس آئے۔ تو معلوم ہوا کہ نواب شاہرخ دو دن سے کمرے میں بند ہیں۔ گھبرائے ہوئے آئے اور گلے لگا کر کہا "بیٹا مردوں کی طرح حوصلہ و ہمت سے کام لو، اس طرح رونا دھونا مردوں کو زیبا نہیں۔ اور اگر نواب ریاض کو یہ معلوم ہوگا تو وہ اور تم پہ قہقہے لگائے گا۔ بھلا ان باتوں سے کیا فائدہ وہ کرو جس سے یہ قصہ ہی جائے۔ اور نواب شاہرخ مرزا نے مسہری سے اُٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ ریذیڈنٹ کو خط لکھ دیا۔ "میرے خالو دیوان صاحب کو باضابطہ اطلاع بھیج دیجئے کہ چند وجوہ کی بنا پر میں یہ منگنی اب توڑنے پر مجبور ہوں، جو میرے والد مرحوم نے کی تھی۔"

محل میں جب یہ خبر پہنچی تو قیصر دلہن کے لبوں پر تو مسکراہٹ کھیلنے لگی اور عطن بیچاری حیران رہ گئی۔ کچھ دیر بعد حواس بجا ہوئے تو ایک خط نانی کو لکھا دوسرا خالہ کو۔ صالحہ بیگم کے تو ہاتھوں کے طوطے بھانجی کا خط پا کر اڑ گئے۔ میاں کو بلا کر کہا "دیکھو، تم نے میرا کہنا نہ مانا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر شاہرخ مرزا منع کرتے ہیں تو لڑکی کو بمبئی مت بھیجو۔ ان کی ددھیال والے یہ چال چل رہے ہیں۔ ہر وقت لڑکے کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ نواب کی شادی ننھیال میں ہو۔"

دیوان صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔ "چلو اچھا ہی ہے اگر منگنی ٹوٹنے پر خیر گزرے۔ تمہارا بھانجا بالکل بے وقوف ہے۔ بُرے بھلے کی اس کو تمیز نہیں ہے۔

صالحہ بیگم جز بز ہو کر "واہ خوب تم نے بھر منہ کہہ دیا۔ بچپنے کی لگی نسبت ٹوٹ جانی کوئی اچھی بات ہے۔ میرے تو حواس باختہ ہو رہے ہیں"

دیوان صاحب "میں تو غنیمت سمجھتا ہوں اگر ابھی یہ معاملہ ختم ہو جائے تو۔ ورنہ فریدہ محض تمہاری حماقت کی بدولت ساری عمر روتی رہے گی۔ نہ اب تمہاری وہ بہن زندہ ہیں، جنھوں نے بڑے ارمان سے مانگا تھا۔ نہ نواب فریدوں بخت ہیں جن کی نظریں فریدہ کے ساتھ پھرتی تھیں۔ ان حالات میں تو یہ شادی نہ ہونی ہی ٹھیک ہے"

صالحہ بیگم بہت صلح کُل اور بُردبار بیوی تھیں۔ لیکن اس وقت ان کا دل درست تھا نہ دماغ کام کر رہا تھا۔ میاں سے اُلجھ پڑیں "ہاں تم تو خدا سے چاہتے ہو کہ میرے بھانجے سے فریدہ کی شادی نہ ہو، شروع ہی سے مین میخ نکال رہے ہو۔ اگر لڑکی بمبئی نہ جاتی تو کیا ہو جاتا۔ طبیعت تو اس کی اللہ رکھے اب ٹھیک ہی تھی۔ لڑکے کو بھی ضد ہو گئی کہ تم نے جان بوجھ کر اس کے منع کرنے پر بھیجا۔ آخر وہ بھی ابھی لڑکا ہی ہے۔ کونسا چالیس پچاس برس کا مرد ہے جو سمجھ کی باتیں کرے۔

میاں نے دیکھا بیوی غصے میں ہیں۔ اس وقت کوئی بات بھی نہیں سُنیں گی۔ خاموش اٹھ کر باہر چلے گئے۔ صالحہ بیگم پہلے تو بیٹھی بہن بہنوئی کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں۔ پھر انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ ماں کے پاس دہلی جائیں۔ شام کی ٹرین سے نوشابہ کو ساتھ لے کر مغلانی اور دادا دفر کے ہمراہ دلّی روانہ ہو گئیں۔ منجھلی بہو صاحب عظمیٰ کا خط پا کر بہت پریشان

تھیں۔ جیٹھانی دیورانی سے مشورہ کر رہی تھیں کہ کیا کریں، بنا بنایا کھیل بڑے نواب صاحب کی بدولت بگڑ گیا تھا کہ صالحہ بیگم پریشان خاطر پہنچیں۔ ماں کے گلے لگ کر خوب روئیں۔ ذکیہ کو یاد کر کے بہت دیر تک دونوں ماں بیٹیاں آنسو بہاتی رہیں، نہ وہ مرتیں نہ یہ ہوتا۔ جب ذرا دل ٹھہرا تو بڑی بہو صاحب چھوٹی بہو صاحب سے مشورہ کر کے منجھلے صاحب نے شاہرخ مرزا کو تار دیا۔ "تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں جلدی یہاں آؤ۔" تار پا کر شاہرخ مرزا نے بڑے نواب صاحب سے جا کر کہا، نانا جان نے بلایا ہے، میں کل دلّی جاؤں گا۔ وہ مسکرا کر بولے، تمہاری ٹوٹی منگنی کو جوڑنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ میرا جو فرض تھا تم کو سمجھا دیا۔ تم خود عاقل ہو بالغ ہو، جو چاہو کرو۔ شاہرخ مرزا نے غمگین آواز سے کہا، میں سب سمجھتا ہوں۔ بار بار بات کیسے بدل سکتا ہوں جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب تو ضابطے میں بات گئی۔ بھلا اب کیا صورت ہو سکتی ہے۔ چلا جاؤں گا مگر اس معاملے میں کوئی کچھ بھی کہے میں نہیں مانوں گا۔

دلی پہنچ کر شاہرخ مرزا نے پھول پور ہاؤس میں غسل کر کے چائے پی اور منجھلے چچا شہباز مرزا کے ساتھ رنگ محل گئے۔ بھلا نانی خالہ شہباز مرزا کے سامنے کیا بات کرتیں۔ یہ تو مخالف پارٹی کے ایک فرد تھے۔ گو شہباز مرزا کا اس قصے سے زیادہ تعلق نہیں تھا وہ تو حسبِ عادت ہر ایک بات میں ہاں میں ہاں ملانے کے عادی تھے۔ اس معاملے میں بھی انھوں نے باپ نے جو کچھ کیا بلا سوچے سمجھے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ بہرحال وہ اس وقت شاہرخ مرزا کے ساتھ محافظت کے لئے پیرین کرآئے تھے۔ نانی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور صالحہ بیگم حسرت سے بھانجے کا منھ

تکتی رہیں۔ منجھلے صاحب باہر سے آئے تو شہباز مرزا کو لے کر صحن میں ٹہلنے اور باتیں کرنے لگے۔ ان کے باہر جاتے ہی منجھلی بہو صاحب نے نواسے سے پوچھا۔

"میں یہ کیا سن رہی ہوں شاہرخ! تم نے ریزیڈنٹ کو یہ لکھ دیا کہ خدانکردہ منگنی توڑ دی جائے؟"

شاہرخ نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "جی ہاں"۔

منجھلی بہو صاحب بگڑ کر بولیں۔ شاباش بیٹا شاباش! کوئی وجہ تو بتاؤ۔ کس قصور پر چاہنے والی خالہ کو یہ سزا دی۔ مری ماں کا بھی منھ تم کو یاد نہ رہا۔ نہ میرا لحاظ تم نے کیا۔

شاہرخ مرزا کا دل غم سے اس وقت پھٹا جا رہا تھا۔ بمشکل رک رک کر انھوں نے کہا۔ میں کیا کروں نانی اماں، جب دوسرے لوگ ہی ایسا چاہیں تو میں نے خالو جان کو تار دیا کہ بمبئی فریدہ کو نہ بھیجا جائے۔ مگر انھوں نے میرے کہنے کی پرواہ نہیں کی۔ میری منگیتر کو بغیر میری مرضی کے کیوں بھیجا گیا۔ میں بھی رئیس ہوں۔ نواب ریاض کی ریاست بڑی ہی۔ مگر میں ان کا دیا نہیں کھاتا میں کیسے گوارہ کر سکتا ہوں کہ میری منگیتر یوں ایک بدنام رنگین مزاج نواب کے ساتھ سیر و تفریح کرتی پھرے۔

منجھلی بہو صاحب (غصے سے سرخ ہو کر) توبہ کرو توبہ! نواب ریاض کوئی غیر تو نہیں ہے، بہنوئی ہے، اور وہ بھی کافی بڑا۔ فریدہ اس کی گودیوں میں کھیلی ہے۔ ایسی بات منھ سے نکالتے تم کو شرم آنی چاہیئے۔ بڑی بہن اگر فریدہ کو کچھ دن کے لئے لے گئی تو ہرج ہی کیا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ تم نہیں بول رہے ہو۔ تمہارے دادا کا جادو تمہارے سر پہ چڑھ کر بول رہا ہے۔

صالحہ بیگم پہلی مرتبہ بھانجے سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "مرے چاند! میں نے

توجب تم گئے تھے تم سے فریدہ کے بمبئی جانے کا ذکر کر دیا تھا۔ اگر تم کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ بڑی بہن کے ساتھ جائے۔ مجھ سے کہدیتے، میں کسی نہ کسی طرح ٹال دیتی، فریدہ کو نہ جانے دیتی۔ مگر یکایک تم کو یہ خیال کیوں آیا۔

منجھلی بہو صاحب طنزیہ لہجے میں بولیں۔ اے یہ کیا چیز ہیں، اصل میں تو ان کے ددھیال والے یہ نہیں چاہتے کہ فریدہ پھول پور کی بیگم بنے اور فرخ بھائی کو تو اللہ واسطے کا بیر مجھ سے ہو گیا ہے۔

شاہرخ نے کہا آپ خواہ مخواہ دادا جان کا نام لے رہی ہیں انھوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں ہی اب ان حالات میں فریدہ سے شادی کرنی نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں ایک خود دار انسان کی طرح ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس پر مجھے پورا اختیار حاصل ہو۔ ہر وقت نواب ریاض سے ٹکرانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ خالو جان کی نظروں میں میری وقعت بالکل نہیں ہے۔ وہ اپنے داماد کو بڑا رئیس سمجھ کر اس کی خاطر ہمیشہ میری بات کو ٹالیں گے اور یہ مجھے منظور نہیں۔ اس منگنی کو توڑنے کا جو صدمہ مجھے ہے کاش میں اس کو لفظوں میں بیان کر سکتا اور اس کا بھی مجھے احساس ہے کہ خالہ اماں اور آپ دونوں کو اس سے کتنا رنج پہنچا ہے۔ فریدہ کی محبت کبھی میرے دل سے نہیں نکلی، مگر اپنے وقار کی خاطر ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرنا ہی ہو گا۔

شہباز مرزا نے دروازے پر آکر آواز لگائی۔ چلئے نواب گیارہ بج چکے۔ ابھی آپ کو راجہ سیکری کے یہاں کھانے پہ جانا ہے۔

شاہرخ مرزا ایک دم خالہ نانی کو آداب کر کے چچا کے ساتھ چلے گئے اور یہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔

شاپور مرزا علی گڑھ سے کرسمس کی تعطیل میں آئے تو انھوں نے بھی بڑے بھائی

کو بہت سمجھایا کہ فضول ضد چھوڑ دو، یہ سب باتیں بالکل لغو ہیں۔ اپنی اتنی اچھی منگیتر کو محض کہنے سننے سے چھوڑ دینا حماقت ہے۔ فریدہ تو بہت شرمیلی طبیعت کی لڑکی ہے، اور بھلا خالو جان جیسا جہاندیدہ انسان خدانخواستہ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ نواب ریاض کی نظر خراب ہوتی تو وہ اپنی لڑکی کو کیوں ان کے ساتھ بھیج دیتے۔ مگر شاہرخ مرزا نے ایک نہ مانی۔

فریدہ بمبئی ایک مہینہ رہ کر تندرست ہو کر واپس آ گئی تھی۔ اس کے رخسار کے گلاب پھر کھل گئے تھے اور چھریرا جسم ذرا گداز ہو کر اور بھی دل رُبا ہو گیا تھا اس کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو اسے اس بے وقوف انسان پر بہت غصہ آیا۔ جس کو اپنی خالہ زاد اور لڑکپن کی منسوبہ پر اعتماد نہیں تھا۔ جس نے اس پر شک کر کے اس کی دوشیزگی کے وقار کی توہین کی تھی۔ اس محبت کے بجائے جو اس کے دل میں شاہرخ کے لئے تھی غم و غصے نے لے لی اور اس نے نوشابہ سے کہہ دیا اگر اب امی جان اور پاپا جان بھی چاہیں تو میں شاہرخ سے جو مجھ پر مشتبہ نظریں ڈالتا ہے شادی نہیں کروں گی اور اپنی سنگھار میز پر سے نواب شاہرخ کی تصویر ہٹا دی۔ لیکن شاید اپنے دل سے اس سادہ لوح نوجوان کے تصوّر کو وہ نہ ہٹا سکی تھی۔ کیونکہ کبھی کبھی سرد آہ بیساختہ اس کے لبوں پر آ جاتی تھی۔

صالحہ بیگم فریدہ کی منگنی کے چکّر میں آ کر بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ادھر تو انھوں نے ہزاروں روپیہ فریدہ کے شاندار جہیز بنانے میں صرف کر دیا تھا اس کا انھیں افسوس تھا۔ ادھر وہ سمجھتی تھیں کہ منگنی ٹوٹنے میں ان کے میاں کا بھی ہاتھ ہے، نہ وہ بھیجتے فریدہ کو نہ شاہرخ مرزا کو غصہ آتا۔

دونوں میاں بیوی میں آئے دن اسی بات پر جھگڑا ہوتا۔ بیوی کہتی کہ تم نے جان بوجھ کر یہ منگنی تڑوائی، اور میاں کہہ دیتے چلو یوں ہی سہی، بلیں

تمہارے بیوقوف بھانجے کے ساتھ اپنی اتنی پیاری لڑکی کی شادی کر کے اس کو تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اور صالحہ بیگم روتی ہوئی میاں کے پاس سے اُٹھ جاتیں۔ ان بیچاری کا رنج کرنا بھی بجا تھا۔ کٹلری اور تمام چاندی کے سامان پر جو فریدہ کے لئے بنا تھا پھول پور کا ریاستی نشان بنا ہوا تھا جس چیز پہ ان کی نظر پڑ جاتی آنسو نکل پڑتے۔ ادھر منجھلی بہو صاحب نے رو رو کر اپنی صحت تباہ کر لی تھی، دن رات ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔ نواسے کو پیار سے 'غصے سے' ہر طرح سمجھا کر تھک کر بیٹھ رہی تھیں۔ مگر شاہرخ مرزا کو بڑے نواب صاحب نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ وہ بس میں نہ آیا، آخر وہ مایوس ہو کر نواسے سے بالکل بے تعلق ہو گئیں۔ ادھر سے اطمینان کر کے بڑے نواب صاحب نے شاہرخ مرزا سے اپنی چھوٹی بہن کی نواسی حسن بانو کی تعریف شروع کر دی۔

حسن بانو کے والد ریاست میسور کے ایک بڑے عہدے دار تھے۔ مہاراج ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ حسن بانو ان کی چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ بہت صاف بالکل میموں جیسا تھا۔ بال بھی سنہرے تھے۔ اچھی خاصی شکل کی لڑکی تھی۔ لیکن فریدہ جیسے دل میں کھب جانے والے نقش و نگار اس کے نہ تھے۔ نہ ایسا سرخی مائل گندمی رنگ تھا نہ سڈول دلربا جسم نہ وہ اتنی پڑھی لکھی اور ذہین تھی۔ لیکن بڑے نواب صاحب نے حسن بانو کی حسین صورت کا وہ شاعرانہ نقشہ شاہرخ مرزا کے سامنے کھینچا کہ شاہرخ مرزا بغیر دیکھے بھالے اس سے شادی کرنے پہ رضامند ہو گئے۔ بڑے نواب صاحب نے اپنی بہن کو خط لکھا وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس ہی رہتی تھیں۔ ان بےچاری کو یہ خبر نہ تھی کہ یہاں کیا گل کھلا ہے۔ پردیس میں بیاہی گئیں۔ پھر جب سے بیٹی کی شادی ہوئی وہ بیٹی

کے پاس رہنے لگیں۔ دہلی آئے بھی ان کو دس برس ہو گئے تھے میاں کے مرنے کے بعد ان کو ادھر آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رسمی حیل وحجت کے بعد انھوں نے بیٹی داماد کو یہ رشتہ کرنے کے لئے راضی کر لیا۔ کہنے کی بات' پھر بڑے بھائی کا اصرار اور نواب پھول پور کا رشتہ، بھلا وہ کیسے انکار کر سکتی تھیں۔

نواب صاحب نے بات پکّی ہوتے ہی دو مہینے بعد شادی کی بھی تاریخ مقرر کر دی۔ اتنی دیر بھی لڑکی والوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ یہاں تو سب کچھ تیار تھا۔

پھول پور سے پوری اسپیشل ٹرین بارات لے کر چلی ننھیال والے اس شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر ددھیال کا ہی کنبہ کافی تھا۔ دونوں چچا اور چچا زاد بھائی تینوں پھوپھیاں سب بارات میں گئے۔ شاہرخ مرزا کے دوستوں سے دو درجے بھرے ہوئے تھے۔ بنو بی، قیصر دلہن، ستارہ، عظمیٰ بھی تھیں۔ نواب سورج گڑھ الگ اپنی اسپیشل میں گئے۔ انجو بی کے ٹھاٹ بہت تھے۔ کئی پیش خدمتیں یورپین مصاحب' زرق برق وردی والے اے، ڈی، سی ان کے جلو میں ہر وقت رہتے تھے۔

میسور بہت بڑی ریاست ہے اور پھر لڑکی کے والد مہاراج کے منہ چڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے کسی بات کی کمی نہ تھی۔ بارات ریاست کے مہمان خانے میں ٹھیری ہوئی تھی۔ انجو بی اور نواب سورج گڑھ الگ ایک بڑی کوٹھی میں اُترے تھے۔ ریاست کی چار کاریں ہر وقت مہمانوں کو لانے لیجانے کے لئے موجود رہتیں۔ کھانے ناشتے کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ انواع واقسام کے انگریزی ہندوستانی کھانے، پھل میوہ جات سب ہی کچھ

ہوتا تھا غرضکہ بہت شان سے شادی ہوئی، مہاراج نے بھی شادی میں شرکت کی اور دولھا کو خلعت مع مرصع کلغی کے دیا۔ نواب سورج گڑھ کو بھی خلعت دیا منگنی چھٹنے کے چھ مہینے بعد ہی شاہرخ مرزا دلہن بیاہ کر لے آئے۔

رونمائی کی رسم ہوئی، دولھا دلہن کو کھیر کھلائی گئی۔ شاہرخ مرزا نے آرسی مصحف کے وقت دلہن کی جھلک سی دیکھی تھی۔ اب جو انھوں نے کھیر کھلانے کے لئے گھونگھٹ سرکایا تو شاہرخ کو دلہن کی پوری صورت نظر آئی۔ بے حد گورے رنگ کی معمولی سے نقشے والی لڑکی تھی۔ اس کی صورت میں شاہرخ مرزا کے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ رسم جوں توں پوری کرکے وہ جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ مگر یہ بھی کنبے کی میٹی تھی اور سسرال والے خاطر کے مارے بچھے جاتے تھے جز بز ہو کر خاموش ہو رہے۔ چوتھی کی رسم کے بعد دوسرے دن رات کو بارات رخصت ہوئی۔ پھول پور پہنچ کر شاہرخ مرزا نے دادا سے کہا کہ آپ نے مجھے غلط جگہ پھنسا دیا۔ حسن بانو کی فریدہ سے بھلا کیا برابری ہو سکتی ہے نہ صورت ہی اچھی ہے نہ وہ تمیز و شائستگی اور قابلیت اس میں ہے۔ بڑے نواب صاحب نے یہ جواب دیا۔ "ارے بھئی میں بوڑھا آدمی تمھاری پسند کو بھلا کیا سمجھ سکتا ہوں۔ چھوٹی سی کو دیکھا تھا۔ جب تو یہ بہت پیاری لگتی تھی بڑے ہو کر وہ شکل اس کی نہ رہی۔ شاہرخ مرزا اب کر بھی کیا سکتے تھے۔ حسن بانو بیچاری چودہ سال کی بھولی بھالی نازوں پلی لڑکی تھی۔ میاں کا برتاؤ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا۔ شاہرخ مرزا بھی اس بھولی لڑکی سے محبت کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اب فرض شناسی کا ثبوت دے سکیں۔ لیکن جب وہ دو چار جملے محبت بھرے بیوی سے کہتے اور وہ اپنی شرمیلی نظریں اٹھا کر

ان کی طرف دیکھتی شاہرخ مرزا کے تصور میں وہ مخمور آنکھیں مسکرانے لگتیں اور وہ گھبرا کر کھڑے ہو جاتے۔ حسن بانو حیران دیکھتی رہ جاتی اور وہ باہر چل دیتے۔

آخر اس ذہنی کش مکش سے شاہرخ مرزا پر اختلاجی کیفیت طاری رہنے لگی۔ گھر میں صرف وہ دونوں وقت کھانے کے لئے آتے تھے، اس وقت بھی وہ عظمی اور ستارہ سے باتیں کرتے رہتے تھے یا قیصر دلہن کے مزے دار چٹکلے سن کر بے دلی سے ہنستے رہتے تھے۔

اب اپنی عجلت پر ان کو پشیمانی تھی۔ کیوں دادا جان کے کہنے میں آ کر غصے میں منگنی توڑ دی۔ فریدہ مجھے کیا سمجھتی ہو گی۔ آہ میں کتنا بدنصیب جس ہیرے کو چھوڑ کر پتھر سے اپنی قسمت پھوڑی۔

ہجوم خیالات سے گھبرا کر نواب شاہرخ اپنے سر کو تکیوں پر پٹک دیتے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار گرم گرم آنسو نکل کر مخملی تکیوں کو بھگونے لگتے۔

---

(۲۰)

بیساکھ کے آخری دن تھے وہ اب کافی گرم ہونے لگے تھے، مگر راتیں خاصی ٹھنڈی ہوتی تھیں۔

رنگ محل میں ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی چھوٹی بہو صاحب کی صحنچی اور بڑی بہو صاحب کے کمرے میں خس کی ٹٹیاں لگ گئی تھیں۔ مگر منجھلی بہو صاحب کا رخ بند تھا کیونکہ صالحہ بیگم کے پاس پندرہ دن سے وہ گئی ہوئی تھیں۔ صالحہ بیگم کی صحت فریدہ کی منگنی ٹوٹ جانے کے بعد سے ہر وقت کڑھتے رہنے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی، کبھی ان کو اختلاج ہوتا اور کبھی کبھی چکر آتے۔ فریدہ بھی مضمحل سی رہتی تھی ——

دیوان صاحب نے یہ بہتر سمجھا کہ بیوی اور بیٹیوں کو لے کر کچھ دن کے لئے یورپ چلے جائیں۔ ان کو تو نواب ریاض ایک ریاست کے کام کے لئے بھیج ہی رہے تھے انھوں نے بیوی اور بیٹیوں کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا۔

بیٹی کے یورپ جانے کی اطلاع منجھلی بہو صاحب کو ملی تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ بھلا بہو بیٹیوں کا نگوڑے فرنگیوں کے ملک میں جانا کہاں اچھا

ہوتا ہے اور پھر سات سمندر پار کا جانا کوئی ہنسی مذاق ہے۔ ایک بیٹی ہی ان کی رہ گئی تھی ہر وقت اس کی اللہ آمین منایا کرتی تھیں، مگر داماد سے اس کے متعلق کچھ کہنا انھوں نے مناسب نہ سمجھا۔ اگر وہ کہنا نہ مانتے تو ان کی سبکی ہوتی۔ البتہ بیٹی کو لکھا۔ بھلا تم جوان جہان لڑکیوں کو لے کر کہاں جاؤ گی۔ مصلحت یہی ہے کہ میاں کو نرمی سے سمجھا دو۔

صالحہ بیگم نے ماں کو جواب دیا کہ اگر میں نہ بھی جاؤں تو آپ کے داماد اپنی بیٹیوں کو لے کر چلے جائیں گے اور یہ بُرا بھی ہوگا۔ فریدہ کی طبیعت واقعی نڈھال رہتی ہے۔ بچپن کی لگی منگنی چھٹنے کا یقیناً اس کو بھی ملال ہوگا اچھا ہے باہر جا کر اس کا دل بھی بہلے گا، میرے دماغ کو بھی سکون ہوگا"

منجھلی بہو صاحب اور کیا کہہ سکتی تھیں۔ دیوان صاحب کی بہن بہنوئی بھی جا رہے تھے۔ اور یہ بہنوئی گوالیار میں جج تھے پروگرام کے مطابق دیوان صاحب بیوی اور لڑکیوں کو لے کر ان کے پاس گوالیار گئے۔ منجھلی بہو صاحب بھی ساتھ گئیں۔ گوالیار پہنچنے کے پانچویں دن صبح کو یہ قافلہ بمبئی کو روانہ ہوا۔

بیٹی کو رخصت کرنے منجھلی بہو صاحب بھی اسٹیشن گئیں، ایک تو بیٹی کی جدائی کا ملال اور پھر پہلی مرتبہ بیٹی اور نواسیوں کو انھوں نے بغیر برقعے کے منہ کھولے ساڑیوں میں دیکھا۔ جج صاحب کے بہت سے ملنے والے آئے تھے، ان لوگوں نے جج صاحب کے ساتھ ساتھ ان سب کے گلے میں بھی ہار ڈالے۔ منجھلی بہو صاحب کو یہ منظر اتنا بُرا لگا کہ ان کا دل ہل گیا۔ اس پر پشیمان تھیں کہ گوالیار اسٹیشن کیوں آئیں۔ شاہرخ نے شادی کر لی ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ ہائے ہم تو اوروں پر ہنسا کرتے

سکتے اب کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔ بڑی بھابی بیگم سنیں گی تو کیا کہیں گی۔"

ان خیالوں میں مستغرق منجھلی بہو صاحبہ قصے میں ملفوف کھڑی تھیں کہ صالحہ بیگم نے جو ماں کے جذبات سے بے خبر تھیں آخری بار ماں کے گلے لگ کر رخصتی سلام کیا اور جلدی سے سوار ہو گئیں۔ ٹرین چھک چھک کرتی چل دی۔ منجھلی بہو صاحب ابھی تک زار و قطار رو رہی تھیں۔ مغلانی اور کلو بوا نے ان کو سہارا دے کر ویٹنگ روم میں پہنچا دیا۔ ایک گھنٹہ بعد اجمیر جانے والی ٹرین آ گئی۔ اور ان کا سامان منشی جی نے گاڑی میں رکھ کر کہا چلئے تو وہ اسی طرح کھڑی ہو گئیں۔ ٹرین میں بیٹھ کر بھی وہ آنسو بہاتی رہیں۔ نہ جانے کیوں ان کا دل بھرا چلا آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کا سارا خون آنسو بن کر نکل جائے گا۔ شام کے لگ بھگ ٹرین اجمیر پہنچی۔ اسٹیشن پر ان کے ایک رشتے کے بھائی احمد مرزا لینے آئے تھے۔ منجھلی بہو صاحب نے ان کی وجہ سے دل کو سنبھالا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ احمد مرزا کی بیوی ناشتے اور چائے کی کشتی لیکر آئیں۔ منجھلی بہو صاحب نے کہا کہ "دلہن ناشتہ تو رہنے دو۔ میں صرف چائے پیوں گی۔ درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے۔"

وہ بولیں "اے آپا جان کچھ تو منہ میں ڈال لیجئے۔ خالی پیٹ رہنے سے بھی سر میں درد ہوتا ہے" لیکن منجھلی بہو صاحب کا دل تو غم کے مارے پھٹا جا رہا تھا ان کو اس وقت کھانے کا کہاں خیال تھا۔ بڑی آن بان کی بیوی تھیں۔ اسپرو کی گولی کھا کر ڈیڑھ پیالی چائے کی پی لی۔ بھری کشتی ناشتے کی یونہی اٹھ گئی۔ دوپہر کو بھی انھوں نے کھانا نہ کھایا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اپنی بھاوج سے کہا دلہن میں ذرا لیٹتی ہوں، آنکھ لگ جائے تو پھر کھانے کے لئے جگانا نہیں۔ میرے سر میں اب بھی درد ہے اور بھوک مجھے

بالکل نہیں ہے امید ہے کہ انشاء اللہ صبح تک سونے کے بعد طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ پان منھ میں رکھ کر پلنگ پر دراز ہو گئیں۔ کلّو بوا پاؤں دبانے لگیں اور تھوڑی دیر بعد منجھلی بہو صاحب نیند سے غافل ہو گئیں۔ رات گئے کھانے کا دسترخوان بچھا مگر منجھلی بہو صاحب ابھی تک سو رہی تھیں۔ انھوں نے کروٹ تک نہ بدلی تھی۔ کھانے کے لئے احمد مرزا بہن کو جگانے لگے تو بیوی بولیں اے ہے آپا جان کو نہ اٹھانا وہ کہہ کر سوئی ہیں کہ مجھے بھوک بالکل نہیں ہے اور طبیعت کسل مند ہے۔ کلّو بوا مغلانی کو کھانا دیا اور پھر دونوں میاں بیوی نے کھایا۔ تھوڑی دیر بعد سب سو گئے۔ رات کے ایک بجے کلّو بوا کی آنکھ کھلی اور وہ پیشاب کرنے کے لئے اٹھیں تو واپسی پر انھوں نے بیوی کے قریب آکر دیکھا کہ وہ آرام سے سو رہی ہیں یا نہیں۔ تو یہ دیکھ کر ان کے حواس جاتے رہے کہ منجھلی بہو صاحب کے گلے سے غرغر کی آواز آ رہی ہے۔ اور وہ اپنا سر تکیے پر پٹک رہی ہیں۔ جلدی سے جا کر احمد مرزا کی بیوی سے کہا۔ اے دلہن بیوی اٹھو تو، دیکھو ہماری بیوی کو کیا ہو گیا۔ وہ آنکھیں ملتی ننگے پاؤں ان کے پاس پہونچیں۔ پہلے تو منجھلی بہو صاحب سے کئی بار پوچھا آپا جان کیسی طبیعت ہے مگر انھوں نے نہ تو جواب دیا اور نہ آنکھ کھولی۔ البتہ ان کی غرغراہٹ اور بڑھ گئی تو انھوں نے گھبراہٹ کے مارے میاں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "اے اٹھو تو نہ جانے آپا جان کو کیا ہو گیا"۔

احمد مرزا عشاء کی نماز پڑھ کر دیر ہی سے سوئے تھے۔ آنکھ لگے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ پہلے تو بہن کو چند منٹ کھڑے دیکھتے رہے پھر بھاگے ہوئے باہر گئے اور پڑوس کے حکیم صاحب کو لے کر آئے۔ حکیم صاحب نے بغور بہت دیر تک معائنہ کیا اور پھر سر ہلا کر بولے۔

میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ ان کا جاں بر ہونا مشکل ہے۔ آپ جلدی کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔

احمد مرزا بیچارے بالکل گھبرا گئے، جا کر بمشکل سول سرجن کو لے کر آئے۔ اس بھاگ دوڑ میں رات گزر چکی تھی۔ منجھلی بہو صاحب کے گلے سے تو اب آواز کم نکل رہی تھی، البتہ ناک سے خون اور منھ سے کف جانے لگا تھا۔ کلو بوا اور منلانی اپنی محبت کرنے والی مالکہ کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں، ان کی ناک سے خون اور منھ سے کف پونچھتی جاتیں اور دونوں رو رہی تھیں۔ احمد مرزا کی بیوی گھبرائی ہوئی ہاتھ ملتی اندر سے باہر، باہر سے اندر آ جا رہی تھیں۔

سول سرجن نے دیکھا اور افسوس بھرے لہجے میں، کہہ دیا، مریضہ کے دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔ کسی سخت صدمے کے باعث ان کے خون کا دباؤ ایک دم بہت بڑھ گیا اور دماغ پر فالج پڑ گیا ہے۔ یہ چند گھنٹوں کی مہمان ہیں کوئی تدبیر اب ان کو موت کے چنگل سے بچا نہیں سکتی۔ میں صرف طاقت کے لئے ایک انجکشن دئے دیتا ہوں، یہ کچھ سکون مرنے والی کو بخش دے گا ورنہ علاج اب کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ انجکشن دے کر ڈیل فیس لے کر وہ تو چلتا ہوا۔

احمد مرزا اس کے جانے کے بعد سر پکڑے سراسیمہ کھڑے رہ گئے۔ بیچارے معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ ان کے والد کے وقت کا ایک بوڑھا ملازم تھا یا گھر میں پکانے والی ماما۔ بھلا یہ دونوں کس کام کے تھے، ان کے حواس بجا نہ تھے۔ لیکن اس ناگہانی مصیبت کو تو اٹھانا ہی تھا۔ ایک تار منجھلے صاحب کو دلّی دیا دوسرا شاہرخ مرزا کو بھوپال۔

منجھلے صاحب ابھی صبح کی چائے پی کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کو بیوی کی

علالت کا تار ملا، اور وہ تار ہاتھ میں لئے گھبرائے ہوئے ماں کے پاس محل میں آگئے، ان کو پریشان دیکھ کر وہ بولیں "اے میاں خیر صلاّ"۔

منجھلے صاحب نے کہا۔ احمد میاں کا تار آیا ہے، آپ کی بہو سخت بیمار ہوگئی ہیں، مجھے انھوں نے بلایا ہے۔

سکندر زمانی بیگم، ہاتھ اٹھا کر "اے اللہ مجھ پر رحم کر۔ منجھلے تم اکیلے جاکر کیا کرو گے، چلو میں بھی چلوں گی، منور مرزا اتفاق سے دلی کسی کام کیلئے آئے ہوئے تھے، وہ بھی مع بیوی کے ساتھ ہو لئے۔

صبح دس بجے والی ٹرین سے روانہ ہوکر یہ لوگ شام کو سات بجے اجمیر پہنچ گئے۔ منجھلی بہو صاحب کا رنگ اب بالکل ہلدی کی مانند زرد ہو گیا تھا۔ سانس کی خفیف آمد و شد کے علاوہ ان میں زندگی کی کوئی علامت نہ تھی۔ سول سرجن کی رائے احمد مرزا نے منجھلے صاحب کو بتا دی۔

وہ اب بیوی کے زرد نحیف چہرے پر نظر جمائے حسرت سے دیکھ رہے تھے اور ان کے تصور میں ان کی وہ صورت تھی جب زرکار عروسی جوڑے میں نھنی منی دلہن کی شکل میں ان کو دیکھا تھا۔ وہ تیرہ سالہ حسین دلربا الھڑ لڑکی ان کی رفیقۂ حیات بننے کے چالیس سال بعد اب یکایک بڑھاپے میں منھ موڑ رہی تھیں اور اتنے دن کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ مرنے والی کے ٹھنڈے ہاتھوں کو وہ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

سکندر زمانی بیگم اپنی اس پیاری بہو کے سرہانے دل کو تھامے بیٹھی یٰسین پڑھ رہی تھیں جس کو وہ بہت دھوم سے بیاہ کر لائی تھیں۔ جس کی چاند جیسی صورت دیکھ کر انھوں نے بڑے چاؤ سے مہتاب دلہن خطاب دیا تھا۔

منور مرزا شہد اور پانی ماں کے منھ میں ڈالنے کی کوشش برابر کر رہے تھے

لیکن منجھلی بہو صاحب کے لیئے اب اس دنیا کا دانہ پانی ختم ہوگیا تھا۔ رات کے نو بجے وہ موت و زیست کی کش مکش سے چھوٹ کر خدا کے یہاں سدھاریں۔ موت نے ان کے سب دکھوں کا خاتمہ کر دیا۔ زکیہ بیگم کے بعد منجھلی بہو صاحب کی زندگی ایک دن بھی سکھ سے نہ گزری۔ بن ماں کے بچوں کے فکر نے ان کی زندگی کو گھن لگا دیا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے سرد آہیں لیا کرتی تھیں۔ شاہرخ مرزا نے منگنی توڑ کر نانی کا بالکل کام تمام کر دیا۔

غسل دینے کی تیاری ہو رہی تھی کہ شاہرخ مرزا اور قیصر دلہن پہنچے۔

سکندر زمانی بیگم سے ضبط نہ ہو سکا۔ رو کر بولیں "بیٹا! اب کس کو دیکھنے آئے ہو۔ میری دلہن تو اللہ کے یہاں سدھار گئیں۔ ہائے شاہرخ تو نے نانی کا ذرا خیال نہ کیا وہ غیرت دار تھی مر گئی اور منجھلے کا گھر اُجڑ گیا۔ مجھ نصیبوں جلی کی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ جس بہو کی پالکی لائی تھی اُس کا ڈولا بھی سجاؤں۔"

شاہرخ مرزا کیا جواب دے سکتے تھے، نانی کے پاؤں سے آنکھیں مل کر ندامت کے آنسو بہانے لگے۔

قیصر دلہن کو بھی اس وقت اپنی زیادتیوں پر پشیمانی تھی۔ کس کس طرح انھوں نے ساس کو ستایا تھا۔ اپنے میاں کی لاپرواہی کا بدلہ ساس سے لیا تھا۔ مگر مرنے والی نے کس تحمّل سے بہو کی کڑوی کسیلی باتیں شربت کے گھونٹ کی طرح پی لیں اور ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ کیا کرے اس بدنصیب کا میرے سوا کون ہے۔ اگر میرا بیٹا بُرا نہ ہوتا تو بہو کی مجال تھی جو زبان درازی کرتی۔

منور دلہن کے گلے میں باہیں ڈال کر قیصر دلہن رو رہی تھیں۔ دونوں بہوؤں کو شفیق ساس کی محبت آنسو بہانے پر مجبور کر رہی تھی۔

منجھلے صاحب سکتے میں بیٹھے تھے۔ منّو مرزا رو بھی رہے تھے اور ماں کو آخری منزل پر پہنچانے کی تیاری بھی کرتے جاتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد منجھلی بہو صاحب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے نازنین جسم پر منوں مٹی پڑ گئی۔

پھولوں کی فاتحہ کے بعد یہ مغموم قافلہ دلّی واپس آ گیا۔ بنو بی عظمیٰ تارہ دلی پہنچ چکی تھیں۔ عظمیٰ نے آنکھ کھول کر نانی کو دیکھا تھا۔ ماں تو اس کو یاد بھی نہیں تھیں، وہ بھی رخصت ہوئیں۔ بیچاری لڑکی کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا۔

نواب سورج گڑھ بیمار تھے اس لئے انجو نہ آ سکیں۔ شاپور مرزا بھی بہن کے پاس تھے، وہ اطلاع پا کر دلّی آ گئے تھے۔

صالحہ بیگم کو لندن پہنچتے ہی ماں کے انتقال کی خبر ملی۔ رو کر رہ گئیں اتنی دور سے آجانا ممکن نہ تھا اور اب اس سے فائدہ بھی کیا تھا۔ سکندر زمانی بیگم نے بہت حوصلے سے بہو کا مرنا کیا۔ ایک غریب کنواری لڑکی کا پورا جہیز بنا کر دیا۔

چہلم پر انجو بی بھی ایک ہفتہ کے لئے آئیں۔ نواب سورج گڑھ چونکہ ابھی بیماری سے اُٹھے تھے اس لئے ان دنوں بیوی سے محبت کا بہت اظہار کرتے تھے اور انجو بی میاں کی محبت پر حسبِ معمول بہت مطمئن نظر آتی تھیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت ان کو معلوم تھی

صالحہ بیگم ماں کی سہ ماہی کی فاتحہ سے دو روز پہلے دلی آئیں ان کو لندن سے واپس آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ سہ ماہی کی فاتحہ کے بعد منجھلی بہو صاحب کے چاندی تانبے چینی کے سامان، لباس اور سب چیزوں کے تین حصّے ہو گئے۔

منجھلے صاحب نے تو بیوی کے مرنے کے بعد گھر سے بالکل بے تعلقی اختیار

کرلی تھی۔ ماں کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ اور باہر رہتے تھے۔ خاموش طبیعت ہمیشہ کے تھے۔ چھوٹے بھائی کے مرنے کے بعد بہت اداس رہنے لگے تھے اور اب تو گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے۔

قیصر دلہن منور دلہن نے اپنے حصے لے لئے۔ صالحہ بیگم نے اپنے حصے کی کچھ چیزیں تو خدا واسطے دیدیں اور کچھ بڑی بہو صاحب کے پاس رکھوادیں۔ ان کے اپنے پاس بہت کچھ تھا، ان کو یہ سامان لے کر کیا کرنا تھا۔ قیصر دلہن اور منور دلہن میں آج کل قابلِ رشک طور پر اتفاق ہو رہا تھا۔ اور اس باہمی بے حد ملاپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیصر دلہن نے اپنے لڑکے سکندر مرزا کے لئے منور مرزا کی بڑی لڑکی امینہ کو مانگا۔ سکندر مرزا دادا دادی کا لاڈلا تھا اور منجھلی بہو صاحب کے پاس ہی رہتا تھا اب اپنی تعلیم ختم کر کے پولیس میں ٹریننگ لے رہا تھا۔ منجھلے صاحب کو خوش کرنے کے لئے منور مرزا نے یہ پیغام منظور کر لیا اور امینہ کی منگنی صالحہ بیگم کے جانے سے ایک ہفتہ بعد ہی ہو گئی۔

شاہرخ مرزا بھی فاتحہ میں آئے تھے۔ انھوں نے خالہ کے قدموں میں ٹوپی ڈال کر معافی مانگی اور صالحہ بیگم نے بھانجے کو گلے لگا کر کہا میاں تمہارا قصور نہیں قسمت کا جو لکھا تھا پورا ہوا۔ اب پچھلی باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ حسن بانو بھی اپنی ہی بچی ہے، خوش رہے، دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ مگر شاہرخ مرزا پر خالہ کے مشفقانہ محبت بھرے برتاؤ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر روئے اور ان کے غم و غصّے نے جنون کی شکل اختیار کر لی۔

حسن بانو شادی کے بعد دوسری مرتبہ میکے گئی ہوئی تھی، اس کو جھٹ طلاق نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ بڑے نواب صاحب کو خبر ہوئی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شاہرخ مرزا سے پوچھا تو انھوں نے اطمینان سے کہہ دیا۔ "میں اپنے ساتھ

ایک ناکردہ گناہ لڑکی کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔ شادی کے بعد ایک دن بھی حسن بانو کو وہ محبت نہ دے سکا جو ازدواجی زندگی کے لئے ضروری ہے میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ پھر لینا اس کا حق ہے وہ میں دوں گا۔ وہ اب آزاد ہے جس طرح چاہے زندگی سنوار سکتی ہے۔

نواب صاحب اب اپنے کئے پر پچھتانے کے علاوہ اس احمق ضدی نوجوان کو کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ جو من مانی کرنے کا بلا سوچے سمجھے عادی ہو چکا تھا مہر کا روپیہ کسی نہ کسی طرح فراہم کر کے دیا اور ہاتھ مل کر رہ گئے۔

(۲۱)

شاہرخ مرزا کو حسن بانو کو طلاق دیئے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے انھوں نے انجو بی اور شاپور مرزا کی وساطت سے پھر فریدہ سے شادی کرنی چاہی۔ انجو بی نے خالہ کو بہت لمبے چوڑے خط لکھے۔ مگر ان تمام خطوں کے جواب میں صالحہ بیگم نے یہی لکھا۔ "میں مجبور ہوں، تمہارے خالو اب یہ ذکر بھی سننا نہیں چاہتے۔ شاہرخ مرزا کی عجلت اور نادانی نے ان کو بہت برہم کر دیا ہے۔" شاپور مرزا خالہ کے پاس خود گئے، تو انھوں نے کہا میاں سچ تو یہ ہے کہ اب تو میرا بھی شاہرخ سے فریدہ کی شادی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ان کے مزاج میں استقلال نام کو نہیں ہے جو چاہتے ہیں بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے ہیں پہلے انھوں نے دادا کے کہنے میں آکر مری پرواہ کی نہ نانی کی نہ ان کو فریدہ کا خیال ہوا۔ بچپن کی لگی منگنی توڑ دی اب بیچاری حسن بانو کو بے قصور بے خطا غصے میں آکر چھوڑ دیا وہ انسان کیا جو کسی کی بھی پرواہ نہ کرے اور جی چاہے جو کچھ کرتا رہے۔ فریدہ تو اب شاہرخ کا نام سن کر بگڑ جاتی ہے۔ اللہ رکھے سمجھ دار حساس لڑکی ہے۔ اس پر جو بہتان لوگوں نے اٹھائے اس کی سن گن اسے بھی مل گئی۔ اور وہ خود بھی ہرگز شاہرخ سے شادی کرنے پر

اب رضامند نہ ہوگی۔ اگر میں نے زبردستی بھی کی اور بعد شادی دونوں کی نہ بنی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ منگنی چھٹنے سے ہی میں اپنی سسرال والوں اور میاں کے سامنے نادم ہوں۔ یوں بھی اب یہ شادی ہونی ناممکن ہے کہ شاہرخ مرزا فریدہ کی آزادی کو پسند نہیں کریں گے، وہ اب پہلے کی طرح پردے میں رہنے والی الھڑ لڑکی نہیں ہے۔ باپ کی لاڈلی پہلے ہی تھی اب باہر پھرنے سے اس کے مزاج میں خودمختاری زیادہ آگئی ہے۔

شاپور مرزا خالہ کی معقول باتوں کا جواب ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ دے ہی کیا سکتے تھے، چار دن رہ کر واپس آگئے اور بھائی سے کہا خالہ جان نے صاف انکار کر دیا اور وہ کرہی کیا۔ اب معاملہ ان کے قابو میں رہا ہی نہیں، آپ نے خود اپنی ناؤ ڈبوئی ہے۔ اب یہ فضول خیال چھوڑ دیجئے۔ فریدہ بہن سے شادی کر کے اب آپ خوش نہیں رہ سکتے۔ میں نے چار دن وہاں رہ کر خوب ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ لئے۔ وہ اب یورپ کی ہوا کھا کر آئی ہیں بالکل مس بابا معلوم ہوتی ہیں ویسے بھی ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خیال ان کے دل میں بالکل نہیں ہے، بھلا اب وہ ریاست کی پابندیوں اور رواجی پردے کی قید کیسے برداشت کر سکتی ہیں لہذا کوئی اور اچھی لڑکی دیکھ کر اب آپ شادی کیجئے۔ وہاں بالکل گنجائش نہیں ہے۔

اتفاق کی بات کہ مہینہ بھر بعد ہی نواب سورج گڑھ ریاست کے کسی کام سے وائسرائے سے ملنے دلی آئے تو انجوبی بھی ان کے ہمراہ آگئیں۔ نواب صاحب ایک ہفتہ بعد واپس چلے گئے، انجوبی پھول پور ہاؤس میں میاں کے جانے کے بعد آگئیں۔ شاہرخ مرزا بہنوئی کے آنے کا تار پاکر دلی آگئے تھے، شاپور بھی یہیں تھے۔ تینوں سر جوڑ کر شادی کے لئے صلاح مشورہ

کرنے لگے۔ خاندان میں اب جتنی لڑکیاں شادی کے قابل تھیں، ان میں سے جو بھی اچھی تھیں ان کی سب کی منگنی ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔

ستارہ شاہرخ کے ساتھ کی کھیلی اور سگے ماموں کی بیٹی تھی۔ مگر قیصر دلہن کی زبان سے انجوبی کا دل بہت کھٹا ہو گیا تھا اور شاہرخ مرزا کے معیارِ حُسن پر بھی وہ پوری نہیں اترتی تھی۔ آخر شاپور مرزا نے بہت غور کے بعد کہا کہ میرے ایک کلاس فیلو دوست کابل کے شاہی خاندان سے ہیں ان کی بڑی بہن بمبئی کی جانب ایک ریاست میں بیاہی گئی ہیں۔ ان کی تصویر میں نے دیکھی ہے بہت خوبصورت ہیں میرا دوست یوسف بھی وجیہہ شکیل انسان ہے یوسف کی چھوٹی بہن نے پچھلے سال میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ وہ امتحان دینے علی گڑھ آئی تھیں تو یوسف نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ یہ لوگ اب ڈیرہ دون میں رہتے ہیں۔ آپا میرے ساتھ چل کر لڑکی دیکھ لیں اگر پسند آجائے تو پیغام دے دیں۔ یہ لوگ بہت اچھے ہیں اور شاہی خاندان سے ہیں۔

شاہرخ مرزا اور انجوبی کو یہ تجویز شاپور کی پسند آئی۔ دوسرے دن رات کو شاپور کے ساتھ انجوبی ڈیرہ دون سدھاریں۔

یوسف کو شاپور نے اپنے پہنچنے کا تار دے دیا تھا۔ وہ عزیز دوست کے استقبال کے لئے اسٹیشن پہ موجود تھا۔ لیکن جب اس نے نواب بیگم سورج گڑھ کو بھی دیکھا تو گھبرا کر کہا ارے بھئی شاپور تم بہت لااُبالی انسان ہو آپا صاحبہ کی آمد کی اطلاع بھی نہ دی۔ ہم غریب لوگ بھلا ان کے آرام کا کچھ تو سامان کر لیتے، تمہارا تو کچھ نہیں ہے۔

شاپور نے کہا آپا تو ایک دم تمہاری والدہ اور بہنوں سے ملنے کی خوشی میں میرے ساتھ ہو لیں پھر بھلا آپس میں تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری

آپا بیکار امارت دکھانے کی عادی نہیں ہیں۔

انجو بی اپنی قیمتی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اُتریں۔ ان کے پیچھے ان کے اے ڈی سی سردار پرتاب سنگھ سگرٹ کا ڈبہ اور پرس چھتری سنبھالے ہوئے لپکے۔ زنانہ درجے سے بی مغلانی چاندی کا پاندان اور تھالی ظروف لئے لپکتی کانپتی اُتریں۔

یوسف ان معزز مہمانوں کو لے کر گھر سدھارے۔ انجو بی کو تو ماں کے سپرد کیا اور شاپور کو لے کر اپنے کمرے میں گئے۔ یوسف کی کوٹھی کافی بڑی اور خوشنما تھی، جلدی جلدی ایک کشادہ کمرے کو آراستہ کرکے انجو بی کا سامان رکھ دیا گیا۔ شاپور تو یوسف کے کمرے میں ہی ٹھہر گئے۔ سردار پرتاب سنگھ کو مہمانوں والے کمرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ یوسف کی بڑی بہن کو انجو بی بمبئی کی ریس میں ایک دو مرتبہ دیکھ چکی تھیں، اس لئے گھل مل کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ چھوٹی بہن خاموش شرمائی ہوئی بیٹھی رہی۔ انجو بی کو یہ لڑکی ہر طرح اپنے بھائی کے لئے موزوں نظر آئی۔

خوش شکل موزوں اندام اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ البتہ عمر کے لحاظ سے شاہرخ مرزا کے برابر ہی لگتی تھی، تو انجو بی نے یہ سوچا میرے بھائی کے لئے سمجھ دار لڑکی سے شادی ہونا بہتر ہے تاکہ ان کو قابو میں رکھ سکے۔ حسن بانو بالکل کمسن تھی اس لئے ہی کامیاب نہ ہو سکی۔

یوسف کی والدہ بھی سلجھے ہوئے مزاج کی سلیقہ مند خاتون تھیں کوٹھی کی سجاوٹ صفائی سے اس کے مکینوں کی خوش مذاقی ظاہر تھی، غرضکہ انجو بی نے ہر طرف سے اطمینان کرکے دوپہر کے کھانے کے بعد ہی یوسف کی والدہ سے کہا۔ "خالہ میں تو اپنے بھائی نواب پھول پور کے لئے آپ کی چھوٹی

لڑکی مانگنے آئی ہوں۔

انھوں نے جواب دیا بیٹی لڑکیاں رکھنے کی چیز نہیں ہیں، اور آپ میرے گھر آئی ہیں اس کا بھی مجھے خیال ہے۔ مگر بیٹی کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے میں اس کے دونوں بھائیوں سے صلاح کر کے جواب دوں گی۔ بن باپ کی بچی ہے، ہر طرح سوچ سمجھ کر ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ آپ لوگ امیر رئیس اور ہم بے چارے غریب، میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ہے یہ آپ سمجھ لیجئے۔

انجوبی مسکرا کر بولیں۔ توبہ خالہ! ہم آپ کی کیا برابری کر سکتے ہیں آپ تو شاہی خاندان سے ہیں۔ انسان کہیں بھی رہے، جو وہ ہوتا ہے وہی رہتا ہے۔

یوسف کی والدہ سرد آہ بھر کر بولیں۔ بیوی شاہی تو رہ گئی کابل میں، اب تو ہم غریب الوطن ہیں۔ جب سے کابل چھوڑا ہم نے امارت کے خیال کو بھی دل سے نکال دیا۔ روکھی سوکھی کھاتے ہیں موٹا جھوٹا پہنتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔

اچھا اب آپ آرام کریں میں اس کے بھائیوں سے مشورہ کر کے آپ کو شام کو جواب دوں گی۔

یوسف کا بڑا بھائی اکبر ٹیچر تھا۔ وہ پانچ بجے جب آفس سے واپس آیا تو چائے کے بعد ماں نے انجوبی نے جو کہا تھا کہہ دیا۔

وہ بولا میں ان لوگوں سے واقف نہیں۔ یوسف جانتے ہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ بھوپور ہے تو چھوٹی سی ریاست لیکن اس کا اعزاز بڑا ہے۔ اور نواب بھوپور خوش رو تندرست جوان ہیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یوسف بولے میں شاپور سے واقف ہوں۔ وہ آٹھ سال تک میرے کلاس فیلو رہے ہیں۔ بہت اچھی طبیعت کے سمجھدار انسان

ہیں اگر وہ اپنے لئے رشتہ مانگتے تو میں بغیر آپ سے پوچھے اقرار کرلیتا مگر نواب صاحب پھولپور کے عادات و اخلاق سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ پچھلے سال کرسمس کی تعطیل میں شاپور مرزا کے بہت اصرار پر میں پھولپور گیا تھا اور وہاں چار دن ٹھہرا تھا۔ نواب ویسے تو خلیق انسان ہیں، ان کے چال چلن کے متعلق بھی میں نے کچھ نہیں سُنا نہ کوئی بات میں نے دیکھی۔ مگر سُنا ہے کہ پہلی بیوی جس کو انھوں نے طلاق دی ہے۔ ان کے خاندان کی لڑکی تھی۔ بہت دھوم سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس میں بلاوا میرا بھی آیا تھا۔ میں امتحان کی تیاری کی وجہ سے جا نہیں سکا تھا۔ اس بیوی کو نواب نے اس لئے چھوڑا کہ وہ پڑھی لکھی بھی معمولی تھی اور اس کی صورت بھی ان کو پسند نہیں آئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل کے سامنے کسی کی پرواہ کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ ورنہ کنبے خاندان کی لڑکیوں کا خیال ہر کوئی کرتا ہے۔ میرے خیال میں آپ ان کی بہن سے اچھی طرح معلوم کر لیجئے۔ اور فی الحال ان کو ٹال دیجئے۔ رشتے ناطے کے معاملے میں جلدی اچھی نہیں ہوتی کہیں ایسا نہ ہو، ہم لوگوں کو بعد میں پچھتانا پڑے۔ غیر لوگوں اور پردیس میں شادی کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح اطمینان کر لینا چاہیئے۔

یوسف کی والدہ کے آتے ہی انجو بی نے پھر ذکر چھیڑا۔

اور وہ بولیں اے بیوی نواب صاحب کی پہلی بیگم تو کنبے کی بیٹی تھیں پھر ان کو کیوں چھوڑا۔

انجو بی گلوری منھ میں رکھ کر، جی، دادا جان نے یہ شادی کی تھی۔ شاہرخ میاں کی مرضی نہ تھی۔ لڑکی چھوٹی عمر کی بیوقوف سی تھی اور شکل بھی اس کی بالکل معمولی تھی، اسی لئے ایک دن بھی شاہرخ مرزا سے اس کی نہ بنی۔

شادی کے بعد وہ بہت افسردہ رہتے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے طلاق دے دی۔ اب یہ شادی تو ان کی مرضی سے ہو رہی ہے۔

یوسف کی والدہ نے کہا۔ میری لڑکی بھی تو حور پری نہیں۔ بس آدمی کا بچہ ہے۔ اللہ رکھے آپ خوبصورت ہیں ایسی ہی بھاوج لائیے۔

انجو بی ناز سے سر ہلا کر بولیں:۔ "اے ہے خالہ بھلا پیلی چمڑی ہونا بھی کوئی حُسن ہے اور میری رہی سہی صورت کو اس نگوڑے مٹاپے نے غارت کر دیا۔ ماشاء اللہ آپ کی لڑکی میں کمی کس بات کی ہے، تیکھا نقشہ ہے، سرخی مائل اچھا خاصا صاف رنگ ہے۔ ڈیل قد سب موزوں ہے۔ پھر سمجھدار پڑھی لکھی سلیقہ شعار ہے۔ مجھے تو بہت پیاری لگتی ہے۔ یقین ہے میرے بھائی کو بھی پسند آئے گی۔ وہ نگوڑا میموں جیسا شلغم کا سا رنگ کس کام کا۔ آخر میں بھی تو اپنے بھائی کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔ آپ تو بس مجھے اللہ کا نام لے کر اپنی بیٹی دے دیجئے۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی شکایت اس سلسلے میں نہ ہوگی۔ آپ کی بیٹی پھولپور کے محلوں میں راج کرے گی۔

انجو بی کی شیریں باتوں، شائستہ اطوار، اعلیٰ لباس، قیمتی زیور اور شاہانہ انداز نے بڑی بی کو موہ لیا۔ آخر دوسرے دن شام تک مسلسل اصرار کرتے رہنے کے بعد انجو بی نے ان سے اپنی بات منوا ہی لی۔ ان کے اقرار کرتے ہی جھٹ اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار انجو بی نے لڑکی کو پہنا دی۔ اس انگوٹھی میں چوکور یاقوت کے گرد ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ابھی یوسف کی والدہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبے سے خاموش بیٹھی ان کو دیکھ ہی رہی تھیں کہ وہ بولیں:۔

خالہ مبارک ہو۔ اب آپ جنوری میں کوئی اچھی سی تاریخ ٹھہرا کر مجھے

لکھ دیجئے گا۔ میرا بار بار آنا مشکل ہے۔ آج دسمبر کی گیارہ تاریخ ہے۔

وہ بولیں آپ تو امیر رئیس ہیں، سارا انتظام کرلیں گی، مگر ہمیں بھی تو کچھ کرنا ہے۔ غریب ہی سہی مگر اپنی حیثیت کے مطابق تو ہمیں اپنی لڑکی کو دینا ہوگا۔ تین مہینے سے پہلے میں شادی نہیں کرسکوں گی۔

انجوبی ”اے آپ زیادہ بکھیڑا نہ کریں۔ خیر آپ کی خاطر میں سرکار سے منت، خوشامد کرکے دو مہینے کی اجازت لے لوں گی۔ فروری کے پہلے ہفتے میں شادی ضرور ہوجانی چاہیئے۔ اس کے بعد میرا ٹھیرنا ممکن نہیں۔ میرے دیور کی شادی مارچ میں ہونے والی ہے۔ اس کی بھی تیاری کرنی ہے۔

یوسف کی والدہ نے کہا۔ لڑکوں سے صلاح کرکے لکھوں گی۔ آپ کا یہ حکم بھی سر آنکھوں پر۔

انجوبی اس رات کو خوشی خوشی دلی سدھاریں۔ شاہرخ مرزا سے انھوں نے لڑکی کی صورت سیرت اور گھر والوں کے سلیقے کی خوب تعریف کی۔ اور فروری میں شادی ہونے کی خبر سنائی۔

شاہرخ مرزا کا شوق وارمان فریدہ سے نسبت ٹوٹنے کے بعد رخصت ہوچکا تھا۔ اب تو وہ شادی فرض کے طور پر کر رہے تھے۔ اوائل عمری میں دل پر ایسی چوٹ پڑی تھی کہ اب کسی طور پر شگفتہ نہ ہوسکتا تھا۔

انجوبی نے زور شور سے بھائی کی شادی کی تیاری شروع کردی۔ کیونکہ یہ نسبت ان کے ہاتھوں ٹھہری تھی اس لئے چاہتی تھیں کہ کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ فریدہ کے لئے جتنے زیور شاہرخ مرزا نے بنوائے تھے وہ سب حسن بانو کو دے دیئے گئے تھے۔ میکے جاتے وقت وہ اپنا تمام زیور ساتھ لے گئی۔ ست لڑا اور جڑاؤ پازیب ٹوٹ جانے کے باعث، ٹھیک ہونے کے لئے چھوڑ گئی تھی۔

بس یہی دو زیور تھے۔ حسن بانو کا مہر دینے کی وجہ سے ریاست مقروض ہو رہی تھی۔
بڑے نواب صاحب ناراض تھے، شادی کے لئے روپیہ کا انتظام مشکل تھا۔
انجو بی نے بھائی سے کہا، تم زیادہ فکر نہ کرو۔ بس نتھ ٹیکا اور جڑاؤ جھلنیاں
بنوالو۔ اوپر کے خرچ کے لئے دو ڈھائی ہزار کافی ہوگا، وہ لوگ بھی دھوم دھام
زیادہ نہیں کریں گے۔ تمہاری شادی تو پہلی ہو ہی چکی ہے۔ اب تو دلہن کو بیاہ
لانا ہے۔

شاہرخ مرزا روپیہ لانے کے لئے بھول پور چلے گئے۔ انجو بی نے رنگ محل
آکر ذکیہ بیگم کا ایک بھاری فرشی پاجامے کا جوڑا نکالا۔ ایک کارچوبی جوڑا
ریت کا حاجی علی جان کے یہاں سرخ تیار کرایا۔ اپنی ساڑیاں دیکھیں۔ دہلی
آنے سے کچھ دن پہلے دس ساڑیاں نواب سورج گڑھ نے بمبئی سے منگوائی
تھیں۔ ان میں سے انھوں نے ابھی دو خوبصورت فرنچ ساڑیاں نہیں پہنی
تھیں وہ لیں۔ ایک قرمزی بھاری بنارسی ساڑی اور خریدی۔ اس طرح پانچ
جوڑے درست کیے۔ اپنے جہیز کے زیور میں سے موتیوں کے دست بند اور
موتیوں کا نکلس لیا۔ اور سب بری کا معمولی سامان درست کیا اور خود بھی
بھول پور چلی گئیں۔ ایک ہفتہ وہاں رہ کر دونوں بھائیوں اور عطن کو لے کر
واپس آگئیں۔

شاہرخ مرزا نے اس شادی کی خبر کسی کو نہیں کی۔ تاریخ عقد سے ایک
دن پہلے اپنے دونوں بھائیوں اور دیوان ریاست، سکریٹری کے ہمراہ ڈیرہ دون
گئے۔ انجو بی عطن کو لے کر موٹر سے گئیں۔ صبح یہ لوگ پہنچے۔ شام کو عصر مغرب
کے درمیان نکاح ہوا۔ دلہن والوں میں چند ہی مہمان تھے، زیادہ ہنگامہ
نہ تھا۔ نکاح کے بعد جلدی ہی کھانا ہو گیا۔ اور دلہن کو لے کر شاہرخ مرزا

دہلی آ گئے۔ بھوپپور ہاؤس میں آج رسمِ رونمائی تھی۔ پورے خاندان کی بیگمات یہاں جمع تھیں۔ منجھلے صاحب تو اسٹیشن پر ہی نواسہ بہو کو مع عزیزوں دوستوں کے لینے گئے تھے۔ انھوں نے دلہن کی صورت دیکھ کر ایک سو ایک روپیہ رونمائی کا دیا۔ منور مرزا، قیصر مرزا نے ایک ایک اشرفی دی۔ انجوبی نے سونے کے مینا کار خوبصورت کڑے۔ عظمیٰ نے جڑاؤ آرسی اور بنّو بی نے فیروزے کے بُندے دئے۔ سکندر زمانی بیگم، بڑی بہو صاحب، چھوٹی بہو صاحب آج جس وقت سے یہاں آئی تھیں منجھلی بہو صاحب کو یاد کر کے چشم پر آب تھیں۔ ان کو نواسے کا سہرا دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ کاش اس وقت وہ زندہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔

سارا دن مہمانداری رہی۔ شام کو سب رخصت ہوئے انجوبی اس سے خوش تھیں کہ ان کا کچھ روپیہ تو اُٹھا مگر بھائی کا گھر آباد ہو گیا۔ دلہن کی دل کش شکل کو سب ہی نے پسند کیا۔ وہ بھاری لباس اور زیور میں کافی اچھی لگ رہی تھی۔ شاہرخ مرزا بھی خاصے خوش تھے۔ منجھلے صاحب نے بہو کو سلطان دلہن خطاب دیا۔ دو روز بعد سکندر زمانی بیگم نے رنگ محل میں دولہا دلہن کو بلایا اور قریبی عزیزوں کو بھی بلایا۔ خوب شاندار دعوت کی۔ پھر چھوٹی بہو صاحب نے بلایا۔ آج کل شاہرخ مرزا کی شادی کے سلسلے کی دعوتیں چل رہی تھیں۔

ملکہ جہاں بیگم نے بھی دولہا دلہن اور ان کے ساتھ منور دلہن اور قیصر دلہن، بڑی بہو صاحب، چھوٹی بہو صاحب اور سکندر زمانی بیگم کو بلایا۔ بھلا بڑی بہو صاحب اور سکندر زمانی بیگم تو اس بلا کی سردی میں رات کو کہاں جاتیں۔ ہاں چھوٹی بہو صاحب بمعہ قیصر دلہن منور دلہن کے شام کے لگ بھگ

پہنچ گئیں۔

چھمو کو ہمیشہ نئی سوجھتی تھی۔ اس مبارک موقع پر بھلا وہ کب چوکنے والی تھی۔ دسمبر کی تعطیلوں میں ملکہ جہاں بیگم کے یہاں ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈرامہ کر چکی تھی۔ اب اس کو مشاعرہ کی سوجھی دو دن پہلے ہی ملکہ جہاں بیگم کو اس نے لکھ دیا تھا۔ پھوپی اماں اس دعوت میں بجائے گانے بجانے کے شعر و شاعری کا سلسلہ رہے گا۔ پھر جھٹ پٹ خود ہی مصرعۂ طرح سب لڑکے لڑکیوں کو دیدیا۔ اور پھر چھوٹی بہو صاحب کی خوشامد درآمد کر کے دن ڈھلتے ہی بمع ستارہ عظمیٰ کے ملکہ جہاں بیگم کے یہاں پہنچ گئیں۔

لڑکوں میں اس مشاعرے کی بدولت بڑی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ شہاب شاہرخ تو خیر شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر شاپور مرزا ٹھہرے مولوی، شعر کہنا ان کے اور نجمی میاں کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ مگر یہ دونوں بلا کے چلتے ہوئے تھے نجمی تو اک رشتے کے چچا کی خوشامد کر کے بہت اچھی غزل لکھوا لائے۔ اور شاپور نے آزاد شاعری پر مشقِ سخن کی۔ لڑکیوں میں بھی سوائے چھمو کے کہ وہ تک بندی کر لیتی تھی۔ عظمیٰ ستارہ بس یونہی تھیں، مگر چھمو تو غضب کی چیز تھی۔ اس نے ان دونوں کو اچھے خاصے شعر کہہ کر دیئے اور رٹا دیئے۔ عذرا خود بھی ٹوٹا پھوٹا لکھ لیتی تھی۔ پھر ملکہ جہاں بیگم نے اصلاح اس کے شعروں پر کر دی تھی۔ چھٹن صاحب کو چند شعر مزاحیہ کہہ کر چھمو نے ازبر کرا دیئے تھے لڑکوں کی پارٹی بھی مسلح ہو کر پہنچ گئی تھی۔ اب نواب چھولیور اور انجو بی کا انتظار تھا۔ یہ دونوں بمع دلہن کے مغرب کے بعد پہنچے اور بی چھمو نے نہایت سنجیدہ انداز سے کھڑے ہو کر مشاعرے کا اعلان کیا اور صدارت کی تجویز ملکہ جہاں بیگم کے لئے پیش کی۔ انجو بی نے اس کی تائید کی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے چھٹن صاحب نے مزاحیہ شعر سنائے یہ شعر ایسے تھے کہ سننے والوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ چھوٹے سے چھٹن صاحب جب ان اشعار کو مسخرا منھ بنا کر مٹک مٹک کر پڑھتے تو دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ شہاب کے خوبصورت چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کر کے چھٹن صاحب نے کہا۔ عرض کیا ہے ؎

اس بزم کے گلفام یہ حضرت ہی ہیں

میں بلاگردان ہوں ان ٹماٹر سے رخساروں کا

سب شہاب کی جانب دیکھ کر ہنسنے لگے۔ وہ نادم ہو کر خود بھی کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ چھٹن صاحب پڑھ چکے، قہقہوں کا طوفان تھا۔ تو نجمی میاں سنبھل کر پڑھنے بیٹھے۔ نجمی کے گلے میں بلا کا لوچ تھا اور آج تو مقابلے کی بات تھی۔ بڑے دلکش ترنم میں اس نے اپنی غزل سنائی۔ ہر شعر پر سب نے تحسین و آفرین کی۔ نجمی کے بعد ستارہ کا نمبر آیا۔ ستارہ بھی خاصا اچھا گا لیتی تھی۔ اس نے بہت اچھی طرح گا کر اپنی غزل سنائی اور داد پائی۔ عطن کی آواز بھی اچھی نہ تھی اور طبیعت بھی اس کی شرمیلی تھی۔ جلدی جلدی تحت اللفظ اس نے اپنے شعر سنائے، جیسے کوئی سبق پڑھتا ہے۔ اور شرم کے مارے اس کا منھ لال ہو گیا۔ عطن کے بعد شہاب کی پرسوز آواز دلوں کو برمانے لگی۔

شاہرخ مرزا نے ایک رباعی پڑھی اور عذرا نے بہار پہ نظم بہت اچھی طرح پڑھی۔ شاپور مرزا نے آزاد شاعری کی پیروڈی کی تھی۔ بالکل مشاعرے کے شعراء کی طرح ہاتھوں کے اشاروں سے سر ہلا کر شعر ادا کرتے تھے۔ اور نجمی اور چھٹن صاحب نے واہ واہ کا غل مچا کر گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ آخر چھمو نے جل کر کہا:۔ "توبہ ہے شاپور تم تو بالکل بھانڈ بنے ہوئے ہو۔ ختم بھی کرو اب

اپنی غزل۔

اور شاپور میاں اکڑ کر بولے:۔ "اجی جناب یوں کہیئے ناکہ ایں جانب جیسا پختہ کلام کسی کا بھی نہیں ہے۔ اسی لئے آپ کو جلن ہو رہی ہے۔

شہاب مسکرا کر بولا۔ خیر یونہی سہی۔ اب یہ بحرِ طویل ختم بھی ہوگی یا نہیں؟

شاپور نے اترا کر جواب دیا۔ ارے میاں یہ کوئی تُک بندی نہیں ہے۔ آزاد شاعری ہے آزاد! جس کی وسعت بے پناہ ہے۔

ملکہ جہاں بیگم ہنس کر بولیں۔ اچھا شاپور میاں اپنی شاعری پھر کبھی سُنانا۔ اب تو کھانے کا وقت ہے ختم کرو۔

شاپور نے کہا۔ بہت اچھا دادی اماں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اور کاغذ جیب میں ڈال لیا۔

ملکہ جہاں بیگم نے بھی چند اشعار سُنائے۔ طرح مصرع پر گرہ انھوں نے بہت اچھی لگائی تھی۔ ان کے کلام پر مشاعرہ ختم ہوا۔ وقت کافی گذر گیا تھا دسترخوان بچھتے بچھاتے دس بج گئے۔ کھانا بہت پُر تکلف اور کئی قسم کا تھا۔ اس کے علاوہ چٹنی آچار مربّے ورقی سموسے اور حلوے بھی تھے۔

بارہ بجے کے قریب اور سب رخصت ہوئے۔ چھوٹی بہو صاحب مع چھمو کے رہ گئیں۔ ملکہ جہاں بیگم اور چھوٹی بہو صاحب کے مراسم بہت گہرے تھے۔ اکثر یہ ان کے یہاں وہ ان کے یہاں دو چار دن آکر رہتی تھیں۔ پھر بھلا اس سردی میں کیوں رات گئے جاتیں۔

چھمو تو خدا سے چاہتی تھی کہ یہاں رہے۔ ملکہ جہاں بیگم کے یہاں پُرانی معاشرت کے ساتھ نئی چیزوں سے بھی واقفیت ہوتی۔ وہ بہت سمجھدار اور ذہین بیوی تھیں۔ دہلی کی اعلےٰ زنانہ سوسائٹی کی روحِ رواں تھیں۔

عورتوں کا کوئی جلسہ یا کانفرنس ایسی نہ تھی جس میں وہ شرکت نہ کرتی ہوں، ایسے موقعوں پر وہ چھمو کو ہمیشہ اپنے ساتھ لیجاتی تھیں۔ زنانہ کلب کی وہ صدر تھیں اور ہر ہفتہ وہاں وہ ضرور چھمو کو لے کر جاتی تھیں۔ اسی لئے چھمو بھی ان سے بہت محبت کرتی تھی۔

(۲۲)

اگست کا مہینہ تھا۔ دلّی میں اگست کا موسم بہت جنون انگیز ہوتا ہے صبحیں سہانی ہوتی ہیں اور شامیں پُرکیف! یہ مہینہ اور بھی دلآویز جھمو کے لئے اس لئے ہو گیا تھا کہ اس کے سب ساتھی ان دنوں دہلی میں ہی تھے۔ پُھولپور میں گرمی دلّی سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے نواب پھولپور بمعہ بیگم کے جون کے پہلے ہفتے میں حسبِ معمول شملہ چلے گئے تھے۔ قیصر دلہن، بنوبی، عطن ستارہ گئی تو اُن کے ساتھ تھیں۔ لیکن بنوبی کی طبیعت شملہ جا کر ایک دن بھی ٹھیک نہیں رہی۔ ان کو روزانہ دست آجاتے تھے۔ بالآخر جولائی کے آخر میں قیصر دلہن بنوبی اور ستارہ کو لے کر دلّی آگئیں۔ عطن بھی ان کے ساتھ آگئی۔ علی گڑھ کالج کی تعطیلیں تھیں۔ شہاب نجمی بھی دلّی میں تھے۔

شاپور مرزا کا بھی شملہ میں تنہا دل نہ لگا وہ بھی آ گئے۔ اور اب یہ پورا گروہ آج کل موسم کی دلآویزیوں کا ذوق وشوق سے لطف لے رہا تھا۔ کبھی سب ساتھ مل کر سیریں کرتے، کبھی سینما دیکھتے اور کبھی پکنک کرتے۔

آج شام کو جھمو اور شاپور کی پارٹی میں بیت بازی کا مقابلہ ہونا تھا۔ اور یہ بیت بازی شاپور کے مسخرے پن کی وجہ سے بہت تفریحی دلچسپ

بن جاتی تھی بچھو کو تو اچھے اشعار بہت از بر تھے اور ستارہ عظمٰی بھی لڑکوں کو شکست دینے کے لئے خوب شعر رٹ لیتی تھیں۔

شہاب کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا ہر موقعہ محل کے شعر اس کو یاد تھے۔ مگر شاپور میاں ٹھہرے نخرے اندر نجمی باتونی، بس دونوں اپنی چالاکی سے جیت لیتے تھے۔ شاپور کا قاعدہ تھا کہ جب اس کے ساتھیوں کے پاس اشعار کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور ہارنے کی نوبت آ جاتی تو پہلے تو خوب خوب اپنی تعریف کرتا۔ نجمی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا اور پھر ایک نہایت بیہودہ سا شعر پڑھتا۔ بچھو شاپور کے اس بھانڈ پنے سے جل جاتی' اور ان دونوں میں خوب تو تو میں میں ہوتی۔ اس وقت بھی بیت بازی کا مقابلہ دونوں پارٹیوں میں ہو رہا تھا۔ شرط یہ تھی کہ جو پارٹی ہارے گی دوسری پارٹی کو انڈے کی گرما گرم گولیاں کھلائے گی۔ شاپور مرزا میں اور اوصاف کے ساتھ ندیدے پن کا وصف بھی تھا۔ جہاں کہیں کھانے پکوان کا ذکر ہوا ان حضرت کی رال ٹپک پڑی۔ اس لئے اس وقت انڈے کی گولیاں کھانے کی خوشی میں یہ جیت لینے کے لئے بڑا زور لگا رہے تھے۔ مگر بے چارا شہاب ان دونوں نجموں کو کہاں تک بچاتا۔ لڑکیاں ایک سے ایک تیز۔ شعر ادھر دانے پورا پڑھنے نہیں پاتے تھے کہ ادھر جواب موجود۔ آخر شاپور کی پارٹی ہارنے لگی اور شاپور نے اپنی بہت تعریف کی۔ نجمی نے ہائے وائے کے نعرے مار کر کیا کہا خوب فرمایا ہے آپ نے اُستاد!

شاپور نے جما جما کر — یہ شعر پڑھا۔

رات بھر انڈے پکائے پھر بھی کچے رہ گئے
سارے شاعر مر گئے اُلو کے پٹھے رہ گئے

چھمو نے تنک کر کہا۔ واہ شاپور تم کو شرم تو نہیں آتی یہ گھٹیا شعر دیتے ہوئے۔

مگر شاپور مرزا کی شرماتی جوتی۔ پھر اپنی شان میں قصیدہ خوانی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پھر گاڑی اٹکی تو شاپور مرزا نے بھونڈی آواز میں گاتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یہ احوال

چھمو جل کر بولی خدا سمجھے تم سے شاپور یہ نگوڑے شعر بھلا بیت بازی کے ہیں۔ جاؤ ہم نہیں کرتے بیت بازی۔

اور شاپور مرزا نے تالی بجا کر کہا ہار گئیں تو لگیں باتیں بنانے۔ کھلاؤ اب اندرسے کی گولیاں۔

اور چھمو نے کہا شرم تو آتی نہیں تم کو ایک تو ہار گئے اور گولیاں مانگ رہے ہو۔

شہاب نے کہا۔ اچھا بھئی چلو۔ ہم ہار مانے لیتے ہیں۔ اور نجمی میاں نے تان لگائی ؎

جو شہسوار ہیں گرتے ہیں وہی گھوڑے سے

اور چھمو بولی۔ ہاں بھئی نجمی اب تو گانا سناؤ۔ موسم بھی بہت پیارا ہو رہا ہے۔

نجمی ہارمونیم سنبھال کر گانے لگا۔

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

غالب کی غزل برسات کی دل کش رنگین شفق آلود شام گانے والا نجمی

جیسا خوش گلو، سماں بندھ گیا۔

شعر و نغمہ چھمو کی جان تھے وہ جھومنے لگی۔ اور سب بھی لطف لے رہے تھے نجمی گاتا جاتا اور شوخ نظروں سے ستارہ کو دیکھتا جاتا تھا۔ ستارہ کا شگفتہ چہرہ خوشی اور حجاب کے ملے جلے جذبے سے سرخ ہو رہا تھا۔ نجمی ستارہ کو چاہتا ہے اس سے سب ساتھی واقف تھے۔ یہ دونوں ساتھ کے کھیلے اور ہم سن تھے۔ طبیعت بھی دونوں کی بہت ملتی تھی۔ دونوں خوش مذاق گانے کے شوقین اور بلا کے ہنسوڑ تھے۔ ان کے دلکش نغموں اور ہنسی کے زمزموں سے رنگ محل کے در و دیوار گونجتے رہتے تھے۔

چھمو کو یہ شوق تھا کہ وہ اپنے ہم مذاق اور ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ ہنستی اور کھیلتی رہے۔ شعر و موسیقی کے پروگرام ہوتے رہیں

یوں تو سکندر زمانی بیگم کے خاندان میں عورت مرد سب ہی خوش شکل تھے۔ یہ خاندان اپنے حسن و جمال کے لحاظ سے پوری دلی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ لیکن شہاب اور نجمی دونوں بھائی تو رعنائی اور زیبائی کے نادر شاہکار تھے۔ ان کی مرحومہ ماں کے بے مثل حسن کی تعریف سن کر ہی شہباز مرزا نے خاندان سے باہر شادی کی تھی۔

شہباز مرزا چاہتے تھے کہ ان کی بیوی بڑی بھاوج یعنی زکیہ بیگم سے حسن و جمال میں کم نہ ہو۔ اور واقعی انھوں نے بیوی حسین و مہ جبین پائی۔ دلہن کا جب گھونگھٹ الٹا تو اس حسن کی مورت پہ ان کی نظریں جمی ہی رہ گئیں اور ان دونوں بھائیوں کو یہ دلکش حسن اپنی ماں سے ہی ورثے میں ملا تھا۔ زکیہ بیگم کی طرح شہباز دلہن بھی بھری جوانی میں تین بچوں کو چھوڑ کر مر گئیں۔ چھوٹا لڑکا سلیمان تو باپ کی صورت تھا اور یہ دونوں ماں

میں ملتے تھے۔ شہاب کے خط و خال بہت تیکھے تھے اور متوسط قد چھریرے جسم کا، سرخ و سفید رنگ والا یہ نوجوان ہر محفل میں نگاہوں کا مرکز بن جاتا۔ نجمی اپنے لانبے قد گداز جسم اور شہابی رنگ کے باعث مردانہ رعنائی و وجاہت کا جیتا جاگتا دلپذیر نقش تھا۔ ابھی اس نے اپنی عمر کا اٹھارھواں سال بھی پورا نہیں کیا تھا مگر وہ پورا مرد لگتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی دلکش صورت اور خاندانی وجاہت پر دلّی کے کئی اچھے معزز لوگ اپنی لاڈلی لڑکیوں کے لئے ان کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔

شہاب سنجیدہ اور عقلمند تھا مگر نجمی میاں کی ساری عقل رومان میں ہی صرف ہوتی تھی۔ اور اپنے حسن پر وہ بہت نازاں تھے۔ بڑی شیخی بگھارتے تھے اسی لئے چھمو نے ان کو بے وقوف بنانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ کئی منظوم خط لکھ کر چھٹن صاحب سے نقل کرا کر ایک فرضی لڑکی کی جانب سے نجمی کو بھیجے۔ ان رنگین دلآویز خطوط نے نجمی کو بن دیکھے دیوانہ کردیا۔ ان کی فرضی محبوبہ مہ لقا نے دریا گنج کا پتہ خطوط پر لکھا تھا۔ اب نجمی میاں اپنی تمام شوخی بھول کر اکثر دریا گنج میں گھومتے رہتے تھے۔ لڑکیوں کا ان کی مجنونانہ حرکات دیکھ کر ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ اس طرح پورا مہینہ گزر گیا۔ اور شریر چھمو بے چارے نجمی کو بے وقوف بناتی رہی۔ آخر تالیوں اور قہقہوں کے شور میں پہلی اپریل کو سب ساتھیوں کے سامنے چھمو نے بتایا کہ مہ لقا کے پردے میں وہ خود نجمی کو بے وقوف بنا رہی تھی اور نجمی میاں اتنے نادم اور کھسیانے ہوئے کہ دوسرے دن ہی لاہور چلے گئے اور ڈیڑھ مہینہ بعد واپس آئے۔ مگر اب اس مضحکہ خیز واقعہ کو ہوئے کئی مہینے بیت چکے تھے۔ فی الحال تو نجمی میاں ستارہ کی محبت میں سرشار تھے۔ ستارہ نجمی کی طرح

حسین نہیں تھی۔ مگر اس کے ساتھ کی کھیلی ہوئی اور ہم مذاق تھی۔ پھر بدشکل بھی نہیں تھی۔ نقشہ موٹا سہی رنگ، تو خاصا صاف تھا۔ اس پر اس کی ہنسوڑ طبیعت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ شوخی شگفتگی کا نور چہرے پر لئے، شعلہ جوالا کی مانند ستارہ تمام دن چمکتی پھرتی تھی۔ چھمو کی ہر شرارت اور ہر کھیل میں ستارہ ساتھ رہتی تھی۔ چھمو نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن بنائی تھی۔ اس انجمن کے جلسے ماہانہ ہوا کرتے تھے ان جلسوں میں ادبی سباحثے بیت بازی کے مقابلے، ڈرامے سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ اس انجمن کی ممبر صرف دوشیزہ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے جس سہیلی کی شادی ہو جاتی اس سے انجمن جرمانے کے طور پر ٹی پارٹی تمام ممبران کو دلواتی اور پھر انجمن سے اس کا نام خارج کر دیا جاتا۔ چھمو نے اپنے ساتھیوں میں کبھی لڑکے اور لڑکی کی تفریق نہیں کی سب سے یکساں محبت کرتی تھی اور دلچسپی لیتی تھی۔ اس کی بے لوث محبت اور دلکش فطرت کو اس کے ہمسن بہت پسند کرتے تھے۔

اگست کے آخر میں نواب بھو بیور دلی آئے تو عظمیٰ ستارہ اور بنوّبی، قیصر دلہن بھی پھول پوران کے ہمراہ چلی گئیں۔ نجمی اب ایف۔ اے کرنے کے بعد ڈیرہ دون ملٹری کالج میں ٹریننگ لینے کے لئے جانے والا تھا۔ اس کا خوبصورت سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور اچھی صحت فوج میں جانے کے ہر طرح قابل تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ستارہ سے اس کی باقاعدہ منگنی کالج میں جانے سے قبل ہو جائے۔

چھمو اپنے خاندانی اقدار سے واقف تھی جانتی تھی کہ ان حالات میں کہ یہ دونوں ملتے رہے ہیں اگر نجمی نے ابھی پیغام دیا تو بڑی بوڑھیاں ناراض ہوں گی۔ اس لئے اس نے نجمی کو سمجھایا کہ فی الحال یہی بہتر ہے کہ ابھی بجز ڈل

نے چھتے کو نہ چھیڑو۔ ہم سب ساتھ مل کر کھیلتے رہے ہیں۔ ہماری ان چہلوں کو پہلے ہی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ وہ تو یوں کہو کہ بھائی جان روشن خیال ہیں جو مجھے منہ در منہ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ لیکن ادھر ادھر منہ جڑتے رہتے ہیں۔ اگر ابھی تمھارا پیغام گیا تو بہت گڑبڑ ہو جائیگی۔

مگر نجمی کے دل کو تو لگی ہوئی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ کہیں ستارہ کو اور کوئی نہ مانگ لے۔ اس لئے اپنے والد شہباز مرزا سے کہوایا کہ میرا پیغام ستارہ کے لئے بھجوا دیجئے۔ شہباز مرزا بھی ستارہ کو بہت پسند کرتے تھے انھوں نے بیٹے کے کہتے ہی پیغام ستارہ کے لئے قیصر دلہن کو بھیج دیا۔

قیصر دلہن کو بھی نجمی پسند تھا۔ مگر شاہرخ مرزا سے جب اس معاملے میں رائے لی تو انھوں نے کہا کہ میری رائے ہرگز نہیں کہ ستارہ نجمی سے بیاہی جائے۔ بیوقوف رومان پسند لڑکا ہے۔ یوں ستارہ آپ کی اولاد ہے آپ کو اختیار ہے۔ ہاں اگر شہاب کے لئے چچا جان ستارہ کو مانگتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

میاں کو قیصر دلہن صلاح مشورے کے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ خسر اور دیور کو لکھا۔ منجھلے صاحب تو مرنجان مرنج انسان تھے۔ انھوں نے لکھ دیا کہ خاندان کا لڑکا ہے۔ ستارہ کی طرح مجھے نجمی بھی عزیز ہے۔ اگر تم چاہتی ہو تو ضرور کر دو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

منور مرزا اور شہباز مرزا کی بنتی نہ تھی۔ ہمیشہ دونوں کی لاگ ڈانٹ چلتی رہتی تھی۔ انھوں نے اس رشتے کی سخت مخالفت کی۔ نجمی میں ہزاروں عیب نکالے اور کہا نجمی تو بہت چھچھورا لڑکا ہے اس کی صحبت تو خلیق رہتی

ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ستارہ کو بھی وہ بدنام کرتا پھرتا ہے۔ اگر اب اس کا پیغام منظور کر لیا گیا تو ہم منھ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ خاندان بھر میں ناک کٹ جائے گی۔ قیصر دلہن خسر کا خط پاکر مطمئن اور خوش تھیں کہ ستارہ کا حسب دلخواہ رشتہ ہو جائے گا۔ دیور کا خط پاکر پریشان ہوگئیں۔ اور عزت اولاج کی خاطر انکار کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

شہباز مرزا بیٹے کے اصرار پر خود بھوپال پور گئے اور قیصر دلہن سے کہا۔" بھابی تم کو جمی پر نہیں تو مجھ پر تو اعتماد کرنا چاہیئے۔ میں خود ستارہ کا کفیل ہوں گا۔ جیسے میری دو بیٹیاں وہ ہیں تیسری یہ ہوگی۔"

مگر قیصر دلہن کو ستارہ کی محبت سے زیادہ زمانے اور خاندان کا خیال تھا۔ انھوں نے کہا۔" بھائی آپ کا کہنا میں ہرگز نہ ٹالتی۔ مگر میں کیا کروں، کوئی بھی تو اس کی رائے نہیں دیتا کہ میں یہ رشتہ کروں۔ میں اب کس کس سے لڑوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جمی نے جو ڈھنگ اختیار کیا اس کی وجہ سے ستارہ کا رشتہ جمی سے ہونا ممکن نہیں۔ مجھے بھی اپنی عزت کا خیال ہے۔ اس لئے مجبور ہوں۔

شہباز مرزا دلی واپس آئے اور جمی افسردہ و پریشان ٹریننگ کے لئے ڈیرہ دون چلا گیا۔

قیصر دلہن کو ستارہ کی شادی جلدی کرنے کا اب ہر وقت فکر رہتا تھا۔ کنبے والوں نے ادھر ادھر منھ جوڑنے شروع کر دئے تھے۔ بڑی بہو صاحب نے تو صاف کہہ دیا کہ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکے لڑکیوں کا یہ ہر وقت کا ساتھ ضرور کچھ رنگ لائے گا۔

مگر اور سب کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چھوٹی بہو صاحب کو

بھی چھمو پر خفا ہونے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے جھنجھلائی سے کہا۔ بھابی بیگم سارا قصور اس آپ کی لاڈلی کا ہے اور قمر اس کو منع ہی نہیں کرتے میں بھی روکتی ہوں تو وہ برا مانتے ہیں۔ ادھر آپ نے سر چڑھا رکھا ہے نہ یہ مشاعرہ ڈرامہ اور گانا بجانا ہر وقت کرتی نہ یہ ہوتا۔ خدا میری آبرو رکھے۔ اس لڑکی نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

چھمو بھلا کب چوکنے والی تھی اطمینان سے بولیں "میں تو اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہمیشہ سے کھیلنے کی عادی ہوں کسی اور کے دل کا حال میں کیا جانوں اور اگر نجمی سے ستارہ کی شادی ہو جاتی تو ہرج ہی کیا ہوتا۔ نجمی نے شادی کا پیغام ہی تو دیا تھا برائی کیا کی تھی۔ آخر شادی کے لئے لڑکی کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ تو شرعی حکم ہے۔ پھر یہ کیا ایسا گناہ تھا"

چھوٹی بہو صاحب نے کہا "بس بس بس تمہارے منہ نہیں لگتی۔ دیکھا بھابی بیگم آپ نے۔ اس لڑکی کی زبان میرے بھئی قینچی کی طرح چلتی ہے۔"

بڑی بہو صاحب نے گھور کر چھمو کو دیکھا اور بولیں "چھمو چپ ہو۔ خبردار، ماں سے زبان چلاتے شرم نہیں آتی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم تو سدا کی کھلنڈری ہو۔ مگر میری چاند! اب تمہارا بچپن نہیں۔ کہنے والوں کا منھ کوئی نہیں پکڑا کرتا۔ لڑکیوں کو سب طرح کا خیال رکھنا چاہیئے" چھمو بھلا اپنی پیاری چچی اماں کی بات کا برا کیوں مانتی۔ اگر ماں نہ ہوتیں تو وہ حسب عادت ان کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاتی۔ مگر چھوٹی بہو صاحب کے تیور ابھی تک بگڑے ہوئے تھے اس لئے وہ یہاں سے ٹل گئی۔

ستارہ کے لئے قیصر دلہن کی خالہ زاد بہن نے جو ایک دیہات میں بیاہی ہوئی تھیں اپنے اکلوتے بیٹے کا پیغام دیا تو ان کو غنیمت معلوم ہوا۔

انھوں نے جھٹ منظور کر لیا۔ لڑکا اکلوتا تھا اس لئے ماں باپ کا بہت لاڈلا اور خودسر تھا۔ تعلیم بھی اس کی واجبی تھی۔ اور ماں کو وہ بالکل خاطر میں نہ لاتا تھا۔ قیصر دلہن کو اگر خاندان والوں کا خیال نہ ہوتا تو ہرگز ستارہ کو دیہات میں نہ بھیجتیں۔ مگر اب صورتِ حالات سے مجبور ہو کر ان کو ایسا کرنا پڑا۔ سکندر زمانی بیگم نے اس جگہ رشتہ کرنے کی سخت مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ستارہ کو دیہات میں اور ایسے نامعقول لڑکے سے بیاہا جائے۔ مگر منور مرزا نے بھاوج کی ہاں میں ہاں ملائی --- اور شاہ رخ مرزا نے بھی۔ قیصر دلہن کو کچھ ایسی ضد چڑھی کہ جھٹ پٹ انھوں نے ستارہ کا نکاح کر دیا۔

چھو نے ستارہ کو اس پیغام آنے کی خبر پا کر لکھا تھا۔ "تم بزدل نہ بنو اور ہرگز اس بے وقوف لڑکے سے شادی نہ کرو۔ جس کا ابھی تک تم مذاق اڑاتی رہی ہو ایسی شادی ہونے سے تمام عمر کنوارا رہنا بہتر ہے۔"

مگر ستارہ کچھ ایسی ماں اور چچا کے رعب میں آئی اور نجمی کے سلسلے میں جو اس کی فضول بدنامی ہوئی تھی اس کا اس نے ایسا اثر لیا کہ بالکل چپ سادھ لی۔ اس نے نجمی کی محبت کا ہمت سے جواب دے کر غیر معمولی جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن ماں کی ملامت آمیز نصیحت اور خاندان والوں کی طنزیہ نظروں اور باتیں بنانے کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اب وہ بے جان لاش کی مانند بے حس رہی۔ ستارہ کا نکاح پھول پور میں ہوا اور اس میں سوائے منور مرزا کے اور کسی نے شرکت نہیں کی۔ قیصر مرزا اپنے عزیز دوست نواب مالیر کوٹلہ کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ وہیں ان کو ستارہ کے نکاح کی خبر ملی اور انھوں نے کہا۔ ستارہ کو اس کی ماں

نے ایسی جگہ دیا ہے کہ وہاں وہ کبھی بھی خوش نہ رہ سکے گی۔

شہباز مرزا کو ستارہ کے عقد ہو جانے کی خبر ملی تو انھوں نے جھٹ پٹ نجمی کی منگنی کرنے کی ٹھان لی۔ نجمی پر اُن کے رشتے کے ماموں بہت ریجھے ہوئے تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے بھلا ان کو نجمی سے اچھا رشتہ اور کہاں ملتا۔ برابر اور عزیزوں دوستوں کے ذریعے شہباز مرزا کو پیغام دینے کے لئے کہواتے رہتے۔ نجمی جب بھی ان کے یہاں جاتا اس کی بہت خاطر کرتے۔ نجمی بھی ان کی لڑکی صنوبر سے مانوس تھا۔ مگر ستارہ سے واقعی اس کو دلی لگاؤ تھا اس لئے زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اب شہباز مرزا نے نجمی سے رائے معلوم کر کے صنوبر کے لئے پیغام بھیج دیا۔ اور نجمی کی منگنی ستارہ کے نکاح کے دو مہینے بعد ہی بہت دھوم دھام سے ہوگئی۔

(۲۴)

عطن بی نے اپنی عمر کا اٹھارواں سال ختم کیا ہی تھا کہ ان کی منگنی ۔۔۔
سلطان الملوک ولی عہد گلاب باڑی سے ہو گئی۔

عطن کی نسبت بچپن میں تو چھوٹی پھوپی کے یہاں ٹھہری تھی۔ مگر بھائی بہن میں کچھ رنجش ہوئی تو بہن نے صاف کہدیا میں تمہاری بیٹی نہیں لونگی اس کی شادی چاہے جہاں کرو۔ انجو بی کی شادی کے بعد عطن کے لئے برابر پیغام آرہے تھے۔ اپنوں میں سے بھی اور غیروں میں سے بھی۔ شاہرخ مرزا عطن کی شادی اپنے ایک آئی سی ایس دوست نسیم سے کرنا چاہتے تھے۔ دسہرے کے دربار پر نسیم ہمیشہ پھولپور آتا تھا۔ صحیح النسب خوش رو نوجوان تھا۔ انجو بی کو یہ خبط تھا کہ عطن کا رشتہ کسی والئی ریاست سے کریں اور شاہرخ مرزا کے بار بار کہنے پر بھی کہ آپا آپ عطن کی قسمت بھی اپنی طرح کیوں پھوڑنا چاہتی ہیں۔ نسیم کے ساتھ عطن بہت خوش رہے گی۔ وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔ عطن بےچاری بڑی بہن کے سامنے کیا بولتی۔ عمر میں انجو بی عطن سے صرف چار سال بڑی تھیں۔ لیکن ان کا رعب عطن پر بہت تھا۔ پھوپھو نے انجو بی کو بہت سمجھایا۔ چھوڑو اس فضول

خیال کرو۔ بے چاری عظمیٰ کی کیوں دشمن ہوئی ہو۔ تمہاری اپنی تو ردو کد گزر رہی ہے۔ پھر کیوں روپیہ اور امارت کی بھینٹ عظمیٰ کو چڑھانا چاہتی ہو مگر انجو بی اپنی احمقانہ ضد پر اڑی رہیں۔ چھوٹی بہو صاحب بھی قمر کے لئے عظمیٰ کو مانگنا چاہتی تھیں۔ اور اگر منجھلی بہو صاحبہ زندہ ہوتیں تو وہ ان سے کہتیں بھی۔ انجو بی کے منہ پر انہوں نے نہیں کہا، کہیں ایسا نہ ہو وہ انکار کر دیں تو بات بھی جائے۔

عظمیٰ کی دلکش جوانی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو بھلا کون پسند نہ کرتا لیکن انجو بی کی سمجھ میں جو پیغام آیا وہ ایک بہت بڑی ریاست کے ولی عہد کا تھا جس کی پہلی بیوی موجود تھی۔ محض اولاد کی خاطر نواب صاحب بیٹے کی دوسری شادی کرنی چاہتے تھے۔ بھیّا نے بمشکل ان کو روکا۔ کہا کیا غضب کرتی ہو۔ آخر بے چاری عظمیٰ نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ بھولی بھالی لڑکی کو محض ریاست کی خاطر سوکن پر دینا چاہتی ہو۔ آخر گلاب باڑی ایک چھوٹی سی ریاست کے ولی عہد کا پیغام آیا۔ گلاب باڑی سورج گڑھ اور پھول پور کے مقابلے کی نہ تھی مگر ہاں نواب گلاب باڑی بہت ہوشیار انسان تھے اور خدا جانے کن کن ترکیبوں سے انھوں نے لاکھوں روپیہ جمع کر لیا تھا۔ ان کی کافی جائداد بمبئی میں تھی۔ لڑکیاں تو تین تھیں مگر لڑکا ایک ہی تھا۔ سورج گڑھ والوں سے کچھ دور پرے کا رشتہ بھی ہوتا تھا۔ روپے کی ریل پیل اور اکلوتا لڑکا دیکھ کر انجو بی نے یہ پیغام عظمیٰ کے لئے منظور کر لیا۔ ایک سال قبل انجو بی نے بھیّا کو لکھا تھا کہ نواب گلاب باڑی ہمارے سرکار کے عزیز ہیں اور لاکھوں کے مالک، ان کا ایک ہی لڑکا ہے جو بی اے کے آخری سال میں ہے۔ بہت سیدھا نیک

ہے۔ البتہ صورت بے چارے کی معمولی ہے۔ کہو تو اس کا پیغام تمہارے لئے بھجوا دوں۔

جگنو نے جواب دیا۔ تمہاری محبت اور خیال کا شکریہ! مگر میں کسی لاکھوں کے مالک سے خود کو روپے پر قربان کرنے کے لئے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ جب تک کہ مجھے کسی کی ذات سے دلچسپی نہ ہو۔ اور ابھی تو میں شادی کا خیال ہی نہیں کرتی۔ تعلیمی مشاغل میں مصروف ہوں۔ ہرگز تم یہ پیغام میرے لئے نہ بھیجنا۔

انجو بی نے سمجھا کہ جگنو کا دماغ کثرتِ مطالعہ کے باعث چل گیا ہے۔ خود کو افلاطون دوراں سمجھتی ہے کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔

پچھلی مرتبہ جب وہ پھولپور آئیں اور ستارہ نجمی کے رومان کی کہانی انھوں نے بھی سنی تو اُن کو اس کا خیال ہوا کہ کہیں عظمیٰ پر بھی اس کا اثر نہ پڑے۔ جوان خوبصورت لڑکی ہے نہ ماں زندہ ہیں نہ نانی ہیں ... میں کالے کوسوں پردیس رہتی ہوں۔ ممانی ہیں تو وہ ایک کی چار لگانے والی۔ اس لئے انھوں نے بہتر سمجھا کہ عظمیٰ کی شادی جس قدر جلد ممکن ہو کر دیں۔ اتفاق کی بات کہ کوئی معقول پیغام دو چار مہینے سے نہیں آیا تھا۔ انجو بی جب ایک بات کا ارادہ کر لیتی تھیں تو اسے کر کے چھوڑتی تھیں۔ نتائج کی پروا انھوں نے کبھی نہیں کی۔ اب بھی انھوں نے میاں کو لکھا کہ نواب گلاب باڑی سے کہہ کر عظمیٰ کا پیغام بھجوا دو۔ بھلا نواب گلاب باڑی کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ انھوں نے پیغام کا خریطہ اپنے دیوان کے ہاتھ پھولپور بھیجا۔ شاہرخ مرزا سے انجو بی ذکر کر چکی تھیں۔ دل سے تو وہ یہاں عظمیٰ کی شادی نہ کرنی چاہتے تھے مگر بڑی بہن سے مجبور تھے پیغام

آتے ہی منظور کر لیا گیا۔ انجو بی کو عطن کی شادی کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ گلاب باڑی والوں کی ہر بات مانتی چلی گئیں۔ ذرا بھی چیل حجت نہیں کی بہر بھی عطن کا چالیس ہزار کا مان لیا۔ منگنی ہوتے ہی عطن کی شادی دو مہینے بعد نومبر میں ٹھیر گئی۔

شاہرخ مرزا کو عطن کی منگنی سے پانچ مہینے پہلے ہی ریاست کے پورے اختیارات ملے تھے۔ اس لئے انھوں نے بہن کی شادی پوری شان و شوکت سے کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انجو بی تو جب سے نواب بیگم بنی تھیں جب بھی اپنے لئے کپڑا خریدتیں جو کپڑا یا ساڑی ان کو زیادہ پسند ہوتی عطن کے جہیز کے لئے بھی لے لیتیں۔ اب انھوں نے یہ چیزیں نکال کر دیکھیں تو گیارہ ساڑیاں اور بارہ جوڑوں کا کپڑا تھا۔

عطن کی منگنی ہونے کے چند دن بعد ہی وہ چھو لیور سے دلی آ گئی تھیں۔ ٹھیریں تو بھو لیور ہاؤس میں تھیں لیکن روزانہ صبح کو رنگ محل آ جاتی تھیں۔ بڑی بہو صاحب، چھوٹی بہو صاحب کے مشورے سے دو مغلانیاں عطن کے جوڑے ٹانک رہی تھیں۔ برتن اور زیور خریدے جا رہے تھے۔ غرضکہ مار مار کر کے انجو بی نے جہیز عطن کا تیار کر ہی لیا۔ ماں کے زیور میں سے عطن کے حصے میں ہیرے زمرد کی جھلنیاں، ست لڑا اور دست بند آئے تھے۔ جھومر سلطان دلہن کی جانب سے تھا۔ اس کے علاوہ ایک سیٹ یاقوت موتی کا اور سونے کے بلدار کڑے، چندن ہار، سونے کی جھانجن چوڑیاں۔ اور نواب شاہرخ مرزا نے تیار کرائے۔ انجو بی نے عطن کی شادی دلی میں کرنی بہتر سمجھی تاکہ سب رشتے دار شریک ہو سکیں۔ اور شاہرخ مرزا کو بہر حال بڑی بہن کے ہر حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ وہ شادی سے ایک ہفتہ قبل بھو لیور سے بعد ریاستی

خدم وحشم فراش، چوبدار، اہلکاروں کو لیکر آ گئے۔ بارات کے لئے ایک بڑی کوٹھی دریا گنج میں لے کر سجائی گئی۔ نواب سورج گڑھ کے لئے الگ ایک کوٹھی آراستہ کی گئی۔ عطن بی کی شادی بہت دھوم سے رچی۔ صالحہ بیگم۔ جبن بی۔ منجو بی اور تینوں پھوپھیوں دونوں چچیوں کو بھی انجو بی نے بلایا۔ اپنے دیور اور دیورانی کو مدعو کیا۔

تاریخ عقد سے دو روز پہلے عطن کو مائیوں بٹھایا گیا۔ انجو بی سنہرے ٹشو کی بھاری ساڑی پہنے تھیں۔ اس لئے ابٹن کھیلنے والوں سے کہتیں اے بھئی میرے قریب نہ آنا۔ ایسا نہ ہو کہ میری قیمتی ساڑی بھی تم لوگ خراب کردو۔ مگر چھمو بھلا کب ماننے والی تھی۔ ان کی ساڑی تو اس نے خراب نہیں کی مگر منھ اور سر پر ابٹن لیتھیڑ دیا۔ ستارہ کی وداع عطن کی شادی سے ایک مہینہ قبل ہو چکی تھی۔ وہ عطن کی شادی میں سسرال سے وداع کے بعد پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ پچھلی باتوں کو بھلا کر ستارہ اب اپنی ازدواجی زندگی میں مگن نظر آتی تھی۔ ہر وقت زرق برق کپڑے پہنے گہنوں سے لدی ستارہ اترا اترا کر اپنے میاں کا ذکر ہمجولیوں سے کرتی رہتی تھی۔ چھمو کو ستارہ کا یہ چھچھورپن بالکل عجیب لگتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ بے چاری ستارہ خود کو سمجھانے کے لئے ایسا کرتی ہے۔ اسے اس ظالم سماج کی بندشوں میں جکڑی لڑکی پر رحم آتا۔

نجمی سے ستارہ اب پردہ کرتی تھی۔ مگر مائیوں کے ہلڑ میں کسی کا پردہ بھلا رہ سکتا تھا۔ سب لڑکے قیصر دلہن کے ہاں ہاں کرتے کرتے اندر گھس آتے۔

سکندر مرزا کی منگیتر امینہ شرم کے مارے انجو بی کے پیچھے چھپ گئی۔

ستارہ بھی کو دیکھ کر بھاگنے والی تھی کہ اس شریر لڑکے نے جھپٹ کر اس کی چوٹی پکڑ کر اٹین اس طرح اس کے منہ پر ملا کہ آنکھوں میں بھی بھر گیا اور پھر شاپور کے پیچھے بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ چھموان دونوں کی یہ آنکھ مچولی دیکھ کر مسکرا دی اور اس نے زیرِ لب کہا کاش! ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن شہاب اس وقت اس مجمع میں نہیں تھا۔ چھمو اٹین کھیلنے والوں سے بچتی ہوئی شہاب کی تلاش میں چلی۔ باہر کے وسیع برآمدے کے اندھیرے حصے میں شہاب کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں چمکتے ہوئے ستاروں پہ جمی ہوئی تھیں۔ اور ہاتھ میں جلتا ہوا سگرٹ انگلی تک آ گیا تھا۔ مگر اس کو خبر نہ تھی۔ چھمو نے اس کے قریب پہنچ کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ارے بھئی شہاب تم بھی پورے فلسفی ہو گئے ہو۔ بھلا اس وقت جب سب کھیل رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں تم یہاں تنہا کھڑے کیا سوچ رہے ہو۔ شاہرخ اور شاپور بھی تم کو ڈھونڈ رہے تھے۔

شہاب منہ سے کچھ نہ بولا۔ ایک سرد آہ لے کر اس نے سر جھکا لیا۔ چھمو جانتی تھی کہ شہاب اپنی بنت عم کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس مغموم نوجوان کی مدد کس طرح کر سکتی تھی۔ یوں تو شہاب چچا زاد بھائی اور عطن کے ہر طرح لائق تھا۔ مگر اس کے پاس صرف بی۔اے کی ڈگری خاندانی وجاہت اور دلکش صورت تھی۔ اس کے باپ کو ریاست سے ڈھائی سو روپے ماہوار الاؤنس ملتا تھا اور وہ پنشنر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لاکھوں کے آدمی نہ تھے۔ سوائے ایک کوٹھی کے اور کوئی جائداد ان کے پاس نہ تھی نہ بنیک میں ان کا روپیہ تھا۔ شہاب بھی اگر ملازم ہو جاتا تو چار پانچ سو کا۔ بھلا عطن کو وہ کیسے پا سکتا تھا۔ جس کے لئے آئی۔سی۔ایس کا پیغام بھی

مسترد کر دیا گیا۔ چچا زاد بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ عطن کا حقدار سہی لیکن شادی کی منڈلی میں تو وہ بالکل ایک مفلس قلاش کی مانند تھا۔ پھر وہ کس منھ سے عطن کی آرزو کرتا۔ ہاں اس کا دل اپنی ساتھ کی کھیلی چچا زاد کو بھولنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ورنہ بے چارے شہاب نے کبھی بھی اپنی محبت کا اظہار نہ کسی اور سے کیا نہ عطن پر۔ وہ دل ہی دل میں اس کو والہانہ چاہتا رہا۔ نجمی کی محبت کا حسرت ناک انجام اس کے سامنے تھا اور ہر دم اس کو یہ خیال رہتا تھا ''ایک دن عطن بھی اسی طرح بیاہ دی جائیگی''۔ اور وہ گھڑی جس کا اس کو خوف تھا، سر پر آپہنچی تھی۔

چھمو نے محبت آمیز لہجے میں کہا ''شہاب! میں جانتی ہوں تمہارے دل کی اس وقت کیا کیفیت ہے۔ مگر میرے عزیز! انسان پیدا ہی درد و آلام اُٹھانے کے لئے ہوا ہے۔ اور آدمی وہی ہے جو اس دنیا کے مصائب کو ہنس ہنس کر برداشت کر لے''۔ شہاب نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا ''جی ہاں۔ آپ کا کہنا درست ہے۔ میں اپنے دل کو اس قابل بنانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بجائے رونے کے مسکرا سکوں۔ مگر ابھی یہ نادان بچے کی طرح مچل رہا ہے۔ میرے قابو میں نہیں آتا۔ اس لئے مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ یقین ہے ایک دو دن بعد میں اس کو قابو میں کر لوں گا۔ ویسے آپ کی ہمدردی اور محبت بھری تسلی نے مجھے بہت ہمت دلائی ہے''۔ چھمو اس یاس آمیز فقرے کا کیا جواب دیتی۔ دل ہی دل میں شہاب کی حالت پر افسوس کرتی ہوئی واپس آگئی۔

اُبٹن کا ہنگامہ اب ختم ہو چکا تھا۔ بڑی بہو صاحب حسب معمول لڑکے لڑکیوں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اور یہ سب کھوں کھوں کھل کھل کرتے

بھاگ رہے تھے۔ چھمو کی طبیعت اب بے کیف ہو گئی تھی اس لئے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور پلنگ پر چپ چاپ جا کر لیٹ گئی۔ شہاب کے متعلق سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

دوسرے دن صبح ہی بارات کی پیشوائی کے لئے تمام عزیز اور اہلکارانِ ریاست اسٹیشن گئے۔ چھمو انجوبی کے ساتھ عظمیٰ کا جہیز کمرے میں لگواتی رہی۔ شام کے لگ بھگ انجوبی مع سلطان دلہن اور ستارہ امینہ کے دولہا کے لئے اٹیچی کا سامان لے کر گئیں۔ چھمو سے انھوں نے چلنے کے لئے بہت کہا مگر اس نے دردِ سر کا عذر کر دیا۔ وہ کچھ عظمیٰ کی شادی سے خوش نہیں تھی۔ ہر وقت اس کے سامنے شہاب کا غمگین خوب صورت چہرہ رہتا تھا

رات کو آٹھ بجے دولہا والیاں سانچق لے کر آئیں۔ بھاری بھاری چودہ جوڑے، جڑاؤ بیش بہا کشتی بھرے زیورات۔ پھولوں کی چھڑیوں سے ستارہ اور امینہ کے ساتھ چھمو نے بھی سمدھنوں کی خبر لی۔

ہال میں ایک مخملی مسند پر انجوبی اور سلطان دلہن بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس ہی عظمیٰ کی ساس اور چچیا ساس آ کر بیٹھیں۔ چھمو کو گہرے سانولے رنگ کی یہ فربہ اندام مغرور عورت بالکل پسند نہیں آئی۔ جبیں کی تیوری کا بل اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی کے وقت بھی برقرار تھا۔ اس کی بات چیت کے انداز سے تمکنت اور رعونت ٹپکتی تھی۔ اسی لئے چھمو نے شربت پلانے میں حصہ نہیں لیا۔ عظمیٰ کے کمرے میں چلی گئی۔

عظمیٰ کو منور دلہن قرمزی رنگ کے زرکار لباس میں لے کر آئیں۔ ساس نے مصری کی ڈلی منہ میں دی۔ پھولوں کا گہنا پہنایا۔ ایک دو چیزیں زیور میں سے اٹھا کر پہنا دیں۔ نچھاور کی رسم کے بعد دلہن کو

اُٹھا کر منور دلہن لے گئیں۔

کھانا میزوں پر دوسرے کمرے میں لگادیا گیا تھا۔ کھانا کھا کر سمدھنیں رخصت ہوئیں تو چھمو باہر نکلی۔

صبح ہوتے بارات بہت دھوم سے آئی اور دن کے نو بجے نواب زادی عشرت آرا بیگم کا عقد ولیعہد گلاب باڑی سلطان الملوک سے ہو گیا۔ نکاح کے وقت اور سب رسمی طور پر آبدیدہ تھے مگر چھمو یہ سوچ کر رو رہی جا رہی تھی کہ بے چاری عطن کو محض دولت کی خاطر بغیر سوچے سمجھے قربان کیا گیا ہے۔ خود عطن بھی روتے روتے بے حال ہو رہی تھی۔ منور دلہن اور سلطان دلہن نے اس کو مشکل سے سنبھالا۔ زیور کپڑے پہنائے۔

دولھا آرسی مصحف کے لئے آگیا۔ زرتار سہرے اور پھولوں کے سہرے میں دولھا کا گہرا سانولا رنگ جھلک رہا تھا۔ آرسی مصحف کی رسم کے وقت جب دولھا نے دونوں سہرے اُلٹے تو چھمو نے دیکھا کہ دولھا بالکل اپنی ماں پر بھونڈی صورت کا ہے۔ اپنے گداز جسم چھوٹے قد اور اس صورت پہ زرکار لباس پہنے بھاری مندیل اور مرصع کلغی دوہرے سہروں میں وہ کسی ادنےٰ درجے کے تھیٹر کا مسخرا معلوم ہو رہا تھا۔ چھمو کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ہائے بے چاری عطن کی قسمت ـــ" چاند کو گہن لگ گیا۔ انجو نے بہن کی قسمت محض دولت کی خاطر پھوڑ دی۔ خدا اس کو اب اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی ہمت عطا فرمائے۔ آرسی مصحف کے بعد انجو بی سمدھنوں کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں عطن کا جہیز سجایا گیا تھا۔ اس بھاری شاندار جہیز کو دیکھ کر بھی دولھا کی ماں کے منھ پہ شگفتگی نہیں آئی۔ کھانا کھانے کے بعد رخصت کی تیاری ہو گئی۔

چھمو نے اس وقت وہ نظم رخصتی پڑھ کر سنائی جو اس نے عطن کی رخصت پر لکھی تھی۔ عطن تو خیر رو ہی رہی تھی۔ اس رخصتی نظم کے درد بھرے انداز پر انجو بی تارہ بھی رونے لگیں۔ خود چھمو کا فورِ رقت سے برا حال تھا۔ شاہرخ مرزا بہن کی وداع کے وقت اندر آئے تو ان کے ساتھ نانا چچا ماموں بھائی سب ہی تھے۔ شہاب اس وقت سفید جامہ وار کی شیروانی اور ایسی ہی چوگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سڈول جسم پر یہ لباس بہت زیب دے رہا تھا۔ سوکھے ہوئے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چھمو نے دل میں شہاب کو دیکھ کر کہا۔ موزوں جوڑ عطن و شہاب کا ہو سکتا تھا مگر "ایسے خواب تو تشنۂ تعبیر ہی رہ جاتے ہیں۔" مشرق کی کنواریوں کے خوابوں میں خوبصورت شہزادے آتے ہیں۔ اور ان خوابوں کی تعبیر ان کو کالے دیو کی صورت میں ملتی ہے۔

شاہرخ مرزا نے جھک کر روتی ہوئی بہن کی پیشانی چومی اور گلوگیر آواز سے خدا حافظ کہا۔ اور سب بھی باری باری ملے۔ آخر شہاب کی باری بھی آ ہی گئی اس نے جلدی سے عطن کا سرخ چوڑیوں اور زیورات سے لدا ہوا مہندی لگا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر محبت سے دبا دیا اور دل کی شکل کا چاندی کا کشمیری کام کا عطر دان دیکر آہستہ سے کہا۔ "شادی مبارک! تم ہمیشہ شاد اور خوش رہو۔" اور پھر وہ ایکدم واپس چلا گیا۔ نجمی نے چھمو کے کان میں کہا۔ دیکھئے۔ وہ میاں فرہاد اپنی شیریں کو رخصت کر کے جا رہے ہیں۔ چھمو کو مسخرے نجمی کے منہ بنانے اور ایکٹنگ کرنے پر ہنسی آ گئی۔ اور اس نے کہا ہشت شریر تم بہت بیہودہ ہو۔ عطن شاندار جہیز لیکر شہاب کی حسرتوں کو پامال کرتی روتی ہوئی ڈھولوں باجوں شہنائیوں کے شور کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

چھمو کا دل یہاں اتنا گھبرا رہا تھا کہ عطن کی رخصتی کے بعد ہی وہ ماں پر تقاضہ کر کے ان کو لے کر رنگ محل واپس آ گئی۔

(۲۴)

عظمیٰ کی شادی کے بعد چھمو افسردہ سی رہا کرتی تھی۔ رنگ محل میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ سب بجو کیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ کوئی میکے آتی تو دو چار دن کے لئے دلی بھی آجاتی۔ اب چھمو کا سارا وقت درس وتدریس میں گزرتا تھا۔

مارچ کے شروع میں اس کو میعادی بخار ہوا اور تیرھویں دن حالت ایسی بگڑی کہ کپڑے پھاڑنے لگی اور بخار کی تیزی نے سرسامی کیفیت پیدا کردی۔ چھوٹی بہو صاحب چہیتی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان تھیں۔ بے تحاشہ روپیہ اس کے علاج میں صرف کر رہی تھیں۔ صدقے خیرات، نذر نیاز الگ۔ چھمو کی ولادت سے قبل دو لڑکے ان کے ہٹ گئے تھے۔ اس لئے چھمو کی زندگی کے لئے انھوں نے بہت منتیں مانیں، تعویذوں کی مالا بارہ سال کی عمر تک اس کے گلے میں ڈالے رکھی۔ ایک سال کی چھمو جب دانت نکلنے میں بیمار ہوئی تو چھوٹی بہو صاحب نے روپیہ ٹھیکری کردیا تھا۔ اس کے بعد تو چھمو کی صحت اتنی اچھی رہی اور ایسا اٹھان ایسا تھا کہ اپنی عمر سے بھی کچھ زیادہ لگتی تھی۔ وہ بہت اللہ آمین سے

بچی تھی۔ اس لئے ماں اس کو زیادہ ڈانٹتی بھی نہیں تھیں، اور بڑی چچی تو ہر وقت ہی اس سے لاڈ کرتی رہتی تھیں۔ اب جو چھمو بیمار ہوئی تو جتنی پریشان ماں تھیں، ان سے زیادہ بڑی بہو صاحب تھیں۔ رات دن چھمو کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ تسبیح پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتی رہتیں۔

قمر میاں بھی بہن کی علالت کی خبر پاکر دلی آئے۔ ان کے آنے کے چند روز بعد چھمو کا بخار اترا۔ لیکن اتنے دن کی بیماری نے اس کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ کہیں پندرہ روز بعد تو وہ اس قابل ہوئی کہ اٹھ بیٹھ سکے۔ چھمو حسین تو نہ تھی لیکن اس کے گندمی رنگ پر صحت کی سرخی تھی، اور اس کا شگفتہ چہرہ ہمیشہ پھول کی مانند کھلا رہتا تھا۔ اب اس طویل علالت نے اس کے رخساروں کی سرخی اور چہرے کی تازگی چھین لی۔ قمر میاں نے ماں کو مشورہ دیا کہ چھمو بہت کمزور ہوگئی ہے۔ اس کو تبدیل آب و ہوا کی بہت ضرورت ہے۔ محل کی گھٹی ہوئی فضا اور شدید پابندیوں کو اس کا کمزور جسم فی الحال برداشت نہیں کر سکے گا۔ ایسا نہ ہو کہ دوبارہ بیمار ہو جائے۔ بے بی کو بھی حیدرآباد کے اسکول میں داخل کر دینا چاہیئے۔ میں وہاں رہتا ہوں اور آپ سب یہاں یوں خرچ بھی دوگنا ہوتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اب میرے ساتھ چلیں۔ دادی اماں سے میں اجازت لے لوں گا۔ چھوٹی بہو صاحب نے بھی بیٹے کی خوشی اور چھمو کی صحت کی خاطر یہ تجویز مان لی۔

سکندر زمانی بیگم کو بہو اور پوتی کی جدائی شاق تھی۔ لیکن پوتے کی دل شکنی ان کو گوارا نہ تھی۔ چھمو کی مرجھائی ہوئی صورت کو وہ پھر بشاش دیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔

بڑی بہو صاحب کو بھی چھمو کا جانا بُرا لگ رہا تھا۔ مگر وہ بڑی مستقل مزاج بیوی تھیں، اس لئے خاموش ہی رہیں۔ چھوٹی بہو صاحب حیدرآباد جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

چھوٹی بہو صاحب پہ پھر چار ہزار کا قرضہ ہو گیا تھا۔ وہ ہزار ہاتھ روک کر اٹھاتیں، مگر کھلا ہوا دل پڑی ہوئی عادت، اور پھر کہاں ان کے ہاتھ میں ڈھائی تین ہزار روپے ماہوار آتے تھے۔ اور اب آٹھ سو روپے ماہوار ہی میں ان کو خرچ پورا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ہر مہینے سو پچاس بازار کا قرض رہ ہی جاتا تھا۔ چھمو کی بیماری میں بھی دو ہزار اٹھ گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے جنرل صاحب نے جو اشرفیاں مغل دور کی خریدی تھیں ان میں سے کچھ رکھ کر باقی سب فروخت کر دیں۔ اس سے سات ہزار مل گئے۔ چار ہزار قرضے کے دے کر تین ہزار بچے۔ حیدرآباد کے جانے میں ہی ہزار روپیہ برابر ہو گیا۔ لیکن حیدرآباد میں چھمو پھر شگفتہ رہنے لگی۔

قمر ہمیشہ سے آزاد خیال تھے۔ رسمی پابندیوں کے قائل نہ تھے۔ پھر چھمو کو پابند کیوں رہنے دیتے۔ ٹی پارٹی، سینما، کلب ہر جگہ بہن کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

چھوٹی بہو صاحب کو چھمو کا یوں بھائی کے ساتھ پھرنا بہت بُرا لگتا تھا۔ اور وہ خفا ہو کر کئی کئی دن قمر اور چھمو کا سلام بھی نہ لیتی تھیں لیکن قمر میاں دھن کے پکے تھے۔ بہن کو اس زمانے کے مطابق بنانے کا خیال کر کے ماں کی خفگی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ جو کچھ بُرا بھلا وہ کہتیں خاموشی سے سن لیتے۔ اور چھمو کو ساتھ لئے پھرتے تھے، رفتہ

رفتہ رفتہ چھوٹی بہو صاحب اس کی عادی ہوگئیں۔ اب جب کبھی قمر اپنے بے تکلف دوستوں کو گھر پہ مدعو کرتے تو چھوٹی بہو صاحب بھی چھمو کی وجہ سے بادلِ ناخواستہ کھانے میں یا چائے میں شرکت کر لیتیں۔ ان کا ناراض ہونا بالکل بجا تھا۔ ان کی عمر پردے کی پابندی میں گزری تھی۔ کوارپنے میں تو ان کی جھلک غیر عورت بھی نہ دیکھنے پاتی تھی۔ شادی کے بعد میاں نے ان کی ہر طرح نازبرداری کی مگر پردے کا انتظام ان کے لئے وہ بھی بہت کرتے تھے۔ جنرل صاحب کا بس چلتا تو اپنی پری جمال بیوی کو آفتاب مہتاب سے بھی چھپاتے۔

ایسے ماحول میں رہ کر بھلا چھوٹی بہو صاحب کیسے آزاد خیال ہو سکتی تھیں۔ نئے زمانے کے اقدار سے ان کو واقفیت نہ تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ چھمو ہر بات میں ان کی پیروی کرے۔ اور قمر میاں اپنی ذہین بہن کو میل جول کا موقع دیتے تھے۔

اس میل جول اور تبادلۂ خیال نے چھمو کی ذہانت کو اُجاگر کر دیا۔ وہ اب سوشل اور ادبی کاموں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ اس کے افسانے اور مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں نظر آتے تھے، اور ہر وقت علمی ادبی مشاغل میں وہ مصروف نظر آتی۔

چھوٹی بہو صاحب کا حیدرآباد آنا قمر میاں کے لئے بھی بہت اچھا ثابت ہوا۔ ان کی پریکٹس ابھی بہت معمولی تھی۔ لیڈی حیدری چھوٹی بہو صاحب کو زنانہ کلب کی ٹی پارٹی میں ملیں۔ سر اکبر حیدری ان دنوں حیدرآباد میں صدر اعظم تھے۔ سر اکبر جنرل صاحب کے دوست تھے۔ اس لئے لیڈی حیدری چھوٹی بہو صاحب سے بہت تپاک سے ملیں۔ اپنے یہاں کھانے

پر ان کو اور چھمو کو بلایا۔ چھوٹی بہو صاحب ان کے یہاں گئیں تو قمر کا ذکر بھی آگیا۔ چھوٹی بہو صاحب نے کہا ان کے باپ، تو چاہتے تھے کہ ملازمت کریں مگر انھوں نے نہ مانا۔ اب یہاں پریکٹس کرتے ہیں۔ آپ جانیں حیدرآباد میں وکیل بیرسٹر ایک سے ایک گھاگ بھرا پڑا ہے۔ بھلا ان کی کیا یہاں چل سکتی ہے۔ ابھی تو اپنا خرچ بھی پورا نہیں نکال سکتے۔

لیڈی حیدری بولیں۔ بہن قمر کو اکبر سے ملنے کے لئے بھیجو۔ پھر وہ کچھ نہ کچھ کام ان کی مرضی کے مطابق دے دیں گے۔

چھوٹی بہو صاحب نے قمر میاں کو بمشکل سمجھا بجھا کر دوسرے روز بیعد سر اکبر حیدری کے پاس بھیجا۔ وہ ان سے بہت محبّت سے ملے اور ان کو دو تین مرتبہ کھانے چائے پر بلایا۔ اور ابھی ان کو ملتے ہوئے پورا مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے قمر کو ذہین اور لائق پا کر اپنا مشیر قانون بنا لیا۔ تنخواہ تو صرف ایک ہزار تھی لیکن اس عہدے کا اعزاز بڑا تھا۔ یہاں تقرر ہوتے ہی قمر کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اہلِ غرض صبح ہی سے ان کے دروازے پر آ کھڑے ہوتے۔

چھوٹی بہو صاحب کی خدا نے سن لی۔ بیٹے کے مستقبل کی جانب سے ان کو اطمینان ہوا تو اب انھوں نے قمر کے لئے دلہن کی جستجو شروع کر دی۔ مگر حیدرآباد کے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں بے حد فیشن ایبل ہو گئی تھیں۔ اس لئے ان کو پسند نہیں آئیں۔ چھمو کو بھی یہ معزز چھچھوری ہنر قت اترانے والی لڑکیاں اپنے عزیز بھائی کے لئے اچھی نہیں لگیں۔

چھمو کے لئے بھی چھوٹی بہو صاحب کو موزوں رشتے کی تلاش تھی۔ جنرل صاحب کی زندگی میں چھوٹی بہو صاحب کی خالہ زاد بہن نے اپنے بھلے

لڑکے کے لئے چھمو کو مانگا تھا۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ لیکن لڑکا ابھی طالب علم تھا۔ اور پھر اس کے آٹھ بہن بھائی اور تھے۔ اس لئے چھوٹی بہو صاحب نے اپنی بہن کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی چھمو بہت چھوٹی ہے اس کے باپ شادی کا ذکر سننا بھی نہیں چاہتے۔ پھر ایک دو ذکر دلی میں ہوئے تو وہ سکندر زمانی بیگم کو پسند آئے نہ چھوٹی بہو صاحب کو۔

ان دنوں دو رشتے چھمو کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ایک میٹرک فیل تعلقے دار کا۔ دوسرا قمر کے ایک آئی سی ایس دوست کا۔ تعلقے دار کا رشتہ قمر کو پسند نہ تھا ان کو معلوم تھا کہ لڑکے کی تعلیم بھی کم ہے اور پھر ان کے گھرانے کی فضا بہت گھٹی ہوئی ہے۔ اپنے ان آئی سی ایس دوست سے وہ چھمو کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر چھوٹی بہو صاحب نے اپنے سامنے ایک نہ چلنے دی۔

یوں تو حسب نسب سب لحاظ سے یہ رشتہ اچھا تھا مگر ان آئی سی ایس صاحب کے بڑے چچا کے ایک صاحبزادے کی تیل عطر کی تجارت تھی پھر بھلا چھوٹی بہو صاحب جو پشتینی نواب زادی تھیں ایسی جگہ اپنی لڑکی کا رشتہ کیسے کر دیتیں، جہاں دوکانداری تک ہوتی تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ لڑکے کے والد نے اپنے لڑکے کو پڑھانے کی کوشش کی، اور یہ صاحبزادے تین سال تک مڈل کا امتحان ہی دیتے رہے تو انھوں نے ہار کر اپنے ایک دوست کی دوکان میں ساجھا کر کے ان حضرت کو وہاں لگا دیا۔ ان کا مستقبل تو اس طرح بن گیا۔ مگر ان کی بدولت آئی سی ایس صاحب کا رشتہ چھمو سے نہ ہو سکا۔

چھمو ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے ادبی مشاغل میں منہمک رہتی تھی۔

یونہی ڈیڑھ سال گزر گیا۔ چھوٹی بہو صاحب اس عرصے میں دو مرتبہ ساس کے پاس دلی آکر ایک ایک مہینہ رہ گئی تھیں۔

قیصر مرزا کے لڑکے سکندر مرزا کی شادی ٹھہری، بلاوہ آیا۔ اور چھوٹی بہو صاحب نے دلی در وبست جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ مہینے سے سکندر زمانی بیگم کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بڑی بہو صاحب خود خفقانی طبیعت کی تھیں، ساس کا ذرا پنڈا بھی پھیکا ہوتا تو ان کے حواس باختہ ہو جاتے۔ بار بار دیورانی کو لکھتیں "دلہن اب تم دلی آجاؤ۔ منجھلی بھی زندہ نہیں ہیں۔ میں تنہا کہاں تک اماں جان کی دیکھ بھال کروں۔ آئے دن مجھے خود اختلاج ہوتا رہتا ہے"۔

چھوٹی بہو صاحب نے اب دہلی رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ ایک سعادت مند بہو کی طرح اپنی ساس کی آخری خدمت کی سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھیں۔

پچھو کو بھی اپنی چاہنے والی دادی اور پیاری چچی حیدرآباد کی دلچسپیوں میں اکثر یاد آتی رہتی تھیں۔ قمر کی جانب سے اب چھوٹی بہو صاحب کو پورا اطمینان تھا۔ ان کے لئے لڑکی بھی کوئی موزوں یہاں نہیں ملی تھی، اس لئے چھوٹی بہو صاحب سکندر مرزا کی شادی سے چار دن پہلے دلی پہنچ گئیں۔

رنگ محل آج کل کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ منورہ دلہن کی بہنیں بھاوجیں آئی ہوئی تھیں۔ قیصر دلہن پھولپور ہاؤس میں تھیں۔ عظمیٰ ستارہ بھی وہیں تھیں۔ انجو بی کی دیورانی کے یہاں پہلونٹی کا لڑکا ہوا تھا اور ریاست سورج گڑھ میں اس کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اس لئے وہ نہ

آسکی تھیں۔

عطن اور ستارہ دونوں کی گودوں میں اب بچے تھے۔ اور چھوا ماعلی طور پر اب ان سے بہت بلند ہو گئی تھی ان کے ساتھ کھیلنے والی الھڑ لڑکی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی خاطر ان کی باتیں وہ سن لیتی تھی۔ عطن نے بتایا کہ ساس کا برتاؤ شادی کے چند مہینے بعد ہی میرے لئے بہت برا ہو گیا ہر وقت جلی کٹی سناتی رہتی تھیں اور بات بات پہ طعنے دیتی رہتی تھیں ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث مجھے حرارت رہنے لگی۔ بیماری میں آپا مجھے دیکھنے آئیں اور اپنے ہمراہ سورج گڑھ لے گئیں۔ وہاں میں نے ان کو اپنی کہانی سنائی۔ اور میرے آنسو نکل پڑے۔ آپا کا غصہ پوری ڈگری پہ پہنچ گیا۔ دو دن بعد گلاب باڑی سے موٹر مجھے لینے آئی تو انھوں نے واپس کر دی۔ میری ساس اس دن شام کو لینے آئیں۔ ان کو مجھ تک آپا نے آنے نہیں دیا۔ خوب برا بھلا کہا۔ اور کہہ دیا کہ اب میری بہن ہرگز گلاب باڑی نہ جائے گی۔ دوسرے دن صبح میرے خسر آئے۔ میں نے آپا کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ اب تو مجھے وہیں پہ گزارہ کرنا ہے۔ اس لئے آپ ایسی باتیں نہ کریں اور خسر صاحب تو ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہے ہیں۔ میرا بڑا خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی آپا کی بہت منت سماجت کی اور کہا کہ میں جانتا ہوں میری بیوی بدمزاج ہے۔ اب میں دلہن کو ان کے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ تاکہ آئندہ ان کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اور مجھے گھر واپس لے آئے۔

بیوی سے انھوں نے کہا۔ "تم نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ پرائی لڑکی کو ہر وقت طعن تشنیع بیکار دیا کرتی ہو۔ اب یہ

الگ رہے گی۔ مجھے پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھی دیدی۔ ہر وقت کا ساتھ نہیں رہا۔ مجھے بھی اطمینان نصیب ہوا۔ جب سے لڑکا ہوا ہے خسر اور بھی زیادہ میری خاطر کرنے لگے۔ ساس بھی اب زیادہ نہیں بولتیں۔ اور میاں تو ہمیشہ سے ہی میرے اچھے ہیں۔ خاصی اچھی گزر ہو رہی ہے۔

سکندر مرزا کی شادی کنبے کی شادی تھی۔ ایک بھائی کا بیٹا دوسرے کی بیٹی۔ دو طرفہ روپیہ منجھلے صاحب کا اُٹھا۔ وہ ان دنوں پوتا پوتی کی شادی کی وجہ سے بہت خوش تھے۔ امینہ نے جوانی بڑی پیاری نکالی تھی۔ اس کی دلکش صورت منجھلی بہو صاحب میں ملتی تھی۔ بہت اچھی دلہن بنی۔ شادی کے بعد قیصر دلہن بہو کو لے کر پھپھولیوں سدھاریں۔ وہاں دو ہفتہ رہ کر دولھا دلہن پھر دہلی آئے اور یہاں چند دن ٹھیر کر سکندر مرزا دلہن کو لے کر اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ عطن بھی سسرال گئی۔ ستارہ کے یہاں دوسرا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ پھپھولیوراں کے پاس تھیں۔ بے بی اب کوئن میری اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ چھٹن صاحب میٹرک کی تیاری کر رہے تھے۔ چھوٹی بہو صاحب نے بہتر سمجھا کہ شہر سے باہر رہیں کیونکہ چھمو اب محل میں بہت گھبراتی تھی۔ اور بے بی کا اور چھٹن صاحب کا اسکول بھی یہاں سے دور تھا۔ اپنی سول لائن والی کوٹھی کرائے داروں سے خالی کرا کر وہ گرمی شروع ہوتے ہی اس میں آ گئیں۔

سکندر نانی بیگم نے اس کو غنیمت سمجھا کہ وہ دلّی میں ہی رہیں۔ خود بہو کے پاس ہفتہ میں ایک پھیرا ضرور کرتیں۔ اور چھوٹی بہو صاحب کا تو معمول تھا کہ ہفتہ کی شام کو چھمو اور بے بی کو لے کر رنگ محل چلی جاتیں اور اتوار کی شام کو واپس آتی تھیں۔ بڑی بہو صاحب کو بھی چھمو بہت خوشامد

کر کے کوٹھی لاتی اور کئی کئی دن یہاں رکھتی تھی۔ دلّی کی سرزمین شعر و ادب جیسے ادبی مشاغل کے لئے بہت سازگار فضا تھی۔ اس کا میل جول اب بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان دنوں جیجو دلّی کی اعلیٰ زنانہ سوسائٹی کی ایک مخصوص ہستی بن گئی تھی۔ کبھی زنانہ مشاعرے کا انتظام کر رہی ہے، کبھی مینا بازار کا۔ اس کے ملنے والوں میں ملک کی بہترین لکھنے والیاں اور لکھنے والے شامل تھے۔

(۴۵)

ننو بی کی لڑکی دلبری کو تربیت ملی نہ تعلیم ٹھیک طریقے سے ہوئی۔ ننو بی تو سدا سے اللہ کا جی تھیں۔ جب تک میاں زندہ رہے وہ بیمار رہیں یا بچے پیدا کرتی رہیں۔ میاں کے مرنے کے بعد کمسنی کی شادی کی بدولت صحت ایسی خراب ہو گئی کہ ان کا زیادہ وقت پلنگ پر لیٹے ہی گزرتا تھا۔ کوئی نہ کوئی شکایت چلے جاتی تھی۔ کبھی سر میں درد ہے کبھی اختلاج ہو رہا ہے ہر وقت ہائے ہائے کرتی رہتیں۔ بھلا ایسی ماں جو آئے دن کی روگی ہو لڑکی کی دیکھ بھال کیا خاک کر سکتی تھیں۔ رہیں نانی تو ان کو دوسری لڑکیوں کو برا بھلا کہنے اور جوڑ توڑ کرنے سے اتنی فرصت کہاں تھی جو دلبری کی تربیت کرتیں۔ پھر بقول ان کے چار بچوں میں تو ایک دلبری بچی تھی۔ تین سال کی عمر میں اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس کا دل قدرتی طور پر مرجھایا ہوا تھا۔ اس لئے اس کو گرم نگاہ سے دیکھنا بھی گناہ تھا۔ ماں کی بے خبری اور نانی کے بے جا لاڈ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلبری جوں جوں بڑی ہوتی گئی اس کی بے ہودگی بھی بڑھتی گئی۔ چھ سال کی عمر تک تو دلبری نے الف ب بھی نہیں سیکھی تھی۔ حالانکہ بسم اللہ اس کی سوا چار

برس کی عمر میں بہت دھوم سے ہوئی تھی ۔ دو دن تک مہمانداری ہوتی رہی تھی ۔ اور پورے کنبے میں قیصر دلہن نے یہ کہہ کر مٹھائی تقسیم کی تھی ۔ " بنو دکھیاری کی تو یہ لڑکی لڑکا ہے ۔ اس کو تو بس شادی کے بعد یہ پھل ملا ہے ۔ اس کی خوشیاں دیکھ لے حوصلہ پورا کر لے تو اچھا ہے ۔"

بسم اللہ کے بعد استانی جی دلبری کے لئے رکھ لی گئیں ۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد دلبری انا کی گود میں لد کر استانی جی کے دالان میں پڑھنے پہنچیں اور کچھ دیر طوطے کی طرح قاعدے کے حرف رٹ کر انھوں نے ٹھنکنا شروع کر دیا ۔ استانی جی کی مجال نہ تھی کہ دلبری کو زبردستی پڑھاتیں ۔ لہٰذا تھوڑی دیر تو پیار چمکار کے وہ اس کو پڑھانے کی کوشش کرتیں ۔ مگر دلبری اپنی ہی کہے جاتی تھی ۔ " آں آں ۔ ہم اب نہیں پڑھتے ہمارے سر میں تو درد ہو رہا ہے ۔" اور آخر انا اور استانی کے منع کرتے کرتے وہ نانی کے پاس بھاگتی ہوئی پہنچ جاتی ۔

بنو بی بعض دفعہ کہتیں بھی ، بھابی اماں یہ روز یونہی آجاتی ہے پڑھتی کیا خاک ہے ۔

قیصر دلہن جلدی سے بول اٹھتیں ۔ اے بی رہنے بھی دو ۔ جی جائے گی تو پڑھ لکھ بھی جائے گی ۔ آئے دن تو اس کا پنڈا اچھا ہوتا ہے ۔ دھان پان ہے بالکل ابھی سے اس پر تنبیہہ کرنی نہیں چاہئیے ۔ بنو بی بھلا ماں کی بات کا جواب ہی کیا دے سکتی تھیں ۔ خاموش ہو جاتیں اور صاحبزادی گڑیاں سنبھال کھیلنے بیٹھ جاتی ۔ یا مغلانی ماماؤں کی لڑکیوں کے ساتھ کودنا پھاندنا شروع کر دیتی ۔ بنو بی کے گھر میں سارا دن دلبری کی بدولت اک طوفان مچا رہتا تھا ۔

شاہرخ مرزا نے جو اس کو ایک دن یہ ہڑ دنگا پن کرتے دیکھا تو بہت ڈانٹا اور قیصر دلہن سے کہا۔ آپ اس کو لاڈ میں بہت بگاڑ رہی ہیں ۔ لڑکی نہ پڑھتی ہے نہ لکھتی ہے تمام دن ماری ماری پھرتی ہے ۔ استانی جی کو بلا کر تاکید کی کہ صبح ناشتے کے بعد سے گیارہ بجے تک پڑھایا کریں اور سہ پہر کو تین بجے سے پانچ بجے تک اک بوڑھے مولوی صاحب کو اردو پڑھانے کے لئے مقرر کیا اور دلبری سے کہہ دیا کہ اگر تم نے ٹھیک طرح سے نہیں پڑھا تو میں تم کو بہت سزا دوں گا۔ دلبری بڑے بھائی سے بہت ڈرتی تھی۔ قیصر دلہن بھی نواب کے سامنے کچھ نہ بول سکیں۔ بھائی کے ڈر سے دلبری تھوڑا بہت پڑھنے تو لگی، مگر تربیت اب بھی نہ ملی۔ پڑھنے کے اوقات کے علاوہ اس کا سارا وقت شرارت کرتے گزرتا تھا۔

گیارہ سال کی عمر میں دلبری نے قرآن شریف ختم کیا تو قیصر دلہن نے بہت دھوم سے نشرح کی خوشی کی۔ اور اس کے دو مہینے بعد شاہرخ مرزا نے دہلی کوئن میری اسکول میں دلبری کو داخل کر دیا۔ بنو بی اور قیصر دلہن دلبری کے اسکول میں داخل ہونے کی وجہ سے مستقل طور پر دہلی پھولپور ہاؤس میں رہنے لگیں۔ دلبری اسکول اکثر اس طرح جاتی کہ بال بکھرے ہوئے ہیں کپڑے ہیں تو ریشمین مگر رات کو پہنے ہوئے سو گئی تھی اس لئے میلے ہوئے اور ملگجے ہیں لڑکیاں دلبری کے اس حلیے اور لاابالی پن پر ہنسا کرتیں اور بے بی بے چاری شرمندہ ہوتی تھی۔ دلبری کے اسکول میں آنے کے چند مہینے بعد حیدرآباد چلی گئی تھی۔ وہاں سے ڈیڑھ سال بعد واپس آئی تو پھر اسکول میں داخل ہوئی اتنے دن میں دلبری کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اب وہ بہت بن سنور کر اسکول آتی تھی۔ روزانہ شوخ رنگ کے قیمتی ریشمین لباس پہنتی۔ لڑکیاں اب دلبری کے

اترانے اور رنگ برنگے کپڑوں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی تھیں۔ لیکن وہ سب سے بے پرواہ اپنے حال میں مگن تھی۔ اسکول میں داخل ہوئے اب اسے تین سال ہو چکے تھے۔ اس سال وہ ساتویں کلاس کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی تھی۔ چھولیور ہاؤس کے پچھلے رُخ پر ایک سال ہوا ایک بلڈنگ نئی بنی تھی۔ اس کی اوپر والی منزل کے پورے حصے میں مشن کالج کے لڑکوں کا اک بورڈنگ تھا۔ دلبری چونکہ ماشاءاللہ اسکول میں تعلیم پانے والی فیشن ایبل آزاد خیال صاحبزادی تھیں اس لئے اسکول سے آنے کے بعد اپنے کمرے کی کھڑکی میں بن سنور کر کھڑا ہونا ضروری سمجھتی تھیں

آخر اس تاکا جھانکی کی بدولت ایک منچلے شوخ صاحبزادے کی نظر ان پر پڑ ہی گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ لڑکی شوقین مزاج رومان پسند ہے اس لیے جب وہ موقع پاتے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ دلبری کو اچھی تربیت ملی ہی نہ تھی، شرم اور خودداری کے سبق اس نے لئے ہی نہ تھے۔ اس لئے جب وہ لڑکا سامنے آتا تو یہ کھڑکی کا ایک کواڑ بند کر کے اس کی اوٹ میں کھڑی مسکراتی رہتی۔ اس کی اس حرکت سے لڑکے کی ہمت بڑھ گئی۔ اور ایک دن اس نے دلبری کو سلام کر لیا۔ جواب میں دلبری بجائے ہٹ آنے کے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

کچھ مہینے میں تو یہ رسم و راہ اس قدر بڑھی کہ دلبری اسکول سے آتے ہی اپنی چھب تختی درست کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ وہ لڑکا اس کا ہی منتظر رہتا تھا۔ جہاں کھڑکی کھلی اور وہ سامنے کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اشاروں کنایوں سے رموزِ محبت سمجھائے۔ پھر ہلکی آواز سے عشقیہ اشعار گاتا اور شوخ نظریں ڈالتا جاتا۔ دلبری شرمیلی

بنو بی سر جھکائے نظر جھکائے کھڑی رہتیں اور آنچل میں منہ چھپا چھپا کر مسکراتی جاتیں آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنی رازدار چھوکری گلرو کے ہاتھ ہی دلبری گلوریاں بناکر روزانہ بھیجنے لگیں، وہاں سے کبھی پھولوں کے ہار گجرے آتے اور کبھی سینٹ اور ریشمی رومال۔ اب پڑھنے کے بجائے دلبری کا تمام وقت درس الفت لینے میں گزرتا تھا۔ کرسمس کی تعطیلوں میں ہر سال بنو بی قیصر دلہن پھپھپور چلی جاتی تھیں مگر اس سال دلبری نے کہدیا کہ آپ چاہے جائیں یا یہاں رہیں۔ مجھے تو محنت بہت کرنی ہے، میں انگلش میں کمزور رہوں اور امتحان سخت ہے۔ پھپھپور نہیں جاؤں گی۔ اور ان دونوں نے اسی خیال سے جانا ملتوی کردیا کہ بچی کو تو پڑھنے کا اتنا شوق ہوگیا ہے کہ چھٹیوں میں بھی پڑھتی رہے گی۔ ہم بھلا اس کو کیسے اکیلا چھوڑ کر جائیں۔

قیصر دلہن پاس آج کل جو کوئی بیوی بھی ملنے آتیں وہ ان سے پہلی بات یہی کرتی تھیں: "اللہ رکھے میری دلبری کو تو پڑھنے سے عشق ہے۔ رات دن نگوڑی کتابیں ہیں اور وہ ہے۔ صبح ہو یا شام اس کو کہیں آنے جانے کا شوق نہیں۔ ہر وقت کمرہ بند کئے بے چاری پڑھتی رہتی ہے۔ یہ افسانہ بڑے زوروں میں چل رہا تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "عشق مشک چھپائے نہیں چھپتا" بالکل سچ ہے۔

ہوا یہ کہ شاپور مرزا جو بی۔اے کرنے کے بعد تجارت کرنے لگے تھے ہر دوسرے ہفتے اپنے تجارتی کاموں کے لئے پھپھپور سے دلی آتے رہتے تھے۔ ان دنوں بھی آئے ہوئے تھے، اتوار کا دن تھا اور فروری کی چمکیلی خوشگوار دوپہر۔ بنو بی اور قیصر دلہن حسب معمول کھانے کے بعد

سو رہی تھیں۔ ماماٸیں مغلانیاں بھی اپنے ٹھکانوں پر آرام کر رہی تھیں۔

شاپور مرزا کو سوٸی تاگے کی ضرورت ہوٸی۔ پہلے قیصر دلہن اور بنّو بی کی جانب گئے، ان کو سوتا دیکھ کر جگانا مناسب نہ سمجھا۔ دلبری سے سوٸی تاگہ لینے اس کے کمرے میں پہنچے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سے کوٸی بے آرام نہ ہو اس لئے آہستہ قدم رکھتے ہوئے دلبری کے کمرے میں داخل ہوئے مگر دروازے کے قریب ہی یہ دیکھ حیران کھڑے رہ گئے کہ دلبری کھڑکی کے سامنے اس طرح کھڑی ہے کہ اس کی ریشمی چنری شانوں سے بھی ڈھلک رہی ہے اور سامنے والی بلڈنگ میں ایک خوشرو لڑکا جھوم جھوم کر حسرت کی بہت رنگین غزل گا رہا ہے اور اس کی بیباک نظریں دلبری پر جمی ہوٸی ہیں۔

شاپور مرزا کا مغلٸی خون کنواری بہن کی یہ بے شرمی دیکھ کر جوش کھانے لگا۔ لیکن شامت کی ماری دلبری گانا سننے میں اس قدر محو تھی کہ جب غصے میں بڑھ کر شاہ پور نے زور سے کھڑکی بند کی تو جب ہی اس کو شاپور کے آنے کی خبر ہوٸی۔ اور وہ خوف کے مارے بید کی مانند کانپنے لگی۔ شاپور مرزا دلبری کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے، اور قیصر دلہن کے پلنگ پر اس کو دھکا دے دیا۔ دلبری ان کی ٹانگوں میں گری اور قیصر دلہن ہڑبڑا کر اٹھیں، ان کی نگاہ پہلے دلبری پر پڑی اور انھوں نے کہا۔ اے دلبری نگی ہو تم پر بھلا یہ کیا تمھاری حرکت ہے کہ یوں آکر مجھ پر گر پڑیں۔ ابھی تو میری آنکھ لگی تھی۔“ دلبری بھلا کیا جواب دیتی۔ اس کا تو ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔

قیصر دلہن نے دوسری طرف منہ پھیرا تو شاپور سامنے کھڑا تھا مگر

تیوری پر بل اور چہرے کا رنگ غصّے کے مارے متغیر دیکھ کر بولیں۔ "اے میاں خیر تو ہے، کیوں پریشان ہو؟"

شاپور مرزا نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا۔ خیر کیسی پھوپھی جان آپ کی لاڈلی نواسی نے اپنی عشق بازی کی بدولت بنا دی ہے۔

قیصر دلہن۔ اے ہوش کی دوا کرو۔ وہ نگوڑی تو اپنے کمرے میں بیٹھی رات دن پڑھتی رہتی ہے۔ اللہ مارا عشق کرنے وہ کہاں گئی تھی۔ کیا کچھ پی آئے ہو۔ جو یوں بہک رہے ہو۔

شاپور مرزا نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا کہ جی پی تو آپ نے رکھی ہے کہ گھر میں رہتی ہیں اور نواسی کی خبر نہیں رکھتیں۔ کمرے ہی میں تو آپ کی چہیتی نے گل کھلائے ہیں۔ میں ابھی جو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی کے سامنے صاحبزادی دوپٹہ گلے میں ڈالے کھڑی اترا رہی ہیں۔ اور سامنے کوئی کالج کا لونڈا ان کو گھور رہا ہے اور بیہودہ سی غزل گا رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر دلبری میری سگی بہن ہوتی تو میں اس کا ابھی گلا گھونٹ دیتا۔ اس وقت میرا خون کھول رہا ہے۔

قیصر دلہن بے چاری کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان کی رنگین طبع نواسی نے جو ابھی پچھلے مہینے میں تو تیرہ برس کی ہوئی ہے اس بالی عمر میں عشق و محبت کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ششدر بیٹھی رہ گئیں۔ بنو بی بھی اب جاگ چکی تھیں۔ ان کو تو بیٹی کی کرتوت سن کر اختلاج ہونے لگا۔ دلبری کی خوف کے مارے گھگی بندھی ہوئی تھی اور وہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے لرزے کا بخار اس کو چڑھا ہو۔

شاپور مرزا نے کہا۔ بس ہو چکی دلبری کی پڑھائی اس بدنصیب کی

قسمت میں ہی علم نہیں ہے۔ تعلیم تری کیا کرے گی جب تربیت ہی آپ لوگوں نے لڑکی کو بالکل نہیں دی۔ آپ اپنا سامان باندھ لیں۔ کل شام کو میرے ساتھ بھوپور واپس چلیں۔

قیصر دلہن کو اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ دلبری نے اپنی اس بیہودہ حرکت سے ایسا شرمندہ کیا تھا کہ سردی میں بھی اس وقت ان کو پسینہ آرہا تھا۔ شاپور مرزا کے باہر جاتے ہی بنوبی نے بیٹی کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مار کر کہا۔ ناشدنی! تو بھی اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ مرجاتی تو اچھا ہوتا۔ ان کے ساتھ میں تجھے بھی رو کر صبر کر لیتی۔ اور پھر وہ زور زور سے ہائے ہائے کرنے لگیں۔ قیصر دلہن نے عرق گلاب پلایا تو ان کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ کھڑکی کو قیصر دلہن نے بند کرا کے اس کے سامنے کپڑوں کی الماری رکھوا دی اور دلبری کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ رات کو بھی اپنے کمرے میں ہی اس کو سلایا۔ صبح اُٹھ کر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ نوکر اس ایک دم کی روانگی سے حیران تھے۔ قیصر دلہن نے یہ بات بنائی کہ شاہ رخ مرزا کی ننھی بچی مہربانو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سلطان دلہن ابھی ناتجربہ کار ہیں۔ اس لئے نواب صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔ آخر سامان بندھ گیا۔ اسکول شاپور مرزا نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ "دلبری ایک دم سخت علیل ہو گئی ہے۔ اس لئے دو ہفتے نہیں آسکے گی۔ اور ان سب کو لے کر بھوپور چلے گئے۔

دلبری تو اپنے رومان کے حسرتناک انجام پر آنسو بہاتی چلی گئی، مگر ان صاحبزادے نے جو دیکھا کہ کھڑکی ایک دم بند ہو گئی تو وہ اس کی وجہ معلوم کرنے کی ٹوہ میں تھے کہ دوسرے روز شام کو سامان اور پھر بیگمات

کی پردہ لگی موٹر کو انھوں نے جاتے دیکھا تو سمجھے کہ راز افشا ہو گیا اور وہ سونے کی چڑیا جو بغیر دانہ پھینکے دام کے قریب آئی تھی، ہاتھ سے نکل گئی یہ لڑکا خوش رو خوش گلو ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھا۔ مفلس بیوہ ماں کا لڑکا تھا۔ اس کی غریب دیہاتی ماں نے نہ جانے کن کن مشکلوں سے اپنے بیٹے کو تعلیم دلائی تھی۔ اور اب بی اے کے پہلے سال تک وہ پہنچ گیا تھا نواب پھولپور کی بہن اور اپنی ماں کی اکلوتی لڑکی اس کی جانب از خود کھنچ آئی تھی۔ اس لئے سمجھتا تھا کہ اگر اس کا یہ رومان کامیاب ہو گیا تو قسمت جاگ جائے گی۔ ایسی اچھی سسرال کا خواب بھی اس نے نہ دیکھا تھا۔ لیکن اب اس کو اپنا مستقبل تابناک نظر آ رہا تھا۔ مگر آناً فاناً یہ سنہرا سپنا دلبری کے اس طرح چلے جانے سے ختم ہو گیا۔ اک چالاک انسان کی طرح وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر آئی لچھمی کو اس آسانی سے چھوڑ دے۔ اور اس نے بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دلبری کے نام محبت نامہ کسی فلمی رسالے میں چھپوا کر نواب پھولپور کو یہ رسالہ بھجوا دے۔ یہ بڑے لوگ اپنی بدنامی سے بہت گھبراتے ہیں۔ یہ نواب صاحب بھی مجبور ہو کر اپنی بہن کو اس سے بیاہ دیں گے۔

چنانچہ اپنی اس تجویز کو ان صاحبزادے نے بہت جلد ہی عملی جامہ پہنایا۔ ابھی دلبری کو پھولپور گئے دو مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ایک فلمی رسالہ نواب پھولپور اور شاپور مرزا کے پاس پہنچا۔ اس رسالے میں ایک منظوم خط دلبری کے نام ان صاحبزادے صاحب کا تھا شاعری سے بھی وہ شوق فرماتے تھے۔ اور اب تو محبوبہ سے یکایک جدائی ہوئی تھی اور ایسے موقعے پہ تو ہر ایک انسان شاعر بن جاتا ہے

پھر بھلا جو پیدائشی شاعر ہو وہ کیسے نہ حالِ دل سنائے۔ یہ رنگین خط اتنا طویل تھا کہ پورے ڈھائی صفحے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ان پانوں کا ذکر بھی تھا جو دلبری بھیجا کرتی تھی۔ اور رمز و کنائے میں ایسا لکھا تھا کہ جاننے والے سب سمجھ جائیں کہ یہ دلبری کی داستانِ محبت ہے۔

چھمّو کے پاس اچھے بُرے دلّی کے سب ہی رسالے آتے تھے۔ سب سے پہلے اس کی نظر سے یہ خط گزرا اور ذہین چھمو اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہ دلبری کے نام ہے۔ اور اب قیصر دلہن اور بنّوبی کے پھولپور ایک دم جانے کا راز اس کو معلوم ہو گیا۔ اس کمسن لڑکی نے یہ گل کھلایا۔ وہ دانتوں میں انگلی دبا کر بہت دیر تک سوچتی رہی۔

نواب پھولپور کو بھلا اپنے اور مشاغل سے اتنی فرصت کہاں تھی جو ایک بیہودہ سے رسالے کو دیکھنے میں وقت ضائع کرتے۔ شاپور مرزا بھی مولوی قسم کے انسان تھے ان کا فلمی رسالے سے تعلق ہی کیا تھا جو وہ پڑھتے۔ مگر چھوٹے بھائی نسیم نے یہ رسالہ دیکھا اور اس خط کی طرف شاپور مرزا کی توجہ دلائی اور انھوں نے نواب صاحب کو یہ خط پڑھکر سُنایا۔ دونوں بھائی غصّے سے کانپتے ہوئے رسالہ ہاتھ میں لئے بنّوبی کے محل میں گئے۔ وہاں کمرہ بند کر کے انھوں نے قیصر دلہن اور بنّوبی کو یہ رسالہ دکھایا۔ وہ دونوں شرم اور غصّے سے بید کی مانند کانپ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اس ناہنجار لڑکی نے اتنی چھوٹی سی عمر میں نانی اور ماں کو ایسا شرمسار کیا تھا کہ دونوں پانی پانی ہوئی جا رہی تھیں۔

شاہرخ مرزا نے رسالہ دور پھینک کر غصے میں ہونٹ چبا کر

کہا۔ بدمعاش! سمجھتا ہے کہ اس طرح میں اس سے ڈر جاؤں گا۔ اس لڑکی کو آپ دونوں نے بالکل تربیت نہیں دی۔ اس لئے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا کہ اب پھولپور کے وقار سے کالج کا ایک آوارہ گرد لونڈا کھیل رہا ہے۔ مگر یہ کھیل میں اور زیادہ نہ ہونے دوں گا۔ دلبری کا نکاح ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے کرنا ہے۔ منجھلے چچا جان کے چھوٹے لڑکے سے یا فیروز کے ساتھ۔ آپ دونوں جس لڑکے کو ان دونوں میں سے پسند کریں مجھے بتا دیجئے۔

اس وقت شاہرخ مرزا کا نوابی جلال پورے عروج پر تھا اور غصے کی بات بھی تھی۔ قیصر دلہن اور بنو بی کے بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ دلبری کی بے موقعہ جرأت نے ان کو بولنے کے قابل۔ کہاں کب تھا۔ چند منٹ بعد بنو بی بہت دھیمی آواز سے بولیں۔ خدا اس ناہموار لڑکی کو دنیا سے اٹھالے تو پاپ کٹے۔ میں کیا بتاؤں جو چاہو کرو۔ مجھے تو اس نے منھ دکھانے کے قابل بھی نہیں رکھا۔

شاہرخ مرزا بولے۔ اب کوسنے کاٹنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ ترکیب ٹھیک رہے گی جو آکا بھائی نے سوچی ہے۔ جلد از جلد دلبری کا عقد ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ یہ لونڈا نہ جانے اور کیا بیہودگی کرے۔

قیصر دلہن نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور کہا میرے خیال میں فیروز زیادہ موزوں رہے گا۔

شاہرخ مرزا بولے۔ یوں تو سلیمان اور فیروز میرے لئے دونوں ہی ایک سے ہیں۔ ایک چچا کا لڑکا ہے دوسرا ماموں کا۔ مگر سلیمان زیادہ ذہین اور ہوشیار ہے۔ آپ کو اگر فیروز پسند ہے تو مجھے کیا اعتراض

ہو سکتا ہے۔ میں ماموں جان کو اس کے متعلق لکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر شاہرخ مرزا باہر آئے اور منور مرزا کو تار اسی وقت سکریٹری سے دلوا دیا۔" آپ فیروز کو لے کر آجائیے۔ میں دلبری کا عقد فیروز سے کرنا چاہتا ہوں۔

منور مرزا اپنی ملازمت پر تھے تار ملا تو بیوی پاس لے کر آئے۔ دلبری کے رومان کا افسانہ خاندان بھر میں مشہور ہو چکا تھا۔ اور منور دلہن کو بھی دلی سے کسی نے خط میں یہ قصّہ لکھ دیا تھا۔ اور یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ لڑکی بے ڈھنگی، بے وقوف اور چھچھوری ہے۔ صورت کے لحاظ سے بھی دلبری میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ وہ بالکل اپنے مرحوم باپ کی تصویر تھی۔ بنو بی جیسی خوش شکل نہ تھی۔ لیکن تھی تو وہ اپنی ماں کی اکلوتی اور نواب کی بیٹی، نواب کی بہن۔ اگر یہ حماقت نہ کرتی تو باوجود ان تمام خامیوں کے جو اس میں تھیں وہ کسی اچھے گھر کی بیگم بنتی۔ قدرت نے ایک سنہرا موقع منور مرزا کے لئے دیا تھا۔ اس کو وہ بھلا کیوں چھوڑتے۔ دوسرے روز شام کو ہی بیٹے کو لے کر بھپولپور روانہ ہو گئے۔

منور دلہن اس لئے نہ جا سکیں کہ امینہ ان دنوں سخت بیمار تھی۔ ایسی جلدی میں اور تو کیا ہو سکتا تھا۔ منور دلہن نے اپنا ریت کا سرخ تاش کا جوڑا جو ابھی تک بالکل جگمگا رہا تھا۔ نتھ اور انگوٹھی دلہن کے لئے بھیج دی۔ منور مرزا پہلے دلی آئے یہاں سے اپنے دونوں سالوں کو لے کر بھپولپور پہنچے۔ منجھلے صاحب اسی لئے نہ جا سکے کہ ان کو بادی بواسیر کا پرانا مرض بہت ستا رہا تھا۔

سوار ہونے سے قبل منور مرزا نے تار نواب صاحب کو دیدیا تھا اور اس تار کے ملتے ہی شاہرخ مرزا نے دلبری کے عقد کی تیاری شروع کر دی تھی۔

محل میں گانا بجانا ہونے لگا تھا۔ دلبری کے دل کا حال تو خدا جانے، بظاہر تو ان دنوں وہ ایک شرمیلی لڑکی بنی تمام دن اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ منور مرزا ہفتے کی شام کو بھوپال پہنچے اتوار کی شام کو دلبری کے مہندی لگائی گئی۔ ساری رات گانا بجانا رہا اور پیر کی صبح کو صاحبزادی دل آرا بانو کا عقد بعوض پچیس ہزار مہر فیروز مرزا سے ہو گیا۔ مبارک سلامت کی دھوم مچ گئی۔ قلعے کے دروازے پر نوبت بجنے لگی۔

قیصر دلہن بنو بی اس وقت سب باتیں بھول کر خوشی خوشی مبارکباد لے رہی تھیں۔

شاہرخ مرزا نے فیروز کو گیارہ پارچے کا خلعت مع دوشالہ دیا اور ڈھائی سو روپے سلامی کے دئیے۔

بنو بی نے بھی ڈھائی سو روپے سلامی کے دئیے۔ اور دلبری کا نکاح ہونے کے بعد شاہ رخ مرزا، شاپور مرزا نے سکھ کا سانس لیا اور اس عقد کی خبر پہنچتے ہی عاشقِ ناکام سر تھام کر بیٹھ گیا۔ سوچا کچھ تھا ہوا کچھ۔ غرضیکہ بھوپال کی آن نواب نے اپنی ہوشیاری سے پھر سنبھال لی۔

فیروز عمر میں تو دلبری سے صرف تین سال بڑا تھا۔ مگر اپنے گداز صحت مند جسم اور لمبے قد کے باعث خاصا جوان لگتا تھا۔ شاہرخ مرزا نے فیروز کو نکاح ہونے کے بعد علی گڑھ کالج میں داخل کر دیا اور اس کی تعلیم کے مصارف خود برداشت کرنے لگے۔ جیب خرچ کے لئے سو روپے ماہوار الگ دیتے تھے۔ بنو بی ہر عید بقرعید پر چہیتے داماد کے لئے بھاری بھاری ٹوپیاں سلوا کر اور اکاون روپے عیدی کے بھیجتی تھیں۔ اور جب کبھی فیروز بھوپال آتا سو پچاس روپے ویسے بھی دے دیتیں۔

منوّر مرزا خوش تھے کہ فیروز کا مستقبل انھوں نے بنا دیا۔ امینہ کو روگ ایسا لگا کہ اس کی جان ہی لے کر ٹلا اور اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کے دو سال دو مہینے بعد امینہ ناشاد نامراد اس دنیا سے سدھاریں۔

(۲۶)

سلطان دلہن خوش شکل بھی تھیں، تعلیم یافتہ اور سگھڑ بھی۔ مگر شاہرخ مرزا کے خیالوں میں اب بھی فریدہ کی دلربا شکل بسی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اس منموہنی صورت سے بیوی کا مقابلہ کرتے جو لڑکپن سے ان کے دل پر نقش ہو چکی تھی اور بے ساختہ سرد آہ ان کے لبوں پر آ جاتی۔ مگر اپنی بیوی کے سگھڑاپے اور ذہانت سے مطمئن ہو جاتے۔ سلطان دلہن کو اپنے وارفتہ مزاج شوہر سے والہانہ محبت تو ایک دن بھی نہیں ملی تھی۔ ہاں ویسے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ پہلے پہلے تو شاہرخ مرزا کا کھویا ہوا رہنا اور ہر وقت سرد آہیں لینا سلطان دلہن کو بہت برا لگتا تھا۔ مگر اب تو وہ اس کی عادی ہو گئی تھیں۔ اور جب خدا نے شادی کے ڈیڑھ سال بعد سلطان دلہن کی گود ایک تندرست بچی سے بھر دی، تو انھوں نے میاں کی لاپرواہی کا خیال چھوڑ کر اپنی پوری توجہ بچی کی جانب منتقل کر دی۔ بچی کی پرورش اور گھرداری کے کاموں میں الجھ کر سلطان دلہن کا دل بہل گیا۔

یوں ہی چار سال گزر گئے۔ قیصر دلہن، سلطان دلہن کی شادی کے

ایک سال کے بعد سے دلبری کی وجہ سے دلی رہنے لگی تھیں۔ اس لئے ان کو نئی دلہن پر نکتہ چینی کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا۔ اب کچھ مہینے سے پھر ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ بنو بی قیصر دلہن رہتیں تو الگ محل میں تھیں۔ مگر سہ پہر سے رات کے کھانے تک نواب کے محل میں آجاتی تھیں۔ اور جتنی دیر بھی قیصر دلہن یہاں رہتیں اپنی طعنہ زنی سے بے چاری سلطان دلہن کو پریشان کرتی رہتی تھیں، جس سلیقے سے وہ گھر کرتی تھی ان کو اس پر اعتراض تھا وہ چاہتی تھیں کہ وہ بھی کھانے ناشتے پر اندھا دھند روپیہ خرچ کرے۔

سلطان دلہن کم سخن تھی اور ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی یا کتاب دیکھتی۔ قیصر دلہن کہتی تھیں کہ ہمارے دکھانے کو سگھڑ بنو بنی بیٹھی ہیں۔ منہ تھتھائے رہتی ہیں۔ خدا نے نواب کی بیوی بنا دیا تو کیا ہوا، عادت تو کام کرنے کی پڑی ہوئی ہے، نواب زادیوں کا سا انداز کہاں سے لائیں۔ کھانے کے وقت بھی ان کی تنقید جاری رہتی۔ قورمہ میں گھی کم ہے، آلو کے بھرتے میں پودینہ نہیں ہے۔ دہی باسی کیوں ہے۔ روٹیاں گنتی کی ہوتی ہیں۔ دال بالکل پتلی پانی سی۔ اور مٹھاس تو ان کے راج میں کبھی ڈھنگ کی دسترخوان پہ ہوتی ہی نہیں۔ جبھی تو بے چارا نواب دن بدن دبلا ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان کو میاں کی کیا فکر۔ اپنے روپیہ جوڑنے سے مطلب ہے۔

بے چاری سلطان دلہن بھی آخر انسان تھی، اس ہر وقت کی نکتہ چینی سے گھبرا گئی۔ کبھی کبھار وہ بھی بول پڑتی۔ تو یہ خوب خبر لیتیں اور پھر نواب سے شکایت کر دیتیں۔

شاہرخ مرزا بیوی سے کہتے کہ "وہ بڑی ہیں کہنے دو، جو کہیں۔ تم جواب نہ دیا کرو۔"

وہ تنک کر کہتی۔ واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں ہر وقت ان کی باتیں بلا وجہ سنتی رہوں۔ بے چاری باجی جان تو کچھ نہیں کہتیں۔ یہی ہر وقت میرے سر رہتی ہیں۔

غرضکہ ہر وقت کی تکا فضیحتی سے تنگ آکر سلطان دلہن نے یہ بہتر سمجھا کہ کچھ دن میکے رہ آئیں۔ گرمی اب کافی ہونے لگی تھی۔ مئی کا مہینہ تھا۔ شاہرخ مرزا نے بیوی کو ڈیرہ دون بھیج دیا۔ اور خود ریاست کے کام سے جون میں شملہ چلے گئے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں وہ پھولپور واپس آگئے۔ قیصر دلہن اور بنو بی دلبری کی وجہ سے پھولپور میں مقید تھیں۔ دلی بھی نہ جا سکتی تھیں۔ نواب واپس آئے تو چونکہ بیوی یہاں نہیں تھیں، بنو بی کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ قیصر دلہن اچھا کھانا کھانے کی ہمیشہ سے شوقین تھیں۔ دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانے دسترخوان پر ہوتے اور شاہرخ مرزا کو واقعی ایسا لذیذ کھانا اپنے گھر میں نہیں ملتا تھا اس لئے وہ تعریف کرتے تھے۔ قیصر دلہن کو باتیں بنانے کا موقع ملا۔ انھوں نے رفتہ رفتہ شاہرخ مرزا کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی کہ سلطان دلہن کو بالکل ان کا خیال نہیں ہے۔ کھانا برا کھلاتی ہیں اور روپیہ جمع کرتی ہیں۔ عمر میں بھی یقیناً نواب سے بڑی اور بے حد چالاک ہیں۔ ویسے بھی فیشن ایبل اور آزاد خیال ہیں۔ میکے میں اتنے دن ٹھہرنا بھی ان کا خالی از علت نہیں۔ شاہرخ مرزا حسب عادت ھمانی کی باتوں میں آکر بیچاری بیوی کے خلاف ہو گئے۔

بڑے نواب صاحب شروع ہی سے سلطان دلہن کو پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ یہ شادی انجو نے ٹھہرائی تھی۔ ان کو بھی موقعہ ملا۔ انھوں نے

قیصر دلہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سلطان دلہن غریب پھوپیو رکی سازش سے بے خبر میکے میں خوش اور مگن تھی۔ یکایک میاں کا تار ملا فوراً آؤ۔ سلطان دلہن کی خالہ زاد بہن کی شادی پندرہ دن بعد ہونے والی تھی، اس لئے اس نے لکھ دیا کہ میں خود آنے والی تھی۔ مگر خالہ کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہاں ہوتے ہوئے کچھ دن پہلے چلی جاؤں شادی ہوتے ہی میں آجاؤں گی۔

شاہرخ مرزا سے اس خط کا سن کر قیصر دلہن نے کہا۔ لے میاں تمہاری بیوی بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ بھلا میکے کی تفریح یہاں کہاں اس لئے بہانے بنا رہی ہیں۔ جو دن ٹل جائیں۔ اچھا ہے۔ وہاں کی تفریح چھوڑ کر وہ یہاں کیوں آنے لگیں۔ اور شاہرخ مرزا پر ہمیشہ کی طرح بغیر سوچے سمجھے غصے کا بھوت سوار ہو گیا۔ انھوں نے معصوم بیوی کو طلاق لکھ کر بھیج دی۔

جب یہ خوفناک تحریر ملی تو سلطان دلہن کسی ٹی پارٹی میں جانے کے لئے کپڑے زیور پہنے تیار کھڑی تھیں۔ بے چاری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بے قصور بے خطا ظالم شوہر نے اس کو یہ سزا دی تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی اس کی کج ادائی لا پرواہی کی کسی سے شکایت نہیں کی۔ اس کے گھر کو اپنے سلیقے سے رشک گلزار بنا دیا تھا۔ اور ہمیشہ اس کی خوشی کے لئے اپنے جذبات کو پامال کرتی رہی تھی۔ ساڑھے چار سال کی اس بے لوث محبت اور وفاداری کا انعام اس ظالم نے یہ دیا۔

ننھی مہرپا تو اپنی ماں کی مصیبت سے بے خبر مسہری میں پڑی سو رہی تھی۔ سلطان دلہن اس وقت وفورِ غم سے نیم پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے

سوئی ہوئی بچی کو گود میں لے کر کہا۔ "میری بچی تیرے ظالم باپ نے تیرا بھی تو خیال نہیں کیا اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔"

مہربانو بچی نیند میں جاگ جانے کی وجہ سے بلک بلک کر رونے لگی۔ اس بے اندازہ غم کی تو جس میں اس کی دکھیاری ماں مبتلا تھی، اس ننھی سی جان کو کیا خبر ہوتی مگر اس وقت تو وہ رونے میں ماں کا ساتھ دے رہی تھی۔

ان دنوں قیصر دلہن کی طوطی بھوپال میں بول رہی تھی۔ نواب کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر وقت زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی تھیں ادھر بڑے نواب صاحب پھر اپنے سادہ لوح پوتے کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے پانسہ پھینک چکے تھے۔

سلطان دلہن کو طلاق دینے کے کچھ دن بعد ہی انھوں نے شاہرخ سے کہا۔ اب تمہارا شادی کہاں کرنے کا خیال ہے۔

انھوں نے جواب دیا ابھی تو میں نے اس کے متعلق سوچا بھی نہیں ہے۔

بڑے نواب صاحب نے کہا۔ ارے بھئی ادھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ روشن تمہاری چچا زاد بہن جو موجود ہے۔ تمہاری دیکھی بھالی ہے۔ اپنائت ہے۔ اگر چاہو تو میں شہباز مرزا کو لکھوں۔

شہباز مرزا کی پہلی بیوی سے تین لڑکے تھے۔ بیوی کے مرنے کے بعد ان کی دوسری شادی ایک مولوی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان بیوی سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔

چونکہ ماں مولوی کی بیٹی تھی اس لئے لڑکیوں کو انھوں نے بہت

دبا کر اٹھایا تھا۔ کنبے میں بھی کہیں ساتھ نہیں لے جاتی تھیں۔ تعلیم بھی لڑکیوں کو واجبی ہی ملی تھی۔ اب بڑی بیٹی روشن پیاری شکل کی، شگفتہ مزاج لڑکی تھی

شاہرخ مرزا کے تصور میں روشن کی بھولی دلفریب شکل مسکرانے لگی۔ اور انھوں نے دادا سے کہا۔ ہاں میں روشن کو پسند کرتا ہوں گو تعلیم اس کی کم ہے مگر تربیت چچی نے بہت اچھی دی ہے۔

اور بڑے نواب صاحب نے کہا۔ ارے بیٹا اردو تو لکھنا پڑھنا جانتی ہی ہے۔ انگریزی میں بھی شُد بُد شہاب نے اس کو کرا دی ہے۔ اور تم کو ترس رکھ دینا سیکھ جائے گی۔

نواب صاحب نے اسی وقت شہباز مرزا کو پیغام بھیج دیا۔

شہباز مرزا تو نواب سے رشتہ بیٹی کا کرنے کو تیار ہو گئے۔ مگر ان کی بیوی نے کہا ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی مگر یہ بندی ہرگز اپنی بیٹی شاہرخ کو نہ دے گی۔ تمھارے بھتیجے کو بیویاں بدلتے رہنے کی عادت ہے۔ دو چار سال بعد اس کو بھی چھوڑ دے گا۔" نوج دور پار جو میں اپنی روشن کی قسمت ایسی جگہ پھوڑوں۔ تمہاری ریاست روپیہ مجھے کچھ نہیں چاہئیے۔ ایسے نواب سے وہ ٹکے کا مزدور اچھا جو بیوی سے محبت کرے، اس کی قدر کرے۔ پہلے بچپنے کی لگی نسبت چھوڑی۔ نہ خالہ کا خیال کیا نہ نانی کا۔ آخر نانی نے روتے رٹتے جان دیدی۔ مگر وہ لڑکا ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر کنبے کی بیٹی تمہارے ابا جان کس دھوم دھام سے بیاہ کر لائے۔ اس کو بھی شاہرخ مرزا نے چھوڑا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ اب اچھی خاصی صاحب اولاد اور

سگھڑ تعلیم یافتہ بیوی کو یکایک بھاوج قیصر دلہن کی لگائی بجھائی میں آ کر طلاق دے دی۔ توبہ کر کے کہتی ہوں ایسی جگہ شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ لڑکی کو کنوئیں میں دھکا دے دیا جائے۔ وہ بھی کوئی انسان ہے جس کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ موم کی ناک جا ہے جس نے جدھر موڑ دیا۔"

شہباز مرزا کی ہٹ دھرم بیوی کے سامنے اک نہ چلی، اور انھوں نے مجبور ہو کر باپ کو لکھا۔

"ابا جان میں آپ کے حکم کی تعمیل سر آنکھوں سے کرتا۔ میرے لئے شاہرخ ایسا ہی ہے جیسے شہاب۔ مگر آپ کی بہو بہت بیوقوف عورت ہے۔ وہ شاہرخ مرزا کی دو بیویاں چھوڑنے سے ڈر گئی ہے میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانتی۔ میں مجبور ہوں اس کے خلاف روشن کا رشتہ نہیں کر سکتا۔"

بڑے نواب صاحب نے یہ جواب پا کر شاہرخ مرزا سے یہ تو کہا نہیں کہ روشن کی ماں نہیں کرنا چاہتی۔ یہ کہہ دیا روشن کا رشتہ کہیں اور اس کی ماں ٹھیرا رہی ہے۔

شاہرخ مرزا کو روشن سے کوئی خاص لگاؤ تو تھا نہیں جو ملال ہوتا، خاموش ہو گئے۔

بڑے نواب صاحب ادھر ادھر خیال دوڑا رہے تھے کہ دسہرے کا دربار آ گیا۔ چچا دونوں ہمیشہ دربار پر آتے تھے۔ چھوٹے چچا کامران مرزا اس دفعہ بیوی کو بھی لے کر آئے۔ انجم بی نے بڑے اصرار سے چھوٹی چچی کو بلایا تھا۔

دراصل انجو بی کا خیال کامران مرزا کی بڑی لڑکی شہلا کو شاپور مرزا کے لئے مانگنے کا تھا۔

چھوٹی چچی خاندان کی لڑکی نہ تھیں، مگر تھیں بہت سمجھ دار اور سلیقہ شعار۔ انجو بی کو ان کا سلجھا ہوا مزاج اور سنجیدہ طبیعت بہت پسند تھی۔ شہلا ابھی تیرہ سال کی ہی تھی۔ مگر ماں کی اچھی تربیت نے اس پر ابھی سے جلا کر دی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور نیک طبیعت لڑکی تھی۔ اسکول میں خاندانی رواج کے مطابق شہلا بھی نہیں پڑھی تھی۔ مگر گھر پہ ہی باپ نے اس کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیا تھا اور اپنی بساط کے مطابق شہلا کی تعلیمی استعداد معقول تھی۔ روشنی کی طرح شہلا زیادہ خوبصورت نہ تھی مگر گداز جسم والی گوری چٹی شہلا کافی پیاری لگتی تھی۔

انجو بی شاپور مرزا کا پیغام دینے کو ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ بڑے نواب صاحب نے شاہرخ مرزا سے شہلا کے لئے پوچھا۔

شاہرخ مرزا کو خیال آیا کہ منجھلے چچا نے اپنی لڑکی مجھے نہیں دی، ٹال دیا۔ تو میں چھوٹے چچا کی لڑکی سے شادی کر کے ان کو نادم کر دوں۔ جھٹ پٹ منظوری دیدی۔ اور کامران مرزا کو باپ نے ایسا باتوں میں لیا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکے۔ اور معصوم شہلا کو دسہرہ در بار کے دو روز بعد شام کو ایک دم مائیوں بٹھا دیا گیا۔ قلعہ پر نوبت رکھدی گئی۔ شادیانے بجنے لگے۔ بڑے نواب صاحب سے لے کر اہلکار تک سب شاد شاد تھے۔ دوہری خوشی تھی۔ دولہا دلہن دونوں میں نواب پھولپور کا خون تھا۔ پوتا پوتی کی شادی تھی جتنی بھی خوشی ہوتی وہ

گم تھیں۔

بی بی، قیصر دلہن اور انجو بی سب ایک دم اس شادی کے ٹھہرنے سے حیران رہ گئیں۔ خصوصاً قیصر دلہن کو کافی خیال اس کا تھا کہ اب برابر کی چوٹ رہے گی۔ مگر بظاہر وہ بھی انجو بی کے ساتھ مل کر دلہن کے جوڑے اور بری کا سامان ٹھیک کرنے لگیں۔

انجو بی بھی ملول تھیں کہ شہلا کی شادی بجائے شاپور کے شاہرخ مرزا سے ہو رہی ہے۔ لیکن بہن تھی اور مصلحتِ وقت بھی یہی تھی کہ خاموش رہیں۔

زربفت تاربانے کے تھان توشک خانے سے آ گئے۔ ریت کے لئے سرخ ریشم بازار سے منگا لیا۔ اور دو جوڑے مارا مار چار دن میں خیاطنیوں نے سی ٹانک کر تیار کر دئیے۔ نتھ، ٹیکا اور جڑاؤ شیر دہان کنٹھے مرحومہ نواب بیگم کے زیور کا صندوقچہ کھول کر بڑے نواب صاحب نے دئیے۔

غرضیکہ دسہرے دربار کے پانچ روز بعد شہلا کا عقد بعوض چھتیس ہزار مہر نواب شاہرخ سے ہو گیا۔ نئی دلہن کے آنے سے محل پھر جگمگا اٹھا شاہرخ مرزا نے خلافِ عادت اپنی کمسن چچازاد سے بہت محبت کا برتاؤ کیا۔ ہر وقت محل میں گھسے رہتے اور شہلا کی ناز برداری کرتے رہتے تھے شادی کے پندرہ دن بعد وہ بیوی کو دلی لے کر آئے اور انواع و اقسام کی بیش قیمت فیشن ایبل دو درجن ساڑیاں اور پندرہ جوڑوں کا عمدہ ریشم خرید دیا۔ ہیرے زمرد کا ایک بیش بہا سٹ اپنی نازآفریں دلہن کے لئے بنوایا۔

کامران مرزا نے بیٹی کو جو زیور اس کے پہننے کا تھا اور پانچ ہزار کا ایک چیک دے دیا تھا۔ اتنی جلدی میں جہیز بھلا کیسے بن سکتا تھا۔ وہ اور بڑے نواب صاحب شہلا سے نواب کی غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

کامران مرزا تو مع بیوی کے شادی کے ایک ہفتہ بعد اپنی ملازمت پر چلے گئے تھے۔ مگر اپنی بڑی بہن اکبری بیگم کو شہلا کے پاس چھوڑ گئے تاکہ وہ اس الھڑ لڑکی کو نواب بیگم بننے کے آداب سکھائیں اور قیصر دلہن سے نبٹتی رہیں۔

قیصر دلہن بھلا اس کمسن لڑکی کو تو کیا کہتیں، کنبے کی بیٹی تھی، ویسے بھی حاشیہ آرائی کا زیادہ موقعہ نہ تھا۔ اور شاہرخ مرزا بھی بیوی پہ فریفتہ ہو رہے تھے۔ اس لئے ان کی چوٹیں بس اکبری بیگم سے چلتی رہتی تھیں۔ بھلا اکبری بیگم ان سے کیوں دبتیں۔ وہ سیر تو یہ سوا سیر۔ دونوں کی خوب زوروں میں چلتی اور ہمیشہ بڑے نواب صاحب کی بیٹی ہونے کے باعث اکبری بیگم کا ہی پلہ بھاری رہتا۔ قیصر دلہن لڑتی ہوئی ہار مان کر اپنے گھر چلی جاتیں۔

شاہرخ مرزا شہلا کی چاہت کا دم بھرنے میں ہر وقت مصروف رہتے تاکہ منجھلے چچا کو یہ جتا سکیں کہ انھوں نے ایک بہت ہی سنہرا موقعہ کھو دیا ہے۔

صالحہ بیگم نے بھانجے کی جب سلطان دلہن کو طلاق دینے اور تیسری شادی کی خبر سنی تو خدا کا شکر کیا کہ اس بے وقوف لڑکے سے فریدہ کی نہ ہوئی ورنہ نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

فریدہ کی شادی اپنی ددھیال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد خیال نوجوان سے ہوئی تھی۔ فریدہ کا دولہا بہت نیک طینت اور سلجھے ہوئے مزاج کا انسان تھا۔ اپنی بیوی کی بہت قدر کرتا تھا۔

فریدہ کی گود میں اب چھ مہینے کی بچی تھی اور وہ اپنے ناز بردار شوہر کے ساتھ بہت ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔

(۴۷)

انجمبی کی شادی ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ لیکن ان کی اور نواب سورج گڑھ کی یہ تمنا ابھی تک پوری نہ ہوئی تھی کہ ریاست کا وارث پیدا ہو جائے۔

انجمبی نے بچہ ہونے کے لئے اپنا آپریشن بھی کرایا اور پھر دہلی آکر خاندانی دائی کا علاج بھی کرایا۔ ٹونے ٹوٹکے، تعویذ گنڈوں میں بھی سینکڑوں روپیہ پھونکا۔ نذر نیاز بھی مانی۔ مگر ان کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ بمبئی کا یورپین ڈاکٹر ان سے صاف کہہ چکا تھا۔

"بیگم صاحبہ! آپ کے ہاں تو ایک نہیں کئی بچے ہو سکتے ہیں۔ مگر نواب صاحب کے یہاں اولاد ہونی مشکل ہے۔"

مگر بھلا نواب سورج گڑھ اپنے میں کوئی کمی کیوں محسوس کرتے، ان کو ان دواؤں اور کشتوں پر پورا اعتبار تھا جو آئے دن ان کے لئے ریاست کا حکیم بنا تا رہتا تھا اور پھر وہ بڈھے بھی نہ تھے کہ جو اولاد کی جانب سے مایوس ہو جاتے۔

لیکن انجمبی ہر طرح کوشش کر کے ہار گئیں۔ منجھلے دیور کے یہاں

بچّہ ہوا تو اس کو چاہنے لگیں۔ ہر وقت اس سے دلار کرتی رہتی تھیں۔ مگر دیورانی سے زیادہ دن تک ان کی نہ بنی۔ وہ ان کی طرح سیدھی نہ تھی۔ ہر وقت اس کو اس کا خیال رہتا تھا کہ کہیں میکے سیدھے سادے میاں پر بھی بڑے بھائی کی رنگین مزاجی کا اثر نہ پڑ جائے۔ بہت جھگڑے قصے ہوئے۔

آخر کار نسیمہ میاں کو لے کر حیدرآباد اپنے میکے چلی گئی۔ انجو بی کو دیورانی کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ اپنی گود خالی رہنے کا احساس شدت سے ہوا۔ اور وہ ہر وقت اداس سی رہنے لگیں۔

نواب نے بیوی کو ملول دیکھ کر کہا۔ میں بہت دن سے تم سے ایک بات کہنی چاہتا تھا۔ مگر تم کو کہیں ملال نہ ہو اس لئے نہیں کہی۔

انجو بی ہنس کر بولیں۔ توبہ سرکار! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں بھلا آپ کی کسی بات سے مجھے ملال ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ شوق سے جو چاہیں کہیئے۔

نواب نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ اب یہ دیکھ لو کہ تم نے منصور کے بچے کو کتنا چاہا مگر دلہن نے تمہارا ذرا سا خیال بھی نہیں کیا۔ بات کا بتنگڑ بنا کر تم سے لڑ کر چل دیں۔

انجو بی نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ سرکار بچہ تو ان کا ہی تھا وہ میرا کیوں خیال کرتیں۔

نواب جلدی سے بولے۔ اسی لئے تو میں چاہتا ہوں کہ ہمارا بچہ ہو جس پر ہمیں پورا اختیار ہو۔

انجو بی۔ مگر خدا کو منظور نہیں تو یہ کیسے ہو۔ میں نے سب تدبیریں

کریں۔ مگر اولاد کا سکھ ہی میری قسمت میں نہیں ہے۔

نواب۔ ایک ترکیب ہے۔ میں دوسرا نکاح کرلوں۔ شاید اس سے اولاد خدا ہمیں دے۔ میرا بچہ بہر حال تمہارا ہوگا۔

انجو بی کے دل پر دوسری شادی کے ذکر سے صدمہ تو ہوا مگر بظاہر انھوں نے خوش ہو کر مستقل لہجے میں کہا۔ بہت اچھا خیال ہے آپ کا۔ ہاں ضرور آپ شادی کریں۔ گھر میں رونق تو ہوگی۔

نواب نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ میری نیکدل انجو۔ میں جانتا تھا کہ میری خوشی کے لئے تم یہ بھی گوارا کرلوگی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی طرف کی کوئی خوش شکل کمسن لڑکی پسند کرلو۔ تاکہ وہ تمھارے تابع فرمان رہے۔ میں کوئی شوق اور خوشی کے لئے نکاح نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ صرف اولاد کی خاطر کروں گا۔ میری بیوی ہمیشہ تم ہی رہو گی۔ میری روح و دل کی مالک تو تم صرف تم ہو۔

بیوقوف انجو نواب کی یہ چکنی چپڑی باتیں سن کر حسب معمول خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ اور کہا اچھا آپ مطمئن رہیں۔ اگلے مہینے شاہدہ کی شادی کرنے حیدرآباد میں پھول پور جاؤں گی تو وہیں کوئی لڑکی بھی دیکھوں گی۔

نواب سورج گڑھ بہت ذہین انسان تھے۔ یہ بھی ان کو یقین تھا کہ بیوی والہانہ محبت مجھ سے کرتی ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ سوچا کہ کام بھی بن جائے اور لوگ مجھے برا بھی نہ سمجھیں۔ اور یہ ترکیب ان کی کارگر ہوئی۔

انجو بی یوں تو بڑی بہن تھیں تینوں بھائی ان کو عزیز تھے لیکن

شاپور کو وہ بہت چاہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ان کا ہمدرد اور غمگسار رہا تھا۔

شاپور کی نسبت دیوان پھولپور کی حسین و جمیل لڑکی غوثیہ سے ٹھہری تھی۔ اب شادی کی تیاری بہت اچھے پیمانے پر انجو بی نے کی۔ دیوان صاحب کوئی غیر نہ تھے۔ ان سے بڑے نواب صاحب کی سگی بھتیجی بیاہی ہوئی تھیں۔ اور غوثیہ شاپور کی رشتے سے پھوپی زاد ہوتی تھی۔

شاپور مرزا کی شادی سے دو ہفتہ قبل انجو بی پھولپور پہنچیں۔ بہت دھوم سے انھوں نے بھائی کی شادی رچائی۔ مگر میاں کے خیال سے بھی غافل نہیں تھیں۔ برابر ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھیں۔ آخر ان کی نگاہِ انتخاب حکیم سید احسن علی کی بڑی لڑکی کوثر پہ پڑی۔ حکیم صاحب مرحوم نواب فریدوں بخت کے ہم سن، ساتھ کے کھیلے تھے۔ وہ ان کو ہمیشہ بھائی کہتے تھے اور بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ اسی لئے انجو بی اور سب بہن بھائی حکیم صاحب کو چچا اور ان کی بیوی کو چچی کہتے تھے۔
حکیم صاحب کا انتقال ہوئے دو سال ہوئے تھے۔ ان کی بیوی کو ریاست سے تیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ بیس روپیہ مہینہ نواب پھولپور اپنی جیب سے دیتے تھے۔ انجو بی سیدانی بی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ کیونکہ وہی اِک واحد ہستی تھیں جو گوارا تے میں انجو بی کی قیصر دلہن کی بدسلوکی پہ ہمدردی کرتیں اور ان کے آنسو پونچھتی تھیں۔ ان کے بیوہ ہونے کے بعد سے انجو بی بھی پچیس روپیہ ماہوار دینے لگی تھیں۔ اور جب آئیں ان کے لئے سوغات میں کوئی کپڑا وغیرہ ضرور

لاتیں۔ ان کی بڑی لڑکی کوثر نے پندرھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اچھی خوش شکل نیک طینت لڑکی تھی۔ انجو بی نے جیسے ہی بھائی کی شادی سے فرصت پائی سیدانی بی کو میاں کا پیغام دے دیا۔ پہلے تو وہ منھ کھولے ہنستی رہیں۔ پھر جب انجو بی نے مسکرا کر جواب کا تقاضہ کیا، تو ٹھنڈا سا سانس لے کر بولیں۔ میں تو بیٹی تمھاری ہمت دیکھ رہی ہوں، کتنا بڑا دل ہے تمہارا۔ خدا جب امیر رئیس بناتا ہے تو دل بھی بڑا کر دیتا ہے۔ اپنی سوکن آپ ڈھونڈ رہی ہو۔ شاباش ہے تم کو۔ مگر مجھ میں یہ حوصلہ نہیں کہ اپنی بیٹی کو تمہاری سوکن بنا دوں۔

انجو بی نے کہا توبہ اچھی سوکن کیسی۔ وہ تو میری چھوٹی بہن ہوگی۔ بھلا آپ جب اتنی محبت مجھ سے کرتی ہیں تو آپ کی بیٹی بھی آپ جیسی ہی ہی ہوگی۔

سیدانی بی نے کہا۔ نہیں بنو۔ مجھے تم بھی عزیز ہو، اور اپنی بیٹی کو بھی بجھے کانٹوں میں نہیں الجھانا۔ ابھی اس نگوڑی کی عمر ہی کیا ہے معصوم ساری عمر سکھے کو سے گی۔ کیا میں نواب سورج گڑھ کی عادت سے واقف نہیں۔ تم جیسی نیک کوکھ کی بیٹی خدا دنیا جہان کو دے جو بھر رہی ہو۔ ہر ایک لڑکی کا دل اتنا بڑا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خاطر جمع رکھو کہ اولاد وہ ایک نہیں ہزار شادیاں کریں ان کے ہاں ہو نہیں سکتی۔ تمہارے چچا اللہ بخشے کہتے تھے کہ انھوں نے ہر طرح کا علاج ان کا کر کے دیکھ لیا۔ مگر انھوں نے تو نوعمری میں غلط حرکات کر کے ایسا اپنا ستیاناس مارا ہے کہ بالکل ناقابل ہو گئے ہیں۔ پھر بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔ یہ کہہ کر وہ تو چلی گئیں اور انجو بی دور خلا میں تکتی

نگاہیں تکتی رہ گئیں۔

اور اس کے بعد ان کی اس سلسلے میں کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سورج گڑھ واپس جا کر انھوں نے میاں سے کہہ دیا سرکار! پھولپور والے یا دلی والے میری وجہ سے آپ کو بیٹی نہ دیں گے۔ ہر ایک کو میرا خیال دامنگیر رہے گا۔ آپ یہیں کوئی جگہ تجویز کریں۔ میں خود آپ کی شادی کروں گی۔

مگر انجوبی جتنی بھولی تھیں، اتنے ہی نواب چلتا پرزہ تھے چند منٹ سوچتے رہے پھر بولے۔ ارے ہاں انجو! تمھارے چھوٹے ماموں کی لڑکی عذرا بھی تو ہے۔ میرا خیال ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔ تم عذرا کو مانگو۔

انجوبی حیران ہو کر بولیں۔ مگر عذرا تو ابھی بارہ سال کی ہے۔ بھلا ابھی سے اس کو کیسے ماموں جان کر دیں گے۔

نواب سورج گڑھ نے کہا یہ تو اچھا ہی ہے ڈارلنگ! کہ لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ تمہارے کہنے پہ چلے گی۔ پھر وہ سگے ماموں کی بیٹی ہوگی تو اس کو تمھارا قدرتی طور پہ زیادہ خیال ہوگا۔

انجوبی نے شادی کے بعد سے اپنے دماغ سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ان کا جسم ہی نہیں روح، دل و دماغ سب میاں کے مطیع تھے، جو نواب سورج گڑھ کہتے، پالتو طوطے کی طرح وہ دوہرا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی انھوں نے میاں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور کہا تو میں ماموں جان کو ابھی خط لکھے دیتی ہوں۔

ہوشیار نواب نے پھر کہا۔ خط لکھنے سے کام بگڑ جائے گا ان کو تو تار دے کر یہاں بلا کر کہنا چاہیئے۔

انجو بی نے میاں کے اس خیال پر بھی صاد کر دی۔

نواب سورج گڑھ نے انجو بی کی جانب سے منور مرزا کو تار دلوا دیا "فوراً آئیے۔ ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

منور مرزا کا تبادلہ اب انبالہ سے کرنال ہو گیا تھا۔ ان کی بیوی مع بچوں کے مہینہ بھر سے میکے گئی ہوئی تھیں۔ وہ تار پا کر حیران رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انجو بی کو ایسا کیا ضروری مشورہ ان سے کرنا ہے۔ جو بجائے خط کے تار بھیجا۔ چند گھنٹے غور کرنے کے بعد انھوں نے جانا ہی بہتر سمجھا۔ چہیتی بھانجی پھر ایک بڑی ریاست کی بیگم۔ محبت اور امارت کا خیال دونوں ہی ان کے دامنگیر ہوئے۔

اپنے افسر کو تار دکھا کر ایک ہفتے کی رخصت مانگی، وہ بھی بیگم سورج گڑھ کا تار دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ معمولی رد و کد کے بعد رخصت منظور کر لی۔ منور مرزا دوسرے روز شام کو روانہ ہو گئے۔ اور انجو بی کو اپنی روانگی کی اطلاع تار پر دیدی۔

احمد آباد اسٹیشن پر ان کے لئے نواب سورج گڑھ کی پیکارڈ اور ان کے چچا اور سکریٹری استقبال کے لئے موجود تھے۔

گاڑی کا ہارن سن کر انجو بی ماموں کی پیشوائی کے لئے لپکیں اور منور مرزا کے دہلیز میں قدم رکھتے ہی دوڑ کر ان کے گلے سے لگ گئیں۔ منور مرزا نے بہت محبت سے بھانجی کو گلے لگایا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا خیریت تو ہے۔ تم نے مجھے تار دے کر کیوں بلایا ہے؟ میں بہت پریشان ہو کر آیا ہوں تمہاری ممانی بھی مراد آباد گئی ہوئی ہیں سارا راستہ میرا عجب الجھن میں گزرا ہے۔

انجوبی نے مسکرا کر کہا۔ جی ہاں اللہ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ اس لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔ ملاقات کے کمرے میں انجوبی ماموں کو لے کر بیٹھی ہی تھیں کہ نواب سورج گڑھ ڈریسنگ گون میں لپٹے، بکھرے بالوں سے مسکراتے ہوئے داخل ہوئے اور منور مرزا کو بہت جھک کر آداب کیا۔ انھوں نے گلے لگایا مزاج پوچھا۔

انجوبی نے پیش خدمتوں کو ہدایت کی "ماموں جان کا سامان باہر مہمانوں والے کمروں میں نہ رکھا جائے۔ بلکہ میرے کمروں کے قریب جو کمرہ ہے جس میں عظمیٰ بی ٹھیرا کرتی ہیں، اس میں رکھو۔

اور منور مرزا سے کہا۔ آپ اتنے طویل سفر کے بعد آئے ہیں، منہ ہاتھ دھولیں تو چائے منگواؤں۔

منور مرزا نے کہا۔ چائے میں نے صبح آٹھ بجے پی لی تھی۔ اب تو گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ چائے کا کونسا وقت ہے۔ نواب صاحب نے کہا تو اچھا آپ غسل تو کر لیجئے۔ میں بھی ابھی اٹھا ہوں۔ نہا دھو کر آدمی بن جاؤں۔

منور مرزا تیار ہو کر تھوڑی دیر بعد آ گئے۔ انجوبی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ منور مرزا نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ نواب سورج گڑھ کے چچا بھی بیٹھے تھے۔ نواب بھی ایک بجے کے قریب آ گئے ڈیڑھ بجے میز پر خاصہ لگنے کی اطلاع ملی۔ اور سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ بھلا نواب سورج گڑھ کی میز پر پر تکلف کھانوں کی کیا کمی تھی۔ اور آج تو انجوبی کو اپنے ماموں کی خاطر خاص طور پر منظور تھی۔ مگر

منور مرزا کی غذا بھی اپنے گھرانے کی طرح بہت کم تھی۔ انھوں نے بہت جلد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب پھلوں کی باری آئی۔ منور مرزا نے جلدی جلدی سیب کی دو قاشیں منھ میں رکھیں اور یہ کہہ کر ہنستے ہوئے کھڑے ہوگئے "بھئی اب اگر بیٹھا رہا تو کچھ اور کھانا پڑے گا۔" ان کے اُٹھتے ہی نواب اور انجو بی بھی کھڑے ہو گئے۔ کھانے کے بعد چچا باہر گئے تو منور مرزا نے نشست کے کمرے میں بیٹھتے ہی یہ سوال کیا۔ ہاں انجو اب بتاؤ کیا ضروری کام تھا۔ جو تم نے مجھے بلایا۔ انجو بی نے ماموں کے گلے میں اپنی دونوں بانہیں ڈال کر بہت لاڈ بھرے انداز سے کہا۔ میں عذرا کو آپ سے اپنے لئے مانگتی ہوں۔ یقین ہے آپ اپنی چہیتی بھانجی کی یہ تمنا پوری کریں گے۔

منور مرزا سمجھے شاید انجو بی اپنے چھوٹے دیور جمشید کے لئے عذرا کو مانگ رہی ہیں۔

جمشید کی منگنی عظمیٰ کی شادی کے موقع پر جب انجو بی دلّی گئی تھیں تو ملکہ جہاں بیگم کی نواسی نورجہاں سے انھوں نے بہت دھوم سے کی تھی طرفین سے برابر چار سال تک لین دین خوب ہوتے رہے۔ مگر جمشید نے ولایت میں بھی اور وہاں سے آنے کے بعد بھی وہ رنگ رلیاں منائیں کہ اس کی اطلاع ملکہ جہاں بیگم کو مل گئی۔ اور انھوں نے اپنی نواسی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مگر جمشید تھا کہ اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ میں نورجہاں سے ہی شادی کروں گا۔ خود بھی دلی جا کر ملکہ جہاں بیگم کی خوشامد کی۔ اور پھر جب شاپور کی شادی میں انجو بی گئیں تو ان سے بھی کہا کہ کسی نہ کسی طرح شادی اس کی کرا دیں۔

انجو بی نے بھی بہت کہا سُنا۔ مگر ملکہ جہاں بیگم بڑی سمجھدار جہاندیدہ بیوی تھیں۔ انھوں نے صاف کہہ دیا۔

"بیوی تمھارے میاں کا اثر چھوٹے بھائی پہ بہت ہے۔ تم اگر چاہتی ہو کہ نورجہاں سے شادی ہو تو نواب سے کہو دلی میں کوٹھی خرید کر نورجہاں کے نام لکھ دیں۔ مجھے جمشید پہ اب اعتبار نہیں رہا۔ لڑکی کو جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا نہیں دوں گی"

انجو بی یہ صاف جواب سن کر سورج گڑھ چلی آئیں۔

منور مرزا کو انجو بی کے طرزِ گفتگو سے اس کا پورا یقین ہو گیا کہ عذرا کو جمشید کے لئے وہ مانگنا چاہتی ہیں اور اس یقین سے ان کا دل خوش ہو گیا۔ اور وہ مسرور لہجے میں بولے۔

بیٹا تم میری مرحوم بہن کی نشانی ہو، اور بجز اولاد کی طرح تم کو عزیز رکھتا ہوں۔ عذرا تمھاری چھوٹی بہن ہے تم کو اس پہ پورا اختیار ہے "

انجو بی چہک کر بولیں۔ دیکھا سرکار! آپ نے۔ میرے ماموں جان مجھے کتنا چاہتے ہیں۔

نواب سورج گڑھ بیوی کی بات کا جواب دینے کی بجائے مسکرانے لگے۔

انجو بی نے منور مرزا سے کہا۔ آپ نے میری جھولی بھر دی، اس کا شکریہ کس منھ سے ادا کروں۔ عذرا کو میں اپنی سر آنکھوں پہ رکھوں گی۔ اس سے میرا دل بہلا رہے گا۔ یہ اتنا بڑا محل مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے اب عذرا کے آنے سے اس میں رونق ہو جائے گی۔ پھر خدا اس کو اولاد دے گا تو یہ محل روشن ہو جائے گا۔ ریاست کا وارث پیدا ہو گا اور عذرا

کا بچہ میرا اپنا بچہ ہوگا۔ میرا دل خوش رہے گا۔ میری خوشی اور سرکار کی خواہش ہے کہ عذرا سورج گڑھ کی چھوٹی بیگم بن جائے۔

منور مرزا نے اتنی دیر میں جو خیالوں کا رنگ محل تیار کیا تھا وہ انجو کے آخری جملے سے اڑاڑا دھم کر کے گر پڑا۔ منور مرزا نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ انجو بی دیرانی بنانے کے لئے نہیں سوکن بنا کر لانے کو عذرا کو تیار ہیں۔ انھوں نے ایک دم گھبرا کر کہا۔ کیا کہہ رہی ہو انجو؟

انجو بی مستقل لہجے میں بولیں۔ ماموں جان مجھے آپ کی شفقت اور محبت پہ پورا بھروسہ ہے، اب دیکھئے مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔ عذرا میری ہو چکی۔ آپ اس کو مجھے دے چکے۔ انشاء اللہ یقین ہے ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔ سورج گڑھ کی قسمت کا ستارہ عذرا کے آنے سے چمک جائے گا۔ میرے یہاں اولاد نہ ہو سکی تو میری بہن کی گود خدا بھرے یہ بھی اس کا کرم ہوگا۔

منور مرزا۔ مگر بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تم پہ دیدوں۔ دنیا کیا کہے گی۔

انجو بی نے کہا آپ کو دنیا کا خیال زیادہ ہے یا میرا۔ اور جب میں خود یہ شادی اپنے میاں کی کر رہی ہوں تو دنیا کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

منور مرزا۔ "انجو تمہارا لڑکپن ہے، جو اس بات کو آسان سمجھ بیٹھی ہو۔ اور لوگوں کو تو چھوڑو مگر بھلا ابا جان مجھے اس کی اجازت کیوں دیں گے اور"

انجو بی بات کاٹ کر بولیں۔ نانا جان تو حج کو گئے ہوئے ہیں وہ

تو کہیں تیزیوں کے چاند تک واپس آئیں گے۔ آج تو بقر عید کی چار یا پانچ تاریخ ہے۔ آپ کل ہی واپس جائیے۔ اور اچھی سی کوئی تاریخ عید کے بعد ٹھہرا دیجئے۔ میں تو چاہتی ہوں جتنی جلدی ممکن ہو، عذرا ہمارے محل کی رونق بن کر آجائے۔

منور مرزا۔ ارے بھئی۔ تم نے شادی بیاہ کو بھی گڑیوں کا کھیل سمجھ لیا ہے۔ نہ سوچتی ہو نہ سمجھتی ہو، بس ضد کئے جاتی ہو۔ یہ تو بڑا ہنگامہ تم نے کھڑا کر دیا۔ دادی اماں اور بڑی چچی اماں بھلا کیسے یہ منظور کریں گی۔ کہ عذرا کو تمھاری سوکن بنا دیا جائے۔

انجو بی بولیں۔ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ میں بڑی نانی اماں کو اچھا خط لکھتی ہوں وہ اماں جان کو بھی سمجھا دیں گی۔ اور شاپور کو بھی میں سمجھا کر لکھ دوں گی۔ وہ آپ کی امداد اس معاملے میں ہر طرح کریں گے۔

منور مرزا بے چارے اس وقت بہت کشمکش و پیچ میں تھے۔ نواب سامنے بیٹھا تھا اس لئے صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور انجو بی کی خوشنودی کا بھی خیال تھا۔ یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ اچھا بھئی، اب تو میں ذرا سوتا ہوں، رات کو ٹرین میں نیند اچھی طرح نہ آئی۔ تم بھی آرام کرو۔

منور مرزا بہت بن ٹھن کر لیٹے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے ادھیڑ بن میں چار بج گئے۔ اور منور مرزا اٹھے۔ انجو بی نے آکر کہا۔ ماموں جان کیا ابھی تک آپ سو رہے ہیں۔ منور مرزا نے کہا۔ لیٹا تو تھا مگر نیند ہی نہیں آئی۔ میں ابھی نماز عصر کی پڑھ کر آتا ہوں۔

انجو بی اپنے کمرے میں اس وقت اکیلی بیٹھی تھیں۔ منور مرزا بھی وہیں

چلے گئے اور کہا کہ انجو تم کو یہ کیا سوجھی ہے کہ میاں کی شادی رچانے کی فکر میں ہو، اور وہ بھی عذرا سے۔ وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ تمہارے میاں کے سامنے میں بول نہیں سکتا تھا۔ خدارا تم مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو، بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اِدھر تمہاری محبت دامنگیر ہے ادھر باپ دادی اور پورا خاندان ہے۔ پھر ابھی عذرا کی عمر ہی کیا ہے۔

انجو بی آہ سرد لے کر بولیں کیا کروں ماموں جان مجھ پر بُری بنی ہے، نواب کو یہ خیال ہے کہ دوسری بیوی سے اولاد ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ عذرا کو میں بیاہ لاؤں، وہ میری بہن ہے میرا خیال کرے گی۔ اس وقت مجھے آپ کا سہارا ہے یا خدا کا۔ ان کے دل میں دوسری شادی کا خیال بیٹھ گیا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ان کا یہ شوق بھی پورا کر دوں۔ سب طرف نظر ڈالی۔ آپ مجھے چاہتے ہیں اس کا مجھے یقین تھا۔ خدارا آپ انکار نہ کیجئے گا ورنہ میرے لئے بڑی مشکل ہوگی شادی نواب ضرور کریں گے نہ جانے کون میرے سینے پر مونگ دلنے آن بیٹھے گی۔

منور مرزا گو مگو کے عالم میں تھے۔ انجو بی کی خوشامد اور سورج گڑھ کا جاہ و حشم شان و شکوہ اگر ایک جانب ان کو کھینچتا تھا تو دوسری جانب باپ دادی اور سارے خاندان کی ناراضی کا خوف غالب تھا مگر آخر ان کو انجو کی منت سماجت سے مجبور ہو کر کہنا ہی پڑا۔ تمہاری خوشی کے لئے مجھے سب گوارا ہے۔ مگر آخری فیصلہ میں تمہاری ممانی سے مشورہ کرنے کے بعد کروں گا۔

انجو بی خوش ہو کر بولیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ممانی جان کو بھی میں لکھ رہی ہوں۔ بس آپ تو ان سے صلاح کر کے جلدی سے شادی کی تاریخ ٹھہرا کر مجھے تار دے دیجئے گا۔

منور مرزا دوسرے روز شام کو دلّی روانہ ہو گئے۔ بیوی کو انھوں نے تار دے دیا تھا کہ میں اک ضروری کام سے دلی آرہا ہوں تم بھی پہنچ جاؤ۔ وہ ان کے پہنچنے سے چند گھنٹے قبل دلی آگئی تھیں۔ دو گھنٹے تک میاں بیوی نے سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ آخر منور دولہن نے کہا اگر انجو خود چاہتی ہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ تو ٹھیک بات کہ اللہ کا حکم ہوا اور عذرا کو خدا صاحب اولاد کرے تو انجو کے لئے بھی بھلائی ہوگی۔ اور انجو جب خود اپنے میاں کی شادی کرنی چاہتی ہیں تو کسی اور کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ خود سب کو لکھ دیں گی۔ عذرا کی اولاد بھی انجو کی اپنی اولاد کی طرح ہوگی۔ اگر ہم نے انکار کر دیا اور نواب نے کہیں اور نکاح کر لیا تو بے چاری انجو کی زندگی دو بھر ہو جائے گی۔ پہلے ہی وہ کونسی خوش رہتی ہے رہا سہا سکھ بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر انجو کو خیال ہوگا ماموں نے اپنی بیٹی کو مجھ سے عزیز کیا۔

منور مرزا کے دل پر جو بار تھا بیوی کی باتوں سے اتر گیا۔ انھوں نے دو روز بعد منظوری کا تار دے دیا۔ اور خط میں تاریخ دن بھی شادی کا مقرر کر کے لکھ دیا۔

منور دولہن ایک کابلی خاندان کی لڑکی تھیں۔ ان کے خاندان میں دو شادیاں کرنے کا عام رواج تھا۔ اس لئے ان کو عذرا کی شادی انجو ہی کے میاں سے کرنی ذرا بھی بری نہیں لگی۔ بلکہ وہ تو اس خیال سے بہت مسرور تھیں کہ خدا نے ان کی صاحب نصیب بیٹی کے لئے اتنے بڑے رئیس کا پیغام بھیج دیا۔ بیٹی کی شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے کے خیال سے وہ باغ باغ ہو رہی تھیں

منور مرزا نے سکندر زمانی بیگم اور بڑی چچی سے اس کا ذکر کیا تو سکندر زمانی بیگم تو حیران رہ گئیں اور بڑی بہو صاحب حسب عادت پیچنے لگیں اوئی نوج شاباش

ہے۔ تم کیسے ماموں ہو؟ اپنی بیٹی کو انجو کی سوکن بناؤ گے۔ واہ رے دور، اس ریاست کو کیسا زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے۔"

منور مرزا نے آہستہ سے کہا۔ مگر انجو کے خیال سے ہی تو میں نے اقرار کیا ہے۔ اس نے بلا کر میری بہت خوشامد کی۔ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگی۔" اگر یہاں نہیں ہوگا تو نواب کہیں اور نکاح کرے گا۔ انجو پہ تو سوکن ہر طرح آئے گی۔ میں تو اپنی بیٹی انجو کی خوشی کے لئے قربان کر رہا ہوں۔

بڑی بہو صاحب بپھر کر بولیں۔ نواب کرتا ہے تو کرے ہماری پیزار سے ان نوابوں کے تو وطیرے ہی یہ ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کی لڑکی اور کیوں جائے۔ بھلا کہیں بھی یہ ہوا ہے کہ ماموں اپنی بیٹی بھانجی پہ ٹھے۔ جھلسا لگے اس ریاست کو۔ تمہاری بیٹی کیا قربانی کی بکری ہے جو قربان کئے دیتے ہو۔"

منور مرزا اس مدلل گفتگو کا جواب کیا دیتے رونے لگے۔

سکندر زمانی بیگم نے کہا۔ ہائیں بیٹا مرد ہو کر روتے ہو۔

منور مرزا بھر آئے ہوئے لہجے میں بولے۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ادھر انجو نے مجھے مجبور کیا۔ ادھر آپ اور چچی اماں ناخوش ہیں۔ میں جان سے بیزار ہوں، جی چاہتا ہے اپنے گولی مار لوں۔

سکندر زمانی بیگم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ خدا نہ کرے جو تم اپنے گولی مارو۔ میں تو منجھلی دلہن کو رو رہی ہوں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو یہ تماشا نہ ہوتا۔ منجھلے میاں بھی گئے ہوئے ہیں۔ میں بدنصیب یہ سوانگ دیکھنے کو بیٹھی ہوں۔ انجو تو ازل سے پھوٹی قسمت لے کر آئی ہے۔ بچپن میں ماں مری، جوان ہوئی تو باپ رخصت ہوئے۔ بیاہی گئی تو میاں کی رنگ رلیوں کی بدولت سکھ نہیں ملا۔ اولاد بھی خدا نے نہیں دی کہ یونہی اس دکھیا کے آنسو پنچھ جاتے۔

اس کا تو فکر نہ کرو، مگر ہاں اپنی بیٹی کے دشمن کیوں ہوئے ہو۔ ابھی اس نگوڑی کی عمر ہی کیا ہے۔ ایسی کون سی جوانی ڈھلی جا رہی ہے جو یوں جان بوجھ کر جھونک رہے ہو۔ نواب سورج گڑھ کی بابت تم کو مجھ سے زیادہ سب کچھ معلوم ہے۔ اتنا میں کہے دیتی ہوں کہ اس شادی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ لڑکی ساری عمر سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گی اور تم کو بھی اس کی طرف سے چین نصیب نہ ہوگا۔ یوں تم کو اختیار ہے تمھاری اولاد ہے، یہ کہہ کر سکندر زمانی بیگم نے تو عشار کی نماز کی نیت باندھ لی۔

منور مرزا منہ لٹکائے سر جھکائے اُٹھ کر چلے گئے۔ مگر بڑی بہو صاحب بہت دیر تک بیٹھی آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہیں۔

عید کے دوسرے دن چھمو اپنے اک افسانے پہ نظر ثانی کرنے بیٹھی ہی تھی کہ اس کے کان میں منور مرزا کی آواز آئی اور وہ آداب کرنے کے لئے بھاگی ہوئی آئی۔ منور مرزا چھوٹی بہو صاحب سے حسبِ عادت بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ منور دلہن بھی پاس بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ چھمو نے بھائی بھاوج کو آداب کیا۔ خود بھی ان کی باتوں میں حصہ لینے لگی۔ اس کو یہ سن کر حیرت ہوئی کہ عذرا کی نسبت نواب سورج گڑھ سے ٹھہر چکی ہے اور ایک ہفتہ بعد شادی ہونے والی ہے۔ اور یہ تجویز خود انجو کی تھی بہت اصرار اور خوشامد سے انجو نے ماموں سے عذرا کو مانگا تھا۔ چھوٹی بہو صاحب کو یہ ذکر کچھ اچھا نہ لگا۔ مگر جب ساس اور بڑی جٹھانی ہی ان کی اس نسبت کی منظوری دے چکی تھیں تو وہ کیا کر سکتی تھیں۔ چھمو کو تو اتنا برا لگا کہ خاموش اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور اس نے اسی وقت انجو کو خط لکھا:

"تم نواب نصرت کی چاہت میں بالکل پاگل ہو گئی ہو۔ بھلا یہ کیا تک ہے کہ خود میاں کی شادی رچا رہی ہو، اور وہ بھی سگے ماموں کی بیٹی سے۔ اپنے دوستوں کو دشمن بننے کے لئے مجبور کر رہی ہو۔ تم جیسا احمق بھی دوسرا دنیا کے پردے پر

نہ ہوگا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے آنکھیں کھولو اور خود اپنی تباہی کا سامان نہ کرو۔ اگر عذرا سے تمہارے میاں کی شادی ہوگئی تو تم کو میکے میں بھی آکر سکون نصیب نہ ہو سکے گا۔"

منور مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد مع بیوی کے چلے گئے۔ شادی عذرا کی اب قریب تھی، ان کو سارا انتظام کرنا تھا۔

منور دلہن کی بہنیں، بھاوجیں شادی سے چار دن پہلے آگئیں، اور جلدی جلدی عذرا کے جوڑے درست کرنے لگیں۔ امینہ کا پورا جہیز یونہی رکھا تھا۔ وہ بیچاری تو شادی کے دو سال بعد ہی اللہ کے یہاں سدھار گئی۔ اور اس دو سال میں بھی آٹھ مہینے تو بیماری کے ہی گزرے۔ بس سوا سال جو پہنا وہ پہنا۔ بہت سے جوڑے ایسے تھے جن کا ٹانکا بھی نہ ٹوٹا تھا۔ ان کو ہی ادل بدل کر ٹھیک کر دیا۔ کچھ نئے بنائے گئے۔ غرضکہ اکیس جوڑے منور دلہن نے رات دن لگ کر ٹھیک کر لئے۔ زیور بھی امینہ کا ہی بدلوا کر ٹھیک کرایا اور چاندی کا چھپر کھٹ بھی اسی کا ہی تھا۔ باقی برتن اور کاٹ کباڑ وغیرہ دینے کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ لڑکی ایسی جگہ بیاہ کر جارہی تھی کہ وہاں ان چیزوں کی کمی نہ تھی۔

سکندر زمانی بیگم اور بڑی بہو صاحب معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی تھیں۔ دونوں بیویاں الگ تھلگ رہتی تھیں۔ منور دلہن بھی سہمی ہوئی رہتی تھیں جانتی تھیں کہ ان دونوں کی بالکل مرضی یہاں شادی کرنے کی نہیں ہے۔ اس لئے خاموشی سے سب کام کر رہی تھیں۔

عذرا کی مائیوں کے وقت منور مرزا بمشکل دادی چچی کو لے کر آئے۔ چھوٹی بہو صاحب کو کوٹھی سے وہ صبح ہی جاکر لے آئے تھے۔ البتہ چمّو نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا "آج میرے سر میں درد ہے کل آجاؤں گی۔

مائیوں کی رسم کے بعد ساس دونوں بہوؤں کو ساتھ لے کر اوپر کوٹھے پر چلی گئیں۔ تینوں دم بخود تھیں۔ رنج اور ندامت نے ان خوددار بیگموں کے لبوں کو سی دیا تھا۔ کہتیں کیا۔ اور کس کو کہتیں۔ سکندر زمانی بیگم کا دل تو رنج و صدمہ سے ایسا تہہ و بالا تھا کہ اس کی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی۔ عذرا کو انجوبی پہ دے کر منور مرزا نے ان کے خاندانی وقار اور گھرانے کی آن بان کو سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ ان کا ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہنے کے باعث ان کو دوسرے دن صبح ہوتے ہی بخار چڑھ آیا۔ لرزہ ایسا تھا کہ دونوں بہوویں ان کو دبوچے بیٹھی تھیں مگر وہ پھر بھی کانپ رہی تھیں۔ دن چڑھتے ہی چھوٹی بہو صاحب نے ڈاکٹر بیسن کو بلوایا۔ وہ آئے نسخہ لکھا، دوائی کی ایک خوراک پی کر سکندر زمانی بیگم کی کپکپی ذرا ٹھہری۔ مگر بخار اب بھی ایک سو تین تھا۔

رنگ محل کے بالاخانے پر تو بڑی بہو صاحب چھوٹی بہو صاحب بیمار ساس کے پلنگ کے پاس آبدیدہ و پریشان صورت بیٹھی ہوئی تھیں۔ نیچے محل میں مہمان بیویاں آ رہی تھیں۔ سواری پہ سواری اتر رہی تھی۔ گانا ہو رہا تھا۔ نواب سورج گڑھ کا اسپیشل صبح ہی پہنچا تھا۔ ان کے ہمراہ چچا چچی ان کا پرائیویٹ سیکریٹری اور دیوان ریاست آئے تھے۔ شاپور مرزا دو دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ شاہ رخ مرزا کو بھی انجوبی نے بہت تاکید اس شادی میں شرکت کرنے کی لکھی تھی۔ مگر انھوں نے بہن کو لکھ دیا تھا' آپ کوئی عقلمندی نہیں کر رہی ہیں کہ ماموں کی بیٹی کو اپنی سوکن بنا رہی ہیں میں آپ کی اس حماقت میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ ماموں نے جو بلاوا بھیجا اس کا انھوں نے جواب بھی نہیں دیا۔ ججو بھی صبح آ گئی تھی، مگر دادی پاس ہی افسردہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اب دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ نکاح عذرا کا ہو چکا تھا ڈومنیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر مبارکباد گا رہی تھیں۔ بری کے بھاری جوڑوں کی کشتیوں

سے سب مہمان بیویاں مرعوب تھیں۔ زیور منور دلہن سب کو دکھا کر خوش ہو رہی تھیں۔ عذرا کو دلہن بنا دیا گیا تھا۔ دبلی پتلی سانولے رنگ کی یہ چھوٹی سی بھولی لڑکی زرکار بھاری لباس اور زیوروں سے لدی ہوئی بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔ اس نادان لڑکی کو یہ کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا سودا بہت کھوٹے سکوں پر کیا گیا ہے۔ ابھی تو وہ آغاز انجام سے بے خبر مگن تھی۔ اس کے لبوں پر اک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ اپنے کو بہت اہم ہستی سمجھ رہی تھی۔ آرسی مصحف کی رسم سے قبل منور مرزا دونوں چچیوں کو بلانے آئے اور یہ دونوں بیبیاں مجبور ہو کر ان کے ہمراہ نیچے اتریں۔ وہ مہمان خواتین کے ہجوم کو ہٹاتے دولہا دلہن کی مسند کے قریب لے گئے۔

نواب سورج گڑھ نے ان کو بہت جھک کر آداب کیا۔

بجائے طول طویل دعائیں دینے کے دونوں نے ایک ساتھ خشک لہجے میں کہہ دیا "جیتے رہو" اور ذرا پرے ہٹ کر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئیں۔

چھمو بھی مہمان بیویوں کے جھرمٹ کی اوٹ لئے کھڑی تھی۔ لیکن آج اس کے منہ پہ شگفتگی نہیں تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہی وقت ہے، وہی سماں ہے، وہی دولھا ہے مگر دلہن وہ نہیں چھمو کے لبوں پر بے ساختہ سرد آہ آ گئی، اور اس کو ایسا معلوم ہوا کہ رنگ محل کے در و دیوار پر بجائے شادمانی کے حسرت برس رہی ہے، اور یہ شادی کا ڈھول نغمۂ شادی نہیں نوحۂ غم ہے۔ اور اس کے حساس دل پر ایسی چوٹ لگی کہ بے اختیار آنکھیں آنسو بہانے لگیں اور وہ جلدی سے آنسو پونچھتی اپنی دادی پاس واپس چلی گئی۔ یہاں ابھی ابھی ان کے رشتے کی ایک کھاوج آ کر بیٹھی تھیں اور منور مرزا کی اس حماقت پر افسوس کر رہی تھیں کہ کسی سے صلاح مشورہ کئے بغیر انھوں نے اپنی چھوٹی سی لڑکی کو جان بوجھ کر نواب

سورج گڑھ سے بیاہ دیا تھا۔

سکندر زمانی بیگم نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ کیا کہوں بھاوج! کچھ کہنے کا مقام نہیں ہے۔ کلیجہ غم کے مارے منھ کو آئے جاتا ہے۔ منجھلی دلہن زندہ ہوتیں تو یہ رنگ کاہے کو رچتا۔ بن ماں کے بچے بے سری فوج ہو جاتے ہیں۔ منور مرزا میں تو عقل نام کو نہیں ہے۔ اور انجو تو سدا کی بے وقوف ہے۔ میاں کی چاہت میں اور بھی دیوانی ہو گئی۔ غضب خدا کا میاں کی باتوں میں آ کر سگے ماموں کی بیٹی کو منت خوشامد سے مانگ لیا۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ انجو پر سوکن جا رہی ہے تو میرا دل بگھڑنے لگتا ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ عذرا سوکن جا رہی ہے تو صدمہ ہوتا ہے میرے لئے تو دونوں یکساں ہیں۔ انجو اور منور مرزا کی حماقت دیکھو آئندہ کیا رنگ لاتی ہے۔ زیادہ جینا بھی بُرا ہوتا ہے۔ بس خدا میرا تو ساتھ ایمان کے خاتمہ کر دے۔

جتنی عورتیں آئی تھیں وہ سب ہی طنزیہ نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں اور ہر طرف منھ چڑھے ہوئے تھے ہر اک کو اس شادی پر اچنبھا تھا اور بات تھی بھی واقعی ایسی ہی۔

شام کو چار بجے رخصت ہو کر عذرا اسپیشل پر گئی اور نواب سورج گڑھ اسی رات اپنی کمسن دلہن کو لے کر سدھار گئے۔ منور دلہن نے بیٹی کے ساتھ اپنی ساس کی پرانی مغلانی اماں خانم کو کر دیا تھا۔

انجو بی نے عذرا کا کس طرح استقبال کیا یہ تو سورج گڑھ والے جانیں ہاں چھمو کو انھوں نے لکھا۔ "عذرا کے آنے سے میرا دل بہت بہل گیا ہے اور ہم دونوں بہنیں بہت خوش رہتی ہیں"۔

چھمو بھلا کب خاموش رہنے والی تھی، اس نے جواب دیا۔ "اری بنو!

یہ جو تم نے اپنے دل کو دھوکا دیا ہے یہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ خوشی چار دن کی چاندنی ہے کچھ وقت گزر لینے دو پھر حقیقتِ حال تم پر خود روشن ہو جائے گی۔ مثل مشہور ہے کہ سوکن تو چون کی بھی بُری۔"

چھمّو کی پیشن گوئی صحیح نکلی۔ عذرا کی شادی کو تین مہینے بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ انجو بی کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ امامی خانم نے مجھ پر جادو کیا ہے۔

امامی خانم قسمیں کھا کر کہتیں "اے بیگم آپ کو وہم ہو گیا ہے، آپ میری گودی کی کھیلی ہیں۔ میں آپ کی نانی کی نمک خوار میرے لئے تو آپ اور عذرا بی ایک جیسی ہیں۔ اگر میں نے جادو ٹونا کیا ہو تو میرے دیدے گھٹنوں کے آگے آئیں۔"

مگر انجو بی کو یقین کیسے آتا ان کو تو اپنے کمزور دل کے وسوسے بھوت بن کر ڈرا رہے تھے۔ میاں کی چاہت میں جو انھوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا تھا اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ نواب سورج گڑھ ان دنوں بیوی کی بہت للّو پتّو کرتے رہتے تھے بڑے وفادار میاں بنے ہوئے تھے۔ جب انجو بی کا دل مسلسل ایک مہینہ کے علاج معالجہ کے بعد بھی نہ ٹھیرا تو وہ ان کو لے کر تو بمبئی چلے گئے۔ اور عذرا کو اپنے ایک اہلکار کے ساتھ دہلی بھیج دیا اور بڑی بہو صاحب کو لکھ دیا۔ "عذرا کو میں آپ کی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ رنگ محل میں آپ کی نظروں کے سامنے رہے۔ محل سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے" عذرا غریب تو اتنی چھوٹی تھی کہ اس نظر بندی کی حقیقت کو کیا خاک سمجھتی۔ وہ تو اس سے خوش تھی کہ کم از کم سورج گڑھ کی پابند بوجھل فضا سے تو نجات ملی۔ جہاں نہ دن کو آرام میسر تھا نہ رات کو نیند۔ دن بھر انجو بی کی طنزیہ باتوں اور تیز نظروں

کا غریب لڑکی نشانہ بنی رہتی اور رات کو نواب جب تک نہ سو جاتے اس بیچاری کو بھی جاگنا پڑتا۔ کبھی رات کے دو بجے کبھی تین بجے نیند میں سرشار لڑکھڑاتی ہوئی وہ اپنی مسہری پر ایسی بے خبر آکر پڑتی کہ صبح دس بجے بھی بمشکل انجوبی اس کو نصیحت کر کے اور جھنجھوڑ کر اٹھاتی تھیں۔ پھر سارا دن اس کو بیگم بننے کے آداب بتاتی رہتیں، اور عذرا کبھی کبھی تنگ آکر رو پڑتی۔ رنگ محل میں اس کو یہ تو آزادی تھی کہ جا ہے جب تک کھیلتی رہے اور جا ہے جب سو جائے۔ یہاں محبت کرنے والی نظریں تھیں اور ماتا وپیار تھا۔ بڑی بہو صاحب اگر کسی بات کو روکتیں بھی تو بہت اچھے انداز سے، اور پھر یہاں پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد منور دلہن بھی بیٹی سے ملنے کے لئے کرنال سے آگئیں۔ منور مرزا بھی چار دن کی رخصت لے کر آئے۔ بیوی نے سورج گڑھ کے حالات، جو عذرا سے سنے تھے میاں سے کہے۔ اب یہ دونوں پشیمان تھے کہ کیوں خواہ مخواہ اپنی بھولی بیٹی کو اس جنجال میں بھیج دیا۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ منور دلہن بہت سمجھ دار تھیں انھوں نے عذرا کو تاکید کی کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے کو خوش رکھے اور صبر سے ہر مشکل کو برداشت کرے۔

عذرا فطری طور سے بھی کم سخن اور ذہین لڑکی تھی۔ اور قبل از وقت شادی نے اس کی سوجھ بوجھ میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ وہ اب بہت ہی محتاط رہتی تھی اور پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔

بمبئی میں علاج ہوا اور ذرا دھیان بٹا تو انجوبی کی طبیعت بھی سنبھلی، ڈیڑھ مہینہ بعد وہ تندرست ہو کر سورج گڑھ واپس آگئیں۔

عذرا کو بھی نواب نے یہاں پہنچتے ہی بلوا لیا۔ ان دنوں انجوبی کی وجہ سے عذرا کی جانب زیادہ وہ توجہ نہیں کرتے تھے، لیکن انجوبی کا دماغ اب

بالکل بہک گیا تھا، اور وہ کہتی تھیں کہ ماموں جان نے اپنی بیٹی دے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ ممانی جان نے لڑکی کو ایسا سکھایا پڑھایا ہے کہ وہ میری دشمن ہو گئی ہے، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں تو ان کی بیٹی راج کرے۔ مگر یہ نہ ہوگا میں نہ رہوں گی تو عذرا بھی راج نہیں کر سکے گی، میں تو عذرا پر بھی سوکن لاؤں گی تاکہ ماموں جان کو معلوم ہو کہ سوکن کیسی بری چیز ہوتی ہے، ان لوگوں نے میرا دل دکھایا ہے میں ان کا دکھاؤں گی۔ آخر انھوں نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھان لی اور نواب سے کہا۔" عذرا کی شادی ہوئے ایک سال پورا ہو گیا اور ابھی تک خوشی کی شکل بھی مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں تو بچہ ہونے کی آرزو میں عذرا کو بیاہ لائی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک اور شادی آپ کی کر دوں۔ یہ محل اب بھی سونا سونا لگتا ہے۔ نواب بھلا چہیتی بیوی کا حکم کیسے ٹال سکتے تھے پھر انھوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

اور اس گفتگو کے دو مہینے بعد نواب سورج گڑھ کا اسپیشل پھر دلّی کے اسٹیشن پر کھڑا تھا۔

انجو بی کا عتاب منور مرزا کے ساتھ ساری ننہیال پر تھا اس لئے وہ رنگ محل میں نہیں آئیں۔ سیدھی منجھلی چچی کے پاس گئیں۔ ان سے کہا۔ کسی غریب خوبصورت لڑکی سے نواب کا نکاح میں کرنا چاہتی ہوں۔ وہ ان کو لے کر میکے پہنچیں جن کے پاس ہی ایک غریب بیوہ رہتی تھی۔ بے چاری میاں کے مرنے کے بعد سے سلائی سی کر اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی تھی۔ بڑی لڑکی کا نکاح کر دیا تھا ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور تھے۔ لڑکی مسرت جہاں میونسپلٹی اسکول کی چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔ تیرہ سال کی اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ یہ لڑکی انجو بی کو بہت پسند آئی۔ اس کی ماں سے انجم نے کہہ دیا کہ میں اپنے میاں نواب سورج گڑھ کی

شادی تمہاری لڑکی سے اولاد کے لئے کرنا چاہتی ہوں۔

بھلا غریب بیوہ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، وہ تو اس سے خوش تھی کہ خدا نے اس کی غریبی پہ رحم کیا جو یہ رشتہ آ گیا۔ ورنہ میاں کے بعد سے ایک دن بھی سکھ کا نہ گزرا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی وہ شہباز مرزا کے یہاں لڑکی کو لے کر آ گئی اور شام کو چار بجے انجوبی دلہن کے لئے کپڑے زیور لے کر آئیں۔ پانچ بجے نواب صاحب آئے، اور نکاح ہوتے ہی مغرب سے پہلے انجوبی اپنی دوسری سوکن کو لے کر خوشی میاں کے ہمراہ اسپیشل میں واپس آ گئیں۔ اور اس رات اسپیشل سورج گڑھ روانہ ہو گیا۔

(۲۸)

دلبری کا نکاح ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ فیروز مرزا نے ایف۔ اے میں فیل ہونے کے بعد پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تو نواب پھول پور نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ان کو بحری فوجی ٹریننگ کے لئے بمبئی بھیجدیا تھا۔ ابھی کورس کے پورا ہونے میں ایک سال باقی تھا، مگر قیصر دلہن چاہتی تھیں کہ شوقین مزاج نواسی کی شادی جتنی جلد ممکن ہو کر دیں، وہ اس کی جانب سے مطمئن نہیں تھیں۔

دلبری کے نکاح کے بعد ایک سال تو ننّو بی اور قیصر دلہن پھول پور ہی میں مقید رہیں۔ مگر دوسرے سال گرمی شروع ہوتے ہی ننّو بی کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے تو علاج کے لئے قیصر دلہن کو ان کو لے کر دلّی آنا پڑا۔ مگر وہ رنگین طبع دلبری سے ایسی ڈری ہوئی تھیں کہ پھول پور ہاؤس میں نہیں ٹھیریں، رنگ محل میں رہیں۔ ننّو بی کی طبیعت جب ذرا سنبھلی، دلبری نے حسبِ عادت سیر سپاٹے شروع کر دئے، کبھی ضد کر کے سنیما جاتی کبھی زنانہ باغ، مگر اب قیصر دلہن ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھیں، اور نظروں ہی نظروں میں رکھتیں۔ قدم بہت پھونک پھونک کر اٹھاتی تھیں۔ اور ہر دم ان کو اس کا خیال تھا کہ

دلبری کی شادی کے فرض سے جلدی ادا ہو جائیں۔

فیروز کے ٹریننگ میں جاتے ہی انھوں نے شاہرخ مرزا سے کہا۔
"جوان لڑکی کا زیادہ بٹھانا مناسب نہیں۔ ممّو کی طبیعت آئے دن خراب رہتی ہے، میں ان کی دیکھ بھال کروں یا دلبری کا خیال رکھوں۔ منور مرزا کو لکھو کہ دو چار مہینے میں انتظام کر کے اپنی بہو کو رخصت کرا کے لے جائیں۔"

شاہرخ مرزا بھی اس لڑکی کی رنگین طبعی سے ڈرے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی مناسب سمجھا کہ سالی کے مشورے پر عمل کریں۔ ماموں کو رخصتی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے خط لکھ دیا۔ انھوں نے باپ اور بیوی سے مشورہ کر کے دسمبر کے آخری ہفتے کی تاریخ دے دی۔

دلبری کا جہیز تیار ہی تھا۔ قیصر دلہن نے نکاح کے بعد سے ہی اس کی شادی کی باقاعدگی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ منور دلہن نے بھی بیٹے کو بیاہنے کے لئے دل کھول کر تیاری کی۔ پہلے بیٹے کی شادی تھی اور رئیس کی بہن بیاہ کر آ رہی تھی اس لئے شاندار بری بنائی۔

انجو بی بہن کی شادی میں نہ خود آئیں نہ عذرا کو بھائی کے بیاہ میں آنے دیا۔ البتہ اپنی طرف سے دلبری کو ایک قیمتی خوبصورت ساڑھی اور دولھا کی سلامی کے ایک سو پچیس روپے بھیجے۔ عذرا کی جانب سے بھاوج کی رونمائی میں ہیرے زمرد کا لاکٹ بھیجا۔

منور مرزا حسب حیثیت بارات کو کافی سجا کر پھول پور پہنچے۔ نواب اور گرد کی ریاستوں کے راجہ رئیسوں کو لے کر خود پیشوائی کے لئے آئے تھے۔ منور مرزا کسی ریاست کے رئیس تو تھے نہیں، پھر ریاستی جاہ و حشم کہاں سے لاتے۔ اور اس کمی کو شاہرخ مرزا نے بہت محسوس کیا اور وہ جز بز ہو کر بیچ

اپنے دوستوں کے بارات کو اسٹیشن پر ہی چھوڑ کر چل دئے۔ ریاست کے اہلکار بارات کے ساتھ آئے۔

دلبری کی شادی کا انتظام نواب نے اعلیٰ پیمانے پر کیا تھا تاکہ بنو بی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سوتیلی بہن کی پرواہ نہ کی۔ خوب دھوم سے شادی ہوئی، رقص و سرود کی محفلیں تین دن تک ہوتی رہیں۔ بنو بی کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس لئے انھوں نے دل کھول کر جہیز دیا۔ اور منور مرزا بہو کو مع قیمتی ساز و سامان لے کر مسرور و شاداں واپس آئے۔

منجھلے صاحب شدید سردی کے باعث پھول پور نہیں گئے تھے۔ اسٹیشن پر ہی انھوں نے بہت سے عزیزوں کے ساتھ بارات کا استقبال کیا۔ ولیمے کی دعوت اور مردانی محفل کا انتظام ان کی ہی جانب سے تھا۔ دلہن کا منھ دیکھ کر دو اشرفیاں منھ دکھائی میں دیں۔

منور مرزا کی پنشن فیروز کی شادی سے آٹھ مہینے پہلے ہو چکی تھی۔ اور پنشن کے بعد سے وہ منجھلے صاحب کی سبزی منڈی والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ لڑکے کی شادی انھوں نے رنگ محل میں رچائی۔ دلبری کو چار دن کے بعد چھوٹے بھائی شمیم مرزا پھول پور لے گئے فیروز بھی ساتھ گیا۔ ایک ہفتہ رہ کر دولہا دلہن واپس آئے تو منور مرزا کی کوٹھی ہی میں گئے۔ فیروز تو چار دن بعد بمبئی چلا گیا۔ اور دلبری ساس کے پاس رہی۔

منور دلہن بہت سلیقہ شعار تھیں، اس لئے جوں جوں دن گزرتے گئے دلبری کا پھوہڑپن ان کو برا معلوم ہوتا گیا۔ شروع میں تو یہ تھا کہ دلبری اگر پندرہ دن سسرال رہتی تو ایک مہینہ میکے۔ لیکن شادی کے چھ مہینے بعد دلبری کو فیروز نے پھر کوئن میری سکول میں داخل کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی

بیوی میٹرک تو پاس کرے۔ اسکول کی پڑھائی کی وجہ سے دلہن کو دہلی رہنا پڑا، تو ڈھنگ سلیقہ بھی اس کا ساس کو معلوم ہوا، بات بات پہ وہ بہو کو ٹوکتی تھیں، اور وہ سگھڑ بننے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ لیکن اس کو تربیت ہی نہیں دی گئی تھی، کچھ سیکھا ہی نہیں تھا، اس لئے بے چاری بہت مجبور تھی، جہیز کے قیمتی عمدہ جوڑے ایسے پھوہڑپنے سے پہنتی تھی کہ سب مسل وسل کر رہ جاتے۔ زیور آئے دن ٹوٹتا رہتا۔ دو چار چھوٹی موٹی چیزیں تو کھو بھی گئی تھیں، کمرہ ہمیشہ بے ترتیب رہتا۔ منور دلہن صفائی پسند بیوی تھیں۔ دو چار دن میں جب بھی بہو کی طرف آنکلتیں کمرہ ٹھیک کر کے جاتیں۔ بیوی تو اپنے پھوہڑپنے سے ساس نندوں کو پریشان کر رہی تھی اور میاں نے یہ گل کھلایا کہ ایک اینگلو انڈین لڑکی سے نئی نویلی دلہن کے ہوتے ہوئے ایسا تعلق بڑھایا کہ وہ ان سے شادی کرنے پہ تیار ہوگئی، اور ان حضرت نے اپنی وہ قیمتی انگوٹھی بھی جو ساس نے ان کو خلعت کے ساتھ شادی پہ دی تھی۔ ان مس صاحبہ کو محبت کی نشانی دیدی تھی۔ نہ جانے کس طرح اس لڑکی کو معلوم ہوگیا کہ فیروز شادی شدہ ہے اور یہ خبر ملتے ہی وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ ہتکِ عزت کی نالش کرنے کی دھمکی دے کر فیروز کو دھمکی دے کر روپیہ مانگا۔ اب تو ان حضرت کا عشق رفوچکر ہوگیا۔ ماں کو سارا قصہ لکھ کر روپیہ منگوایا۔ انھوں نے بہت پریشان ہو کر میاں سے ذکر کیا۔ نواب پھول پور کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ انھوں نے شاپور مرزا کو بمبئی بھیجا۔ ایک ہزار روپیہ لے کر مس صاحبہ نے بمشکل فیروز کا پیچھا چھوڑا! ٹریننگ سے بھی اس رومان کی بدولت نکالا گیا۔ اور فیروز پشیمان صورت شاپور مرزا کے ہمراہ دلی واپس آ گئے۔

یہاں ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر کے شاپور نے فیروز کو انکم ٹیکس کے

محکمے میں انسپکٹر کی نوکری دلوادی۔

قیصر دلہن کو جب فیروز کی اس جرأتِ رندانہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور جو جو منہ میں آیا اس کو کہا۔ دلبری بھی دسہرے کی تعطیل میں بھول پور گئی ہوئی تھی، وہ بھی روئی دھوئی۔ مگر منور مرزا بہو کو آکر خود لے گئے۔ اس کو بہت پیار و محبت سے سمجھایا۔ بھاوج اور بھتیجی سے بھی بیٹے کی نالائقی کی معذرت چاہی اور یہ قصہ خدا خدا کرکے رفع دفع ہوا۔

فیروز بہت تند خو تھا اور بیوی سے اس کو دلی لگاؤ بالکل نہ تھا۔ اس کی ہر بات پر نکتہ چینی کرتا۔ اول اول تو دلبری ہنس کر ٹالتی رہی لیکن وہ بھی آخر نواب زادی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ اس نے بھی میاں سے دوبدو شروع کر دی۔ روز ہی ان دونوں کی جھڑپ ہو جاتی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ منور دلہن کے سامنے جب بھی ان دونوں کا جھگڑا ہوتا تو وہ ہمیشہ بیٹے کو ہی برا بھلا کہتیں، بہو کی طرفداری کرتیں۔ مگر نتیجہ روز بروز کی بدمزگی کا یہ ہوا کہ شادی کے ایک سال بعد ہی دلبری میاں سے بیزار ہو گئی۔

قیصر دلہن نے حسبِ عادت اس باہمی رنجش کا ذمہ دار دیورانی کو ٹھہرایا۔ منور دلہن اس خواہ مخواہ کے الزام سے جھلا گئیں۔ اور انھوں نے بہو کی پرواہ کرنی بالکل چھوڑ دی اور اب باقاعدہ منور دلہن اور قیصر دلہن کی جنگ چھڑ گئی۔ اپنی اپنی جگہ دونوں ایک دوسری پر خوب پھبتیاں کہتیں اور فقرے کستی تھیں۔ منور مرزا نہ چاہتے تھے کہ یہ رنجش بڑھے۔ اس لئے کچھ مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا کہ جب بھی دلبری میاں سے روٹھ کر میکے جاتی، منور مرزا اس کو بلانے کے لئے خط بھیجتے۔ مناتے۔ پھر بھی وہ نہ آتی تو خود جا کر لاتے۔ بھاوج کی کڑوی کسیلی باتیں ہنس ہنس کر سہتے۔ مگر یہ اوپری لیپا پوتی کب تک چلتی، جب ان

دونوں کے دل ہی نہیں ملتے تھے۔ آخر یہ رنجش دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ اور دوسرا سال ختم ہونے سے پہلے دلبری میکے جا بیٹھی۔ اور اس نے صاف کہہ دیا کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر میں اس گھر میں نہ جاؤں گی، جہاں نہ میاں میری وقعت کرتے ہیں نہ ساس کو میرا خیال ہے۔ قیصر دلہن نواسی سے زیادہ برافروختہ تھیں۔ ہر وقت فیروز کے فضیحتے کرتی رہتیں، اور دیورانی کو صلواتیں سناتی رہتیں۔ جب تین مہینے تک دلبری نہ آئی، تو منور مرزا خود لینے گئے۔ مگر قیصر دلہن پر تو غصے کا بھوت سوار ہو چکا تھا دلبری تو چاہنے والے خسر کو دیکھ کر پگھلی بھی اور اس نے جانا چاہا۔ مگر انھوں نے صاف کہدیا "میاں معاملہ تمہارے بس کا نہیں، تمہارا بیٹا بہت بدمزاج اور ناقدرا ہے اور تمہاری بیوی بس کی گانٹھ ہیں۔ اگر اب میں نے لڑکی کو بھیجا تو یہ زندہ نہ رہے گی۔ آئی تھی تو دیکھے سے ڈر لگتا تھا۔ یہ رو رو کر جان دیدیگی اور وہاں کسی کی تیوری پر بل بھی نہ آئے گا۔"

منور مرزا دو دن تک بھاوج کی خوشامد کرتے رہے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں، آخر ہار کر واپس چلے گئے، اور بیٹے پر بہت ناراض ہوئے۔

قیصر دلہن کو جب غصہ آتا تھا تو برے بھلے کی تمیز بھی نہیں رہتی تھی۔ ان کا جلال اب پورے عروج پر تھا۔ اس لئے رات دن ان کی یہی رٹ تھی میں تو اپنی بچی کو طلاق دلواؤں گی۔ منور دلہن نے لئے سمجھا کیا ہے، جو اتنا برا برتاؤ کیا۔ آخر انھوں نے شاہرخ مرزا سے کہہ ہی دیا۔ "میاں دلبری کا تو تم فیصلہ کرا دو۔ فیروز سے اس کا نباہ نہ ہوگا، کہیں اور میں اس کا کروں گی شادی کے بعد ایک دن بھی تو چین مجھے اور بہو کو نصیب نہیں ہوا۔ فیروز بدمزاج اور بدچلن ہے، اور منور دلہن بہو کا بالکل خیال نہیں کرتیں۔ بھلا

منور مرزا کے کئے کیا ہو سکتا ہے۔"

شاہرخ مرزا پہلے تو کچھ دن ٹالتے رہے مگر جب وہ برابر یہی کہے گئیں، تو انھوں نے ماموں کو لکھا۔ "کیونکہ یہ رشتہ میری مرضی سے ہوا تھا۔ اب لڑکی خوش ہے نہ اس کی ماں اور نانی۔ ان حالات میں بہتر یہ ہے کہ علیحدگی ہو جائے جہاں دلبری خوش رہ سکے گی وہاں اس کا دوسرا رشتہ کیا جائے گا۔"

منور مرزا کو یہ خط پاکر ملال تو بہت ہوا بیٹے پر بھی بگڑے اور بیوی سے بھی ان کی لڑائی ہوئی۔ مگر ان حالات میں کہ معاملہ اتنا طول پکڑ گیا تھا کیا کیا جاتا آخر انھوں نے مجبور ہو کر فیروز سے کہا۔ "کہ طلاق دلبری کو دیدے۔

فیروز تو جیسے اس کا منتظر ہی تھا اس کو یہ معمولی شکل کی احمق سی لڑکی جس کی سیرت میں بھی کوئی دلکشی نہ تھی کبھی بھلی اچھی نہ لگی۔ اس کی شادی اتنی کمسنی میں کر دی گئی تھی کہ جب اس کو برے بھلے کی تمیز نہ تھی۔ اس نے طلاق نامہ بھیج دیا۔ دلبری پھر آزاد ہو گئی۔

قیصر دلہن شادی کے بعد سے اس کی پچھلی حرکات بھلا چکی تھیں۔ اب تو بقول ان کے، ساس اور میاں کے ظلم اٹھا کر اس کی جان آدھی رہ گئی تھی اس لئے اس کا دل بہلانے کو وہ جو چاہتی اس کو کرنے دیتیں۔ یہ اتفاق تھا یا خوبیٔ قسمت کہ دلبری کے طلاق سے دو مہینے بعد قیصر دلہن کے ایک رشتے کے بھائی نوشہ مرزا جن کی مرحومہ بیوی بڑے نواب صاحب کی بھانجی تھیں، پھول پور نواب صاحب کی مزاج پرسی کے لئے آئے تو یہیں جم گئے۔ حالانکہ نواب صاحب کو تو نواب شاہرخ مرزا مہینہ بھر سے دلّی لے کر چلے گئے تھے۔ مگر نوشہ مرزا پھول پور سے ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ان کی رنگین مزاجی کی بدولت خاندان بھر میں ان کا نام روشن تھا اور سبھی ان کی رنگ رلیوں سے واقف تھے۔ پچپن برس کی عمر میں بھی ان کے

دم خم جوانوں کے سے تھے۔ باتیں بنانے چٹکلے اور لطیفے بیان کرنے میں نخ شہزادا کو ملکہ حاصل تھا۔ پہلے تو انھوں نے انجو بی پر نظرِ عنایت کی جو اُن دنوں بہت عرصے کے بعد میکے آئی تھیں۔ وہ کیا آئی تھیں، نواب سورج گڑھ نے بھجوا دیا تھا۔ ان کی تیسری بیگم مسرت جہاں ممتاز محل کے یہاں ولادت ہونے والی تھی۔ مسرت کی ماں نے نواب سورج گڑھ سے کہا، کہ "سوکنوں کا ساتھ اس زمانے میں ٹھیک نہیں کہیں کوئی جلن کے مارے میری بیٹی کو زہر نہ دیدے" اور نواب نے ان دونوں بیگموں کو ان کے میکے بچہ ہونے تک بھیج دیا۔ خوش نصیب مسرت کا شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی پاؤں بھاری ہو گیا تھا۔ نواب سورج گڑھ جتنا بھی اس بیوی کا ناز اٹھاتے بجا تھا جو اِن کو ریاست کا وارث دے رہی تھی۔ حالانکہ منصور علی خاں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بمبئی کے تمام ڈاکٹر متفقہ طور پر کہہ چکے ہیں کہ سرکار کے یہاں اولاد ہونی ممکن نہیں۔ بہرحال اب تو نواب کے محل میں یہ بچہ ہونے والا تھا اور یقیناً وہی اس کے حقدار تھے۔ خیر تو انجو بی تو کیا ان بزرگوار کو خاطر میں لاتیں بڑی خوددار اور سنجیدہ تھیں۔ انھوں نے نہ تو ان کی لچھے دار تقریر پہ کان دھرا نہ ان کی ہمدردی کی پرواہ کی جو وہ جا و بے جا کرتے رہتے تھے۔ اور مرزا صاحب ان کی جانب سے مایوس ہو کر دلبری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دلبری سدا کی بیوقوف اور رومان پسند تھی۔ کچھ دنوں بعد ہی یہ حال ہو گیا کہ وہ ماموں جان کے ساتھ سایے کی طرح لگی رہتی۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا تو ماموں جان دباتے۔ شام کو اکثر ان کے ساتھ ہی نہر پہ ٹہلنے چلی جاتی۔ کھانا چائے سب ماموں جان کے ساتھ ہوتا، رات کے بارہ بجے تک تاش، چوسر، کیرم کی بازی جمی رہتی۔ انجو بی اور قیصر دلہن سو بھی جاتیں یہ دونوں تنہا بیٹھے کھیلتے رہتے۔ دلبری کے اس طرز پہ قبیلے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ مگر قیصر دلہن کے منہ پر کون رکھتا۔ انجو بی

نے ہی ایک دو مرتبہ رات گئے تک کھیلنے سے بیٹی کو منع کیا تو وہ جلدی سے بولیں: "لے رہنے بھی دو، کھیل میں اس کا دل بہلا رہتا ہے۔ شادی اور طلاق کے جھگڑے میں کافی ہلکان ہوئی ہے۔"

نواب شاہرخ بمع بیوی کے دادا کے پاس دہلی میں تھے، بڑے نواب صاحب کا علاج جوں جوں ہو رہا تھا اتنا ہی مرض بڑھتا جاتا تھا وہ بالکل پلنگ سے لگ گئے تھے، عمر بھی اب ان کی اسّی برس سے تجاوز کر چکی تھی۔

سورج گڑھ سے رات کے تین بجے تار پر لڑکا ہونے کی اطلاع آئی انجو تار پاکر اتنی خوش ہوئیں کہ انھوں نے اندھیرے منھ ہی سب کو اٹھا بٹھایا خوشی کے مارے وہ پھولی نہ سماتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لڑکا ان کے یہاں ہی ہوا ہے۔ چائے ناشتے سے فارغ ہو کر بہت بھاری جوڑا پہن کر سُرخ دوشالہ اوڑھ وہ زچہ رانی بن بیٹھیں۔ ڈومنیاں زچہ گیریاں گانے لگیں اور ان کے حکم سے قلعے پر بھی نوبت رکھ دی گئی۔ تمام رشتہ دار خواتین اور اہلکاروں کی بیویاں دن بھر انجو بی کو مبارکباد دینے آتی رہیں۔ قیصر جہاں، جو بی بھی شام تک یہیں رہیں پھر رات گئے یہ جلسہ ختم ہوا۔ انجو بی ابھی اپنا بھاری لباس اتار ہی رہی تھیں کہ تار ملا "لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" انجو بی کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے۔ انھوں نے اپنے اے ڈی سی کو بلوا کر تعزیت کا لمبا چوڑا تار نواب سورج گڑھ کو دینے کی ہدایت کی اور کہا سرکار اس حادثے سے بہت رنجیدہ ہوں گے، مجھے اب سورج گڑھ بہت جلدی پہنچ جانا چاہیے۔ تم پرسوں شام کی ٹرین سے میرے دلّی جانے کا بندوبست کر دو۔ میں داداجان کو دیکھنے کے لئے ایک دن وہاں ٹھیر دوں گی، وہیں سے سرکار کو اپنے پہنچنے کی اطلاع بھیج دوں گی۔

انجوبی دلی پہنچیں تو بڑے نواب صاحب پر عالم نزع طاری ہوچکا تھا۔ ادھر سورج غروب ہوا اُدھر نواب صاحب کی زندگی کا سورج ڈھل گیا۔ مغل حکومت کی شان و شوکت کو یاد دلانے والا یہ ایچ ایچ درباری مدبّر اور شائستہ انسان ختم ہوگیا۔

نواب پھول پور نے دادا کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی تھی، باپ سے تو ان کا تعلق برائے نام رہا تھا اس لئے وہ کافی رنجیدہ تھے۔

ان کے دونوں چچا شہباز مرزا اور کامران مرزا تو مہینہ بھر سے یہیں تھے، ایک ہفتے سے تینوں پھوپھیاں بھی آگئی تھیں۔ بڑے نواب صاحب کے دونوں محل بھی یہیں تھے۔ غرض کہ پھول پور ہاؤس اور اس کے قریب کی ایک اور کوٹھی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔

نواب صاحب کی وصیت تھی کہ ان کو پھول پور میں دفن کیا جائے۔ اس لئے صبح چار بجے نواب صاحب کی لاش لاری پہ رکھ کر دونوں بیٹے اور ان کے دونوں مصاحب ساتھ بیٹھے۔ نواب پھول پور مع بیگمات کے ایک گھنٹہ پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔ باقی اور رشتہ دار اور اہلِ محل رات کو بارہ بجے والی ٹرین سے ہی چلے گئے تھے۔

پھول پور میں انجوبی کے جانے کے بعد سے کافی سناٹا ہوگیا تھا۔ شاپور مرزا دیوان صاحب اور تمام اہلکار بڑے نواب صاحب کی علالت کی وجہ سے اکثر دہلی رہتے، قلعے میں ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ بنوبی اور قیصر دلہن کے علاوہ بیگموں میں سے کوئی بھی ان دنوں پھول پور نہیں تھیں۔ دلبری کو حسبِ معمول کھانے کے بعد قیصر دلہن پوسر نوشہ مرزا کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر سونے گئی تھیں۔ بنوبی اس دن شام سے ہی بستر پہ دراز ہوگئی تھیں بڑے نواب صاحب

کی حالت نازک ہونے کی اطلاع صبح ہی پھول پور پہنچ چکی تھی۔ اس لئے نبو بی کو اپنے میاں کا مرنا یاد آ رہا تھا اور ان کے دل کے زخم سب ہرے ہو گئے تھے۔

صبح چار بجے قیصر دلہن کو جگا کر بڑے نواب صاحب کے انتقال کی خبر شمیم نے سنائی اور کہا کہ دوپہر کو بارہ بجے تک جنازہ پھول پور پہنچ جائیگا۔ آپ خواتین سے کہدیں کہ نواب صاحب کے محل میں گیارہ بجے سب جمع ہو جائیں۔

اس المناک خبر کو سننے کے بعد سوتا کون۔ دن نکلے دلبری کی انّا نے آکر کہا کہ بیگم کا پلنگ خالی ہے۔ میں ان کو سارے میں ڈھونڈ آئی، نہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ قیصر دلہن جھلا کر بولیں "اے عورت ہوش کی دوا کر، جائیں گی کہاں؟ شاید چوکی پر ہوں گی۔"

انّا بولی۔ "بیوی، میں کیا ایسی دیوانی ہوں کہ بغیر دیکھے بھالے آپ سے کہہ دیتی۔ میں نے تو غسل خانہ، پا خانہ، گھر کا کونا کونا دو مرتبہ دیکھ ڈالا۔ وہ کہیں نہیں ہیں۔"

اب تو قیصر دلہن گھبرا کر اٹھیں، ہر طرف دلبری کو آوازیں دیں اور ڈھونڈا وہ ہوتی تو ملتی۔ اس کا اٹیچی کیس بھی غائب تھا۔ شمیم سے قیصر دلہن نے کہا۔ "دیکھو میاں وہ ناشدنی کہاں غارت ہو گئی۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ رات کو جب میں لیٹی تو وہ مرزا نوشہ کے ساتھ چوسر کھیل رہی تھی۔"

شمیم نے باہر آکر مرزا نوشہ کو دیکھا تو وہ تھے نہ ان کا سامان، نہ نوکر پہرے کے سپاہیوں سے پوچھا تو انھوں نے کہا۔ "رات کے دو بجے مرزا صاحب مع ایک برقعہ پوش خاتون اور اپنے ملازم کے باہر نکلے اور انھوں نے کہا۔ "بڑے نواب صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، ان کے دیکھنے کے

لئے ہیں اور آپا جان جا رہے ہیں۔"

شمیم نے قیصر دلہن سے آ کر کہہ دیا کہ "دلبری کو آپ کے بھائی صاحب لے کر رفوچکر ہو گئے۔"

اس منحوس خبر کو سن کر قیصر دلہن چاہتی تھیں کہ زمین پھٹے اور وہ سما جائیں۔

بدنصیبی قسمت خدا کسی کی نہ کرے۔ کمسنی میں پانچ بچوں کے باپ سے بیاہی گئی، شادی کے بعد اس کی صحت اتنی بگڑ گئی کہ ازدواجی زندگی کا سکھ اس کو کبھی بھی نصیب نہیں ہوا۔ بھری جوانی میں شوق سنگھار کے زمانے میں بیوہ ہو گئی۔ لڑکے ایک نہیں تین ہوئے، مگر چند مہینوں بعد ہی گود خالی کر گئے اس کی شادی کا ماحصل اور زندگی بھر کی دولت یہ نالائق لڑکی تھی۔ جب تک چھوٹی رہی بیمار رہی، ہوش سنبھالا تو اپنی بیہودہ حرکتوں سے سدا ماں کو پریشان رکھا۔ اس کی شادی کے بعد ذرا اطمینان نصیب ہوا تھا۔ مگر وہاں بھی دلبری کی نہ بنی، آخر نوبت طلاق پہ پہنچی اور اب اس ڈھیٹ لڑکی نے یہ گل کھلایا۔

بنّو بی کی طبیعت رات سے ہی خراب تھی، بیٹی کے فرار ہونے کی خبر سن کر کچھ دیر تو سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہیں، پھر فرط غم سے بیہوش ہو گئیں۔ قیصر دلہن نے جلدی سے بڑھ کر بدنصیب بنو کو سنبھالا اور پلنگ پہ لٹایا۔ بنو بی کے سفید چہرے پر اس وقت موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں برف کی مانند ٹھنڈے تھے۔ شمیم بھی ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ حکیم صاحب کو بلوایا، انھوں نے سنگھانے کو نسخہ دیا اور عرق بید مشک منھ میں ڈالنے کی ہدایت کی۔ شمیم نے منھ کھول کر بمشکل عرق بید مشک پلایا۔ قیصر دلہن نے ہاتھ پاؤں سہلائے، پانی کے چھینٹے دئے تو بنو بی کو ہوش آیا۔ لیکن اوسان ان کے اب بھی پورے درست نہیں تھے۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تکے جا رہی تھی اور ان کے ہونٹوں سے

دھیمی کراہ کی آواز نکل رہی تھی ۔

قیصر دلہن ناشاد بیٹی کے پاس بیٹھی اس کی پھوٹی قسمت پر آنسو بہا رہی تھیں ۔ اسی طرح دن کے دس بج گئے اور وہ گھبرا کر اٹھیں ۔ منجھلی اور دلبری کی انّا کو بنو بی کے پاس بٹھا کر نواب کے محل میں فرش درست کرایا اور ماتمی صف پہ بیٹھ گئیں ۔

پھولپور کے آج کسی گھر میں کھانا نہیں پکا تھا، ہر چھوٹا بڑا اپنے فیاض طبیعت مرنجان مرنج نواب کے غم میں تھا ۔ عورت، مرد، جوان، بوڑھے سب رو رہے تھے، عورتیں محل میں جمع ہو رہی تھیں اور مرد آخری سلام کے لئے قلعے کے سامنے کے میدان میں صبح سے ہی اکٹھے ہو گئے تھے ۔ دوپہر کے بارہ بجے بیگمات کی کاریں پہنچ گئیں ۔ اور ان کے اترتے ہی محل میں کہرام مچ گیا ۔ شور و بکا سے در و دیوار گونج اٹھے ۔ اور سب بیویاں تو خیر رو ہی رہی تھیں ۔ لیکن نواب مرحوم کی منجھلی صاحبزادی کے بین اور رونا تو قیامت کا تھا ۔ انھوں نے اپنے کو پیٹ پیٹ کر نیلا کر لیا تھا اور پورا محل چیخیں مار مار کر سر پہ اٹھا رکھا تھا ۔ نواب شاہ رخ مرزا مع بھائیوں کے قلعے کے میدان میں کھڑے تھے، ان کے پہنچنے کے آدھے گھنٹے کے بعد جنازے کی لاری بھی پہنچ گئی ۔ ماتمی بگل بجنے لگا اور فوج اپنے مرحوم نواب کو آخری سلامی پیش کرنے کے لئے تیار ہو گئی ۔ جنازے کا پلنگ لاری سے اتار کر نواب شاہ رخ شاہپور مرزا، شہباز مرزا اور کامران مرزا نے اپنے کاندھوں پہ لیا اور ریاستی قبرستان کی طرف چلے ۔ دو طرفہ فوج بندوقیں الٹی کئے بھاری قدموں سے نواب کو آخری منزل پر پہنچانے جا رہی تھی ۔ مغموم لوگوں کے لبوں پر کلمۂ طیبہ جاری تھا، اور بینڈ کی ماتمی دھن نے تمام فضا کو غم آلود بنا دیا تھا ۔ آخر

چاہنے والے بڑے نواب صاحب کو سپردِ خاک کرکے واپس آ گئے

غم سے نڈھال، تکان سے چور، پریشاں حال محل میں ہو کر نواب شاہرخ جب اپنی خوابگاہ میں جا کر لیٹے تو شمیم نے دلبری کے فرار ہونے کی افسوسناک خبر دبے لہجے میں ان کو سُنائی، سر پکڑ کر رہ گئے۔ کیا کہتے اور کیا کرتے ــــ "ہوں" کرنے کا موقع نہ تھا۔ بڑے نواب صاحب کی تعزیت کے لئے اپنے پرائے سبھی جمع تھے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ پھولپور کے وقار اور خاندان کے نام پر دلبری کی حماقت، کی بدولت دھبہ لگ چکا تھا۔

بنو بی کی حالت ان چند گھنٹوں میں مرنے سے بدتر ہو گئی تھی، ان کو برابر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ قیصر دلہن کے دل کا عجب عالم تھا کبھی نواسی کو کوستی تھیں کبھی بیٹی کی زندگی کی دعائیں مانگتیں۔ ان کو یہ دھڑکا تھا کہ کہیں غیرت مند بنو بی دلبری کی بے حیائی کی بدولت شرم کے مارے اپنی جان نہ دے دیں۔ اور واقعی بے وقوف دلبری نے ماں اور نانی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔ اس بیہودہ لڑکی کو نہ مرتے ہوئے باپ کی عزت کا خیال رہا تھا نہ بھائی کا ڈر۔ حیرت تو یہ تھی کہ دلبری جس نے اپنی عمر کی ابھی بیسویں منزل بھی پوری نہیں کی تھی ایک پچپن سالہ بزرگ کے ساتھ جو رشتے کے لحاظ سے اس کا نانا تھا بھاگ گئی۔ ایسا ہوتا نہ کہیں دیکھا نہ سُنا۔ نہ کسی کہانی میں پڑھا۔ نہ پردۂ فلم پر نظر آیا۔ جو سنتا حیرت اور افسوس کے ملے جُلے جذبے سے انگلی دانتوں میں دبا لیتا۔

(۲۹)

شہلا سے شاہرخ مرزا کی شادی ہونے کے بعد ایک سال تک تو سب یہ سمجھتے رہے کہ اب وہ ہر طرح مطمئن اور خوش ہیں۔ لیکن شاہرخ مرزا اپنی متلون طبیعت سے مجبور تھے۔ شہلا ہزار سنجیدہ اور متین سہی مگر آخر کمسن لڑکی تھی، اول اول نواب نے اتنا خیال کیا کہ بعض اوقات جہیتی بیوی کی جوتی بھی خود پہنانے لگے۔ کمسن شہلا سمجھی میاں مجھ پر فریفتہ ہیں اور ناز کرنے لگی۔ ویسے بھی وہ ان کی چچازاد، ناز و نعم میں پلی اور باپ کی بہت لاڈلی تھی، نہ وہ میاں سے حسن بانو کی طرح ڈرتی تھی نہ سلطان دلہن کی طرح ان کا لحاظ کرتی تھی۔ بات بات پر ان سے دو بدو کرتی اور جو وہ چاہتی وہی نواب کو کرنا پڑتا۔ بڑی پھوپی چھ مہینے بھتیجی کے پاس رہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ نواب شاہرخ نے پہلے تو کچھ مہینے کمسن بیوی کا دل ہاتھ میں لینے کے لئے اس کے چاؤ چونچلے کئے پھر جب شہلا کا پاؤں بھاری ہوا تو ان کو اس کا خیال اور زیادہ ہوگیا ان دنوں اس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جاتا تھا اور طبیعت ہر وقت نڈھال سی رہتی تھی، اس لئے وہ کافی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ شاہرخ مرزا اپنی عادت کے خلاف ہر وقت بیوی کی ناز برداری میں لگے رہتے۔ کبھی دلّی سے

اس کے لیئے تازہ پھل منگواتے اور کبھی نئی وضع کی فیشن ایبل ساڑھیاں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں شہلا کی دلجوئی ایک عاشق زار شوہر کی طرح کی مگر آخرہ شہلا ضد کر کے چھٹا مہینہ لگتے ہی میکے چلی گئی۔ نواب نے بھی یہ سوچا کہ اس زمانے میں اس کو اپنی ماں کی قربت کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن یہ تاکید کر دی کہ ایک سے مہینے بعد ہی گھر واپس آجانا۔ شہلا نے یہاں تو میاں کو کچھ جواب نہ دیا لیکن جب وہاں میاں نے ڈیڑھ مہینے بعد اس کو لکھا کہ "میں تم کو لینے کے لئے آئندہ ہفتے آرہا ہوں" تو اس نے جواب دیا "میں ابا جان کے ہمراہ پرسوں شملہ جا رہی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم کو اس زمانے میں گرمی میں بھوپال میں نہیں رہنا چاہیئے؟ آپ بھی شملہ ہی آجائیں۔"

شاہرخ مرزا نے چچا کو شملے پہنچنے کے بعد لکھا "شہلا تو ابھی نا سمجھ بچی ہیں میرا کہنا بالکل نہیں سنتیں۔ ابھی تو خیر گرمی ہے اچھا ہے یہ خراب موسم گزر جائے۔ لیکن اگست کے شروع میں آپ چچی جان کے ہمراہ ان کو یہاں بھوپال بھیج دیجئے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا بچہ بھوپال سے باہر ہو۔"

کامران مرزا نے بھتیجے کو لکھا "شہلا ابھی کمسن ہے اور پہلی دفعہ کی بات ہے اس لئے میں اس کے یہاں ولادت شملے میں ہونی بہتر سمجھتا ہوں کیا بھوپال میں زچگی کا سامان اتنے اچھے پیمانے پر ہونا ممکن نہیں۔ جب وہ خیر سے چلہ نہا کر پھول ہو جائے گی تم چاہے جتنی خوشی کر لینا۔ فی الحال تو مجھے اس کی جان سے بہت فکر ہے۔ خدا بخیر اس مرحلے کو آسان کرے تمہاری چچی کی صحت آئے دن خراب رہتی ہے۔ اس حالت میں اور گرمی کے موسم میں اتنے لمبے سفر کے قابل وہ بالکل نہیں، تم ہی شملہ آجاؤ۔"

چچا کا یہ خط پا کر نواب شاہرخ کو غصہ آگیا۔ انھوں نے چچا کو تو لکھا۔

"آپ کو اختیار ہے شہلا کو جاہے جب تک رکھیں میں اب نہیں بلاؤں گا۔ اس صورتِ حالات کے ذمہ دار آپ خود ہیں"۔ اور بیوی کو خط بھیجا "تمہارے باپ خواہ مخواہ مجھ سے الجھ رہے ہیں، میری توہین یہ کہہ کر انھوں نے کی ہے کہ تمہارے آرام کا بندوبست اور زچگی کا سامان میں پھول پور میں خاطر خواہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم کو مجھ سے واقعی محبت ہے تو مجھے لکھ دو میں کچھ دن بعد آجاؤں گا اور تم کو اپنے ہمراہ لے آؤں گا۔

شہلا میاں کی خفگی کا خط پا کر کافی پریشان ہوگئی۔ بیچاری چھوٹی سی لڑکی کوئی فیصلہ نہ کر سکی، باپ سے اس کو بہت محبت تھی اور ان کا لحاظ بھی تھا، بھلا وہ بے شرمی کیسے کر سکتی تھی کہ باپ سے کہتی کہ "مجھے پھول پور بھیج دو۔"

کئی دن سوچتے رہنے کے بعد اس نے میاں کو لکھا "ابا جان کے حکم کی تعمیل نہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ویسے مجھے آپ کی خوشی کا بھی خیال ہے۔ میرے ابا جان آپ کے چچا بھی تو ہیں اور آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ آپ کو لکھتے ہیں چاہنے والے چچا کی حیثیت سے ہی لکھتے ہیں۔ پھول پور کے وقار کا خیال ان کو بھی آپ سے کم نہیں ہے مگر میری یہ حالت دیکھ کر وہ سفر کے قابل مجھ کو نہیں سمجھتے، آپ اپنے چاہنے والے چچا کا خیال کر کے اور میری محبت کی خاطر اس وقت مجھے پھول پور آنے کے لئے مجبور نہ کیجئے، البتہ آپ سے میری خواہش نہیں بلکہ التجا ہے کہ یہاں اس موقع پر آپ موجود ہوں۔"

شہلا کے اس محبت بھرے خط کا جواب نواب شاہرخ نے نہیں دیا۔ اور کہا کہ "شہلا کو اپنے باپ پر بہت گھمنڈ ہے، اور چچا جان تو اپنے کو نہ جانے

کیا سمجھتے ہیں۔ میں شہلا کو کبھی بھی نہیں بلاؤں گا۔ دوسرا محل کرلوں گا۔"

کامران مرزا کے جاسوس بھی پھول پور میں رہتے تھے، انھوں نے ان کو یہ خبر پہنچائی تو وہ تیوری پہ بل ڈال کر بولے۔ "میرا بھتیجا تو نیم پاگل ہے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ خدا شہلا کو بیٹا دے پھر میں اس بے وقوف کو ریاست سے ہٹا دوں گا۔"

شاہرخ مرزا کے مخبر نے یہ خبر ان کے کانوں تک نمک مرچ لگا کر پہنچا دی۔ ابھی تک وہ صرف چچا سے برہم تھے۔ اس خبر نے ان کو آگ بگولا کر دیا۔ معصوم بیوی اور ہونے والے بچے سے بھی ان کو نفرت ہو گئی، اور انھوں نے لال پیلے ہو کر کہا۔ "خدا ان کا چاہا نہ کرے، شہلا کے یہاں لڑکی ہو جائے، تو پھر میں ان کو اس کا جواب دوں گا۔"

غرضیکہ چچا بھتیجے کی باقاعدہ جنگ ٹھن گئی، اور باپ اور میاں کی لڑائی میں بے چاری شہلا گھن کی طرح پس گئی۔ آخر خدا خدا کر کے دن پورے ہوئے اور شادی کے ڈیڑھ سال بعد کمسن شہلا ایک بچی کی ماں بن گئی۔ لڑکی ہونے کی اطلاع پا کر کامران مرزا کے تو سارے منصوبے خاک میں مل گئے، اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھول پور جب یہ خبر پہنچی تو شاہرخ مرزا جو دن رات اس فکر میں گھلتے رہتے تھے کہ کہیں لڑکا نہ ہو جائے خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ قدرت نے ان کی دعا سن لی تھی۔ ورنہ کامران مرزا جو گورنمنٹ پنجاب کے بہت بڑے افسر اور گورنر پنجاب کے دوست تھے خدا جانے غصے میں کیا کر بیٹھتے۔ نواب شاہرخ نے خوش ہو کر بیوی اور بچی کی خیریت معلوم کرنے کا بہت طول طویل تار دیا اور زچہ خانے کے خرچ کے لئے دو ہزار روپیہ اپنے اے ڈی سی کے ہاتھ چچا کو بھجوا دیا۔ انھوں نے یہ کہہ

روپیہ واپس کر دیا "ابھی میرے پاس اتنا ہے کہ میں اپنی بیٹی کا خرچ خود اٹھا سکوں"
نواب شاہرخ بھی مطمئن ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ نہ چچا کو کچھ لکھا نہ بیوی کو بلایا۔
شہلا الھڑ تھی مگر میاں کو دل سے چاہتی تھی اور نواب سے مصالحت کرنے کے لئے وہ بے چین رہتی، لیکن یہ شرمیلی لڑکی باپ سے میاں کے پاس بھیجنے کا تقاضا کیسے کرتی۔ البتہ میاں کو دو خط اس نے بھیجے "آپ مجھے ہر وقت یاد آتے ہیں بچی بالکل آپ پر ہے"، لیکن ان خطوں کا جواب نہ پا کر وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔

یوں ہی بچی تین مہینے کی ہو گئی۔ بڑے نواب صاحب نے ابھی تک بیٹے اور پوتے کی لڑائی کا تماشا خاموشی سے دیکھا تھا اور دونوں کی بات میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر اب صورتِ حالات تشویشناک ہو گئی تھی۔ اس لئے بیٹے کے پاس خود گئے اور کہا۔ "شاہرخ تو نادان لڑکا ہے مگر تم اس عمر میں سمجھ دار ہو کر حماقت کر رہے ہو۔ بیاہی بیٹی کو بلا کر خواہ مخواہ گھر بٹھا لیا اور داماد سے بلاوجہ لڑائی باندھ لی۔ اس طرح لڑکی کا گھر بگڑ جائے گا تم کو اب درگزر کرنا لازم ہے۔"

کامران مرزا خود دار تھے خود سر اور بے ادب نہ تھے جو باپ کی بات کا جواب دیتے، سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ بڑے نواب صاحب پوتی کو ساتھ لے کر پھول پور واپس آئے اور پوتے کو بھی سمجھایا کہ "کامران مرزا نے بے شک برا کیا کہ تمہارا کہنا نہ مانا۔ لیکن وہ صرف تمہارے خسر نہیں چچا بھی ہیں۔ بیٹے اور بھتیجے میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ چچا کی بات کا اتنا برا ماننا تم کو نہیں چاہیئے شہلا ہمیشہ سے باپ کی چہیتی ہے۔ اس کی محبت میں انھوں نے تم سے لڑائی مول لی۔ اب تمہاری بیوی آ گئی ہے اس سے ہنسو بولو۔"

شاہرخ مرزا نے دادا کے سامنے تو کچھ نہ کہا، مگر اپنے دل میں بات رکھی۔

بیوی سے ہنستے بھی باتیں بھی کرتے، کھانا بھی دونوں وقت کا حسب معمول بیوی کے ساتھ کھاتے، مگر رات کو سوتے باہر تھے۔ شہلا چھ مہینے پھولپور رہ کر پھر گرمی میں شملے باپ کے پاس چلی گئی۔ جانے سے ایک ہفتہ قبل اس نے میاں سے جانے کی اجازت مانگی تو انھوں نے کہہ دیا کہ "تم اپنی مرضی کی آپ مختار ہو، چاہے جب آؤ، چاہے جب جاؤ، میرا کہنا تم کب مانتی ہو، جیسے تم کہو گی تمہارے جانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔"

بھاوج کو شاپور مرزا شملے چھوڑ آئے، وہاں گئے اس کو دو مہینے ہوئے تھے کہ بڈھے نواب صاحب سخت علیل ہو کر دلی آ گئے اور وہ بھی باپ کے ہمراہ دادا کے پاس آ گئی، پھر ان کے انتقال کے بعد پھولپور سب بیگمات کے ساتھ پہنچی۔

شہلا کے لئے بڈھے نواب صاحب کا دم غنیمت تھا۔ ان کی زندگی میں خاندان میں کس کی ہمت تھی کہ شہلا پر اپنی بیٹی دے دیتا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی شاہرخ مرزا کو نکاح ثانی کا فکر ہو گیا۔ رشتہ داروں اور جاننے والوں میں جہاں کہیں بھی انھوں نے خیال کیا ٹکا سا جواب مل گیا۔ سگے چچا کی بیٹی اور پھر اولاد والی۔ کون برابر والا لڑکی دیتا۔ آخر انھوں نے تھک کر قیصر دلہن سے کہا: کہ کسی غریب شریف لڑکی سے آپ میرا نکاح کرا دیں۔" انھوں نے پہلے تو پھولپور میں ہی نظر دوڑائی۔ لیکن کہیں کوئی موزوں لڑکی یہاں نواب کے لائق نہ تھی۔ پھر ان کو اپنی خالہ زاد بہن صفیہ بیگم کی لڑکی حسینہ کا خیال آ گیا صفیہ بیگم جوانی ہی میں تین کمسن بچوں کو لے کر بیوہ ہو گئی تھیں۔ بڑی لڑکی کی شادی انھوں نے کر دی تھی۔ لڑکا بھی اب نوکر ہو گیا تھا۔ چھوٹی بیٹی حسینہ بیس سال کی نیک، سلیقہ شعار، خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ مگر حسینہ کی شکل بھی معمولی تھی، اور صفیہ بیگم کے پاس دینے لینے کو بھی کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے حسینہ

کے لئے کوئی ڈھنگ کا پیغام ابھی تک نہیں آیا تھا اور ماں کو اب رات دن بیٹی کی شادی کا فکر رہتا تھا۔ قیصر دلہن سے بھی انھوں نے کہا تھا: "آپا حسینہ کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈو۔ اس کو دیکھ کر میری رات کی نیند اور دن کی بھوک اڑ گئی ہے۔ اس کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو میں سکھ کا سانس لوں۔"

قیصر دلہن نے حسینہ کا خیال آتے ہی شاہرخ مرزا سے کہا۔ "میاں اور کوئی لڑکی تو میرے دھیان میں ہے نہیں، ہاں، صفیہ بیگم کی لڑکی حسینہ ہے۔ یوں تو وہ اپنے کنبے کی بچی ہے، نیک اور سگھڑ بھی ہے، مگر ہے بالکل معمولی شکل والی۔ ہاں اتنا میں جانتی ہوں کہ صفیہ بیگم میرے کہنے کو نہیں ٹالیں گی اور حسینہ کو تم سے بیاہ دیں گی۔"

نواب شاہرخ تو محض چچا کی ضد میں اور لڑکا ہونے کی خاطر شادی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے جلدی سے کہا۔ "بس بس ٹھیک ہے۔ لڑکی خاندانی اور نیک ہے تو مجھے صورت کی بالکل پروا نہیں۔ آپ خالہ کو ابھی خط لکھ کر یہاں بلالیں پھر معاملہ طے ہو جائے گا۔"

قیصر دلہن کا خط ملتے ہی صفیہ بیگم بیٹی کو لے کر آگئیں۔ قیصر دلہن نے ان کو لکھا تھا کہ "ایک اچھا رشتہ حسینہ کے لئے یہاں ہے" پھر وہ بھلا یہاں کیوں نہ آتیں۔ پھول پور پہنچنے کے دوسرے دن ہی قیصر دلہن نے سب معاملہ صفیہ بیگم کو سمجھا دیا اور چار دن بعد جمعہ کی رات کو حسینہ کا نکاح شاہرخ مرزا سے خاموشی کے ساتھ ہو گیا اس دن حسینہ کو نماز مغرب کے بعد غسل کرا کے دلہن کا ایک نیا زرکار گلابی جوڑا پہنا کر اور بنجر بی کی نتھ لے کر قیصر دلہن صفیہ بیگم کے ساتھ ریاست کے مہمان خانے میں جو قلعے سے باہر تھا چلی گئی تھیں۔ نواب بھی شاپور مرزا، شمیم مرزا اور اپنے اے، ڈی، سی کے ساتھ تھوڑی دیر کے بعد

پہنچ گئے، مولوی صاحب پہلے ہی موجود تھے۔ صفیہ بیگم کے بھائی کو بھی قیصر دلہن نے تار بھیج کر بلوایا تھا وہ اس دن صبح ہی پہنچے تھے اور مہمان خانے میں ٹھہرے ماموں پدر وکیل بنے شاپور اور شمیم گواہ ہوئے، قاضی صاحب نے بعوض پچیس ہزار مہر حسینہ بیگم کو نواب شاہرخ مرزا کے نکاح میں دیدیا۔ شمیم مرزا کی کوٹھی بھی قلعے سے باہر تھی، دلہن دولہا کو ساتھ لے کر وہ چلے گئے۔ قیصر دلہن اور صفیہ بیگم گھر واپس آگئیں۔

صبح نواب شاہرخ حسینہ کو منو بی کے محل میں پہنچاتے ہوئے اپنی کوٹھی واپس آگئے۔

یوں ہی پانچ مہینے گزر گئے۔ شہلا غریب کو اس کا خیال بھی نہیں تھا کہ اس طرح سوکن اس پر آگئی ہے اور پھول پور میں تقریباً سب کو ہی نواب کے نکاحِ ثانی کی خبر تھی مگر منہ سے کوئی نہ کہتا تھا۔

شاہرخ مرزا دوسرے نکاح کے بعد سے بیوی سے زیادہ محبت کا اظہار کرنے لگے تھے۔ بچی سے بھی کافی دلچسپی لیتے۔ اس کی دوسری سالگرہ کی تقریب انھوں نے بہت دھوم دھام سے منائی۔ معصوم شہلا نواب کے اس ظاہری رکھ رکھاؤ کو اصلیت سمجھ کر خوش رہتی تھی اور کامران مرزا بھی بیٹی کی طرف سے مطمئن تھے۔ مگر بھلا مخالفت کی آندھیوں کی زد پر صلح و آشتی کا چراغ کتنے دن جل سکتا تھا۔

دو مہینے سے حسینہ کی طبیعت گری گری رہتی تھی۔ دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ دستر خوان پر سے وہ اکثر ابکائیاں لیتی ہوئی اُٹھ جاتی تھی۔ قیصر دلہن نے جو اس کی یہ کیفیت دیکھی تو سمجھ گئیں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ نواب کو خوش خبری سنائی۔ انھوں نے جھٹ حکیم صاحب کو محل میں طلب کیا اور حسینہ کی

نبض دکھائی اور حکیم صاحب نے قیصر دلہن نے جو کہا تھا اس کی تصدیق یہ کہہ کر کردی۔ "سرکار مبارک ہو، خوشی ہونے والی ہے اس لئے بیگم صاحبہ کی طبیعت مضمحل ہے۔"

نواب شاہرخ اس خبر سے خوش بھی ہوئے اور فکرمند بھی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی دوسری شادی کی خبر کو ابھی تک بالکل خفیہ رکھا تھا اور ریذیڈنٹ کو بھی اس کی اطلاع نہیں کی گئی تھی۔ ان کو خوف تھا کہ نکاح کی خبر پاکر چھوٹے چچا اور کوئی فساد کھڑا نہ کردیں۔ ان کا گورنمنٹ پنجاب پر بڑا اثر تھا۔ اگر ان کو غصہ آجاتا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتے۔ لیکن اب صورتِ حالات اور بھی نازک ہوگئی تھی۔ شاپور مرزا اور دیوان سے مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے دوسرے ہی دن تار پر اپنے نکاح ثانی کی اطلاع ریذیڈنٹ کو دی۔ اور قیصر دلہن سے کہا "آپ سب کو جلد از جلد معلوم ہوجانا چاہیئے کہ حسینہ میری منکوحہ بیوی ہے، ورنہ بچہ ہوگا تو بڑے جھگڑے پڑیں گے۔ آپ کل ہی سب خواتین کو اس خوشی میں ٹی پارٹی دے دیں اور حسینہ کی رونمائی کی رسم کردیں۔"

قیصر دلہن تو دل سے چاہتی تھیں کہ کامران مرزا کو نیچا دکھانے کا موقع ان کو ملے۔ جھٹ پٹ سب انتظام انھوں نے کرلیا۔ گھر گھر تاکن سے بلاوے بھجوادیئے اور رات گئے تک خوب گانا بجانا ہوتا رہا۔ دوسرے دن صبح ہی سے انھوں نے رسم رونمائی کی تیاری شروع کردی۔ شاپور دلہن اور شمیم دلہن بھی دوپہر کو بنو بی کے گھر میں آگئیں۔ حسینہ کے چاروں ہاتھ پاؤں میں مہندی لگوا کر بنو بی نے ان کو رنگ دیا۔ دو گھنٹے بعد مہندی چھڑا کر حسینہ کو غسل کرنے کے بعد بھاری بنارسی سرخ شاہانہ جوڑا اور یاقوت موتی کا

سیٹ پہنایا جو نواب نے بھجوایا تھا۔ نتھ بنّو بی اپنی حسینہ کو دے چکی تھیں ٹیکا آج رونمائی میں انھوں نے دیا۔ حسینہ ان کی بہن بھی تو تھی اس لئے ایک ساڑھی بھی دی۔ اس نے بھی آج ہی اپنے آپ کو شادی شدہ سمجھا۔ ورنہ اس کی نظر میں اپنی شادی کی وقعت گڑیوں کے کھیل سے زیادہ نہ تھی۔ تمام دن کنواری لڑکیوں کی طرح سادہ کپڑے پہنے قیصر دلہن کے احکام کی تعمیل کرتی رہتی۔ رات گئے روزانہ نواب کی موٹر اس کو لینے آتی اور پھر مُنھ اندھیرے واپس پہنچا جاتی۔ جہاں دن چڑھے تک وہ سوتی رہتی تھی۔ عجب انگھتی ہوئی زندگی تھی۔ جس میں ازدواجی خوشگواریوں کا نام بھی نہ تھا۔ شاپور دلہن نے رونمائی میں سونے کی بجلیاں دیں اور شمیم دلہن نے لاکٹ۔ قیصر دلہن کی بھابھی تھی وہ کیوں پیچھے رہتیں۔ انھوں نے سونے کی ٹیسپ پہنائی اور اہلکاروں کی بیویوں اور کنبے رشتے کی خواتین نے حسب توفیق روپے دئیے۔

*

یہاں یہ سوانگ رچا ہوا تھا اور شہلا بے خبر اپنے محل میں بیٹھی تھی۔ بنو بی اور قیصر دلہن شام کی چائے ہمیشہ اس کے ساتھ پیتی تھیں اور رات کے کھانے تک وہیں رہتیں۔ دونوں دیورانیاں بھی بلا ناغہ شام کو آجاتیں پہلے بیڈمنٹن کھیلا جاتا پھر تاش یا چوسر کی بازی جم جاتی۔ کبھی تو یہ دونوں واپس چلی جاتیں اور کبھی نواب کے ساتھ دونوں بھائی آجاتے تو ان کا کھانا بھی یہیں آجاتا۔ کھانے کے بعد رات گئے تک سب قصے سنتے، کھیلتے باتیں کرتے رہتے تھے، لیکن آج مغرب کی اذان ہوگئی اور سنّاٹا رہا تو شہلا نے بچی کی انا سے کہا۔ "اری دیکھ تو ظہورن! اچھی جان کی طبیعت کیسی ہے۔ کل ان کے سر میں درد تھا، جا خبر لا۔ وہ کیوں نہیں آئیں؟"

ظہورن بچی کو لئے ہوئے بنو بی کے محل میں چلی گئی۔ ڈیوڑھی سے ہی اس کے کانوں میں مراثنوں کے گانے کی آواز آئی۔ حیران ہو کر آگے بڑھی تو دیکھا ہر طرف خوب گہما گہمی ہو رہی ہے، چائے کا دور چل رہا ہے۔ سامنے ایک دلہن شاہانہ پوشاک میں گھونگھٹ میں منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ اس کے دائیں بائیں شاپور دلہن شمیم دلہن بنی سنوری بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں۔ بنو بی بھی آج بہت شگفتہ گاؤ تکیے سے لگی ہوئی ہر ایک جہان بیوی کی خاطر و مدارات میں مصروف تھیں اور قیصر دلہن خوش خوش ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ ظہورن نے بنو بی کی مغلانی سے پوچھا۔ "اچھی بی، یہ کس کی شادی ہو گئی کہ ہماری بیگم کو خبر بھی نہیں دی۔ وہ وہاں بیٹھی سب کی راہ دیکھ رہی ہیں، یہاں شادی رچی ہوئی ہے اور ان کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔"

مغلانی ہاتھ چمکا کر بولیں۔ "اے بوا، اللہ رکھے، ہماری حسینہ بیگم سے کل شام سرکار کا نکاح ہوا ہے اس کی خوشی میں آج ہماری بیگم صاحب نے سب کا چائے پانی کیا ہے۔"

انا کے تو اس خبر سے ہوش جاتے رہے۔ بہت دیر تک وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر بچی کو لے کر منہ لٹکائے ہوئے واپس آ گئی۔ شہلا اس کے انتظار میں تھا بی پر ٹہل رہی تھی۔ وہ آ کر چپ چاپ بیٹھ گئی تو شہلا نے کہا۔ "ادی عورت، تجھے کیا ہو گیا ہے جو یوں گم سم ہے؟"

انا بھرائی ہوئی آواز سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھ کر بولی۔ "کیا خاک بولوں، بیگم! آپ کو خبر بھی نہیں اور سوکن آپ پر آ گئی۔ کل سرکار نے حسینہ بیگم سے نکاح کر لیا۔ آج اسی خوشی میں حضور عالیہ کے یہاں گانا بجانا ہو رہا ہے۔ سب بیویاں جمع ہیں۔ ایسا غضب کہیں دیکھا نہ سنا کہ پہلی

خاندانی بیوی کے ہوتے ہوئے اس طرح دھوم دھام سے دوسری شادی رچائی جائے۔ آپ کی تو سہیلی بنی ہوئی تھیں حسینہ بیگم۔ روز تو آکر کھیلتی تھیں، یہ سب کچھ قیصر دلہن بیگم کا کیا دھرا ہے۔ وہ ہمیشہ سے آپ کی مخالف ہیں۔ ہمارے سرکار، تو بہت سیدھے ہیں ان کے کہنے میں آکر انھوں نے حسینہ بیگم سے نکاح کر لیا۔ ورنہ وہ آپ کی جوتی برابر بھی نہیں ہیں۔ ان کی اماں بھی بڑی چلتی ہوئی ہیں، دیکھنے میں بہت سیدھی لگتی ہیں۔"

شہلا نے سرد آہ لے کر کہا۔ میں کسی کو کچھ نہیں کہتی۔ میری قسمت ہی کھوٹی ہے جو وہ یوں مجھ سے پھر گئے" اور روتی ہوئی وہ کمرے میں بھاگ گئی۔

رات کو نواب حسب معمول کھانا کھانے آئے تو اس نے خاموش بیٹھ کر ان کو کھانا کھلا دیا۔ دل نہ چاہتا تھا لیکن آپ بھی دو چار نوالے اگل نگل کر کھائے۔ بڑی آن بان کی لڑکی تھی۔ اس موقع پر وہ اپنے کو بزدل ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کھانے کے بعد پانوں کا خاصدان نواب کی جانب سرکا کر بولیں "میرا دل اب یہاں گھبرا رہا ہے، آئندہ ہفتے جالندھر چلی جاؤں گی۔"

نواب نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔" کیوں ابھی تو گرمی بھی شروع نہیں ہوئی پھر تم کو جانے کا خیال کیوں آگیا"؟

شہلا" اس لئے کہ اب میرا یہاں رہنا چنداں ضروری نہیں۔ آپ کا دوسرا محل بھی تو آباد ہو گیا"۔

نواب نے کہا۔" ہاں، خیر وہ تو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تمھاری محبت پر اتنا بھروسہ ہے کہ میں نے حسینہ سے نکاح کر لیا۔ مگر وہ تو باجی اماں کے پاس رہے گی۔ تم کو اس سے کیا غرض، تم اپنے محل میں رہو۔ نوابوں کے دو کیا چار محل تک ہوتے ہیں۔ ہمارے دادا جان نے ہی خاندانی اور بچوں والی بیگم

پر ایک طوائف کو لا بٹھایا تھا تو وہ محل چھوڑ کر نکل نہیں گئیں۔ یہ تو کہنے کی بیٹی ہے۔"

شہلا نے میاں کی بات کا جواب نہیں دیا۔ منھ پھیر کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔

نواب کچھ دیر تو میٹھے زبانی چاپلوسی کرتے رہے، پھر اُٹھ کر باہر چلے گئے شہلا نے دوسرے دن یہ پورا قصہ باپ کو لکھ بھیجا۔

کامران مرزا کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ بھتیجا بات بھولا نہیں ہے۔ بیٹی کا خط پاکر انھیں حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ اپنے بڑے بیٹے کو بھیجکر شہلا کو تو بلوا لیا۔ اور بھتیجے کو نکاح ثانی کرنے کی سزا دینے کے لئے تدبیریں کرنے لگے۔

شہلا کے جاتے ہی حسینہ نواب کے محل میں آگئی۔ اس کو رخصت دلہن نواب نے خطاب دیا۔ صفیہ بیگم تو رہتی بیٹی کے ساتھ تھیں۔ قیصر دلہن کا سارا دن بھی اکثر وہیں گزرتا۔ وہ بھی ان کی نظر میں دیکھتی تھیں۔ جہیز تو کچھ حسینہ کو ملا نہ تھا۔ دو چار جوڑے ہی اس کے پاس ذرا پہننے کے لائق تھے۔ اس لئے نواب نے قیصر دلہن کو دو ہزار روپے دئیے کہ اس کے لباس درست کردیں۔ ایک درجن ساڑھیاں دلّی سے منگوادیں۔ قیصر دلہن نے دو مغلانیوں کو بٹھا کر چار بھاری جوڑے اور باقی پندرہ جوڑے روزانہ پہننے کے لائق تیار کرائے۔ دلبری کے جہیز میں سے ایک جوڑا نکاح کے وقت اس کو دے چکی تھیں ایک اور کارچوبی جوڑا بھابی کو بنا کر دیا۔

حسینہ کی شکل دل کش تھی نہ وہ امیر باپ کی بیٹی تھی۔ لیکن قسمت کی اچھی تھی کہ نواب پھولپور سے اس کا سنجوگ ہوگیا۔ پھر خدا نے بیٹا بھی دیا۔ بیٹے کے ہوتے ہی نواب شاہرخ نے ریذیڈنٹ کو ولی عہد کے ہونے

کی اطلاع بھیجدی۔ صفیہ بیگم کی خوشی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کی لڑکی نواب بیگم بھی بن گئی اور ولی عہد کی ماں بھی۔ قیصر دلہن بھی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں حیا رک۔ سلامت کے شور سے قلعہ گونج رہا تھا۔ باہر قوال مبارکبادی ترانے گا رہے تھے۔ تو پیں چھوٹ رہی تھیں۔ قلعے کے بڑے پھاٹک پر نوبت بج رہی تھی اور اندر ڈومنیاں زچہ گیریاں گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔

یہاں تو یہ جشن برپا تھا ادھر کامران مرزا کو اطلاع ملی تو انھوں نے ریزیڈنٹ کو لکھا۔ "یہ لڑکا نکاح کی اطلاع کے ساڑھے چھ مہینے بعد پیدا ہوا ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کو ولی عہد ریاست نہیں مانا جا سکتا۔ نیز نواب نے میری بیٹی سے شادی کے وقت شرط کی تھی کہ ولی عہد شہلا بیگم کے یہاں جو لڑکا ہوگا وہ ہوگا یا وہ جس کو مانیں گی اس کو ولی عہد سمجھا جائیگا۔"

بات معقول تھی، بڑے نواب صاحب نے پوتے کے تلوّن سے خائف ہوکر شہلا سے شادی کے وقت یہ کڑی شرط شاہرخ سے لکھوالی تھی اور حتی الامکان ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے، شہلا پر سوکن بھی آ گئی تھی اور اس کے یہاں لڑکا بھی ہو گیا تھا۔

ریزیڈنٹ نے نواب کو لکھا "آپ کے چچا کا اعتراض صحیح ہے۔ اس لڑکے کو ولی عہد کیسے مانا جا سکتا ہے، جبکہ پہلی بیگم کی موجودگی میں شرط کی رو سے آپ کو دوسری بیگم کے لڑکے کو ولی عہد بنانے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس کی پیدائش چونکہ آپ کے اطلاع دینے کے چند مہینے بعد ہی ہو گئی، اس لئے بھی اس کو آپ کا جائز وارث نہیں مانا جا سکتا۔ میں مجبور ہوں۔"

نواب کو ریذیڈنٹ کا یہ خط ملا تو ان کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی اور چچا

کی اس قانونی نکتہ چینی پر بل کھا کر رہ گئے۔ لیکن اب وہ کامران مرزا کا بگاڑ ہی کیا سکتے تھے جو اُن کو کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ شہلا نے پھول پور سے جانے کے بعد کوئی خط نہ بھیجا تھا۔ دو سو روپیہ ماہوار اس کا الاؤنس اور سو روپیہ جبینہ لڑکی کا ریاست سے چلا جاتا تھا۔ اور کوئی تعلق نواب کو بیوی بیٹی سے نہ تھا۔ البتہ بڑی بیٹی مہر بانو کو وہ سالگرہ اور عیدین پر تحفے بھی بھیجتے رہتے اور اس کی سالگرہ کی خوشی پھول پور میں بھی دھوم سے ہوتی تھی۔ اور جب کبھی لاہور جاتے بیٹی کو بلا کر دیکھتے کھلونے کپڑے، دو چار سو روپیہ دے آتے۔

بیٹے کی ماں بن کر رفعت دلہن نے زبان کھولی اور قیصر دلہن کے جا و بیجا احکام کی تابعداری سے انحراف کیا اور رفتہ رفتہ ان کے اثر سے خود کو بالکل آزاد کر لیا۔ انھوں نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی، کہ اس پر اب بے موقع حکومت نہ جتائیں۔ وہ اب صرف ان کی بیوہ بہن کی لڑکی نہیں بلکہ نواب کی بیگم اور صاحبِ اولاد تھی۔ رفعت دلہن تعلیم یافتہ نہ تھی لیکن سگھڑ اور سمجھدار لڑکی تھی۔ قرینے سے محل کا تمام انتظام خوش اسلوبی سے کرتی۔

شاہ رخ مرزا نے یہ شادی دلی لگاؤ یا محبت کی وجہ سے نہیں کی تھی صرف لڑکا ہونے کی خاطر کی تھی۔ یہ بات سمجھدار جبینہ جانتی تھی۔ اس لئے میاں سے وہ چاہت کی طلبگار نہ تھی، اپنی قسمت پر شاکر اور ہر طرح مطمئن تھی۔

(۳۰)

انجو بی بھائی کے یہاں لڑکا ہونے کی خوشی میں جو آئیں تو پھر سورج گڑھ نہیں گئیں۔ ان کی شادی ہوئے اب بارہ سال ہو چکے تھے۔ ان بارہ سالوں میں نواب سورج گڑھ کی رنگ رلیوں سے ان کو جو دلی کوفت بھی وہ تو تھی ہی، اس کے علاوہ اپنے پر دو سوکنیں خود بیاہ کر لانے کی وجہ سے رہا سہا سکون بھی اپنا انھوں نے غارت کر لیا تھا۔ عذرا اور مسرت دونوں کمسن لڑکیاں تھیں۔ پھر ان کی اٹھتی جوانی تھی۔ ظاہر ہے نواب کی توجہ کا مرکز اب نئی نویلی بیویاں ہی تھیں۔ خصوصاً مسرت کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ تھی بھی وہ خوبصورت اور چنچل۔ یہ دونوں مل کر انجو بی کو ہر وقت ستاتی رہتیں۔ بلا وجہ ان کا مذاق اڑاتیں۔ اگر وہ کبھی شوخ رنگ کے بھڑکیلے کپڑے پہنتیں، تو شریر مسرت ان پر "بوڑھی گھوڑی لال لگام کا فقرہ" اس طرح چست کرتی کہ اس کی آواز انجو بی کے کان میں بھی پہنچ جاتی اور عذرا اس فقرے بازی پر تالیاں بجا کر ہنستی۔ انجو بی کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ان دونوں کو اگر کچھ کہتیں تو یہ قسمیں کھانے لگتی تھیں کہ "ہم آپ کو تو کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے آپ تو بلا وجہ خفا ہوتی ہیں۔" چار سال بھی انھوں نے بڑی مشکل سے گزارے۔

اب ان کا دل بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ یہ تہیہ کر کے پھول پور آئی تھیں کہ سورج گڑھ نہ جائیں گی۔ نواب کو وہ اب بھی کچھ نہ کہتی تھیں۔ کہنا بھی چاہتی تھیں تو وہ دلی چاہت جو اُن کو میاں سے تھی زبان پکڑ لیتی تھی۔ لیکن عذرا اور مسرت کی بیہودگیوں اور چھچھوری حرکات کا ذکر ہر ایک سے کرتی رہتی تھیں۔ نواب سورج گڑھ حسبِ معمول اب بھی ان کو لمبے لمبے محبت بھرے خط اور تار بھیجے جاتے تھے اور ہر خط میں بلاتے تھے۔ چھ مہینے بعد دہلی کسی ریاست کے کام سے آئے تو پھول پور بھی آ گئے اور انجوبی سے ساتھ چلنے کے لئے بہت اصرار کیا۔ انھوں نے ہنس کر کہا۔ "سرکار! اللہ رکھے آپ کی دو شادیاں میں نے اس لئے کرا دیں تاکہ میں اپنے بھائیوں کے پاس جب تک چاہوں رہ سکوں۔ پھول پور آ کر میری صحت درست ہو گئی۔ سورج گڑھ کا پانی بہت بھاری ہے۔ دن بدن موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ شاپور دلہن کے یہاں خوشی ہونے والی ہے۔ جب تک ان کے یہاں ولادت ہو میں یہیں ہوں گی۔"

نواب چار دن رہ کر چلے گئے۔ انجوبی کا الاؤنس پانچ سو روپیہ ماہوار آ جاتا تھا اور ان کی سالگرہ اور نواب سورج گڑھ کی سالگرہ پر ان کے لئے قیمتی ساڑھیاں بھی آتیں۔ مگر انجوبی نے اب زرق برق کپڑے پہننے چھوڑ دیئے تھے۔ ان ساڑھیوں کو بھی وہ دیکھتیں اور سرد آہ لے کر بکس میں بند کر دیتیں موقع موقع سے بھاوجوں کو چمکیلی شوخ رنگ کی ساڑھیاں دیتی رہتی تھیں۔

شاپور کے یہاں لڑکا ہوا تو انھوں نے بہت دھوم سے چھٹی کی۔ اور سوا مہینے بعد لڑکے کو گود لیا۔ اب اس کی دیکھ بھال میں ان کا سارا وقت گزرتا تھا۔ دودھ تو انا پلاتی تھی لیکن رہتا وہ سارا دن انجوبی کے پاس تھا۔ نواب شاہرخ بھی ان کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اور بیوی کو بھی

تاکید کرتے رہتے تھے کہ "ہر طرح بڑی آپا کا خیال رکھو۔"

دو مہینے تک تو انجوبی رفعت دلہن کے ساتھ رہی تھیں پھر انھوں نے بھائی سے کہا۔ میرا تو اب ارادہ یہیں مستقل رہنے کا ہے۔ اور الگ رہنا چاہتی ہوں۔"

انھوں نے کہا۔ "بسر و چشم"

نواب کی کوٹھی کے قریب ہی ایک چھوٹا بنگلہ مخصوص مہمانوں کے لئے تھا نواب سورج گڑھ کے ساتھ انجوبی جب بھی آتیں اس میں ہی ٹھیرتی تھیں۔ انھوں نے رہائش یہیں اختیار کر لی۔ ان کی انّا اور مغلانی تو تھیں ہی، ایک ماما اور اوپر کے کام کے لئے انھوں نے رکھ لی۔ ڈیوڑھی پر دربان سورج گڑھ ہی کا تھا۔ پہرے پر دو سپاہی نواب شاہ رخ نے مقرر کر دیئے۔ کھانا دونوں وقت وہ رفعت دلہن کے ساتھ ہی کھاتی تھیں۔ چائے کی کشتی صبح شام نواب کے باورچی خانے سے لگ کر آجاتی تھی۔ بظاہر ان کو کوئی تکلیف نہ تھی، لیکن میاں کی بے وفائی اور سوکنوں کے توہین آمیز برتاؤ نے انجوبی کے دل کو کچھ ایسا صدمہ پہنچایا تھا کہ ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بہکی بہکی باتیں کرتیں۔ تنہائی میں اکثر عشقیہ اشعار گاتیں۔ میاں کی تصویر سے باتیں کرتیں، اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتیں۔ ستارا انجوبی کے آنے سے دو مہینے پہلے بیوہ ہو گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اس کے یہاں چوتھا بچہ ہونے کو ہوا تو وہ بہت بیمار ہو گئی۔ قیصر دلہن اس کو دیکھنے گئیں تو ستارا تنہا پڑی بخار میں بھن رہی تھی۔ اور گھر میں پکانے والی ماما کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ میاں حسبِ معمول تفریح کو گئے ہوئے تھے۔ رات کو آٹھ بجے کے بعد واپس آئے۔ قیصر دلہن نے ان کو خوب برا بھلا کہا۔ وہ بھلا کیوں دبتے ان کے ہی بھانجے تھے۔ ساس داماد

میں بہت دیر تک دو بدو ہوئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ بیٹی کو لے کر دوسرے روز دلی آگئیں اور پھر اس کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہی پھولپور لے گئیں۔

ستارا کو میاں نے خط لکھا۔ "اگر تم کو میرے ساتھ رہنا ہے تو پھولپور نہ جاؤ اور ماں سے قطع تعلق کر لو۔ ورنہ میں پھر ہرگز تم کو نہیں بلاؤں گا۔"

مگر اب ستارا میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس ظالم کی اور مار کھاتی۔ ستارا کی زندگی جب تک ہی اچھی گزری جب تک خالہ زندہ رہیں۔ وہ ہر وقت اس کو ہاتھوں چھاؤں رکھتی تھیں۔ بیٹے کو برا بھلا کہتی رہتیں اور بہو کا دل نہ میلا ہونے دیتی تھیں۔ ان کے مرتے ہی لاڈلے صاحبزادے نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ ماں کے سامنے ہی وہ کب بیوی کو خاطر میں لاتا تھا اور اب تو سیدھے منھ اس سے بات کرنا بھی قسم ہو گیا تھا۔ اور کبھی کبھی ستارا کو مار بھی بیٹھتا۔ غریب لڑکی ناہنجار شوہر کے ظلم سہہ سہہ کر زندگی کے کڑوے کسیلے دن گزار رہی تھی۔ ماں سے اس لئے نہ کہتی تھی کہ ان کا مزاج بھی تیز ہے۔ لیکن جب انھوں نے خود پہنچ کر اس کی حالت دیکھی تو داماد کے کرتوت معلوم بھی ہو گئے۔ پھولپور آنے کے مہینہ بھر بعد ستارا کے یہاں لڑکا ہوا، بچہ تھا گول مٹول بالکل گڈو سا۔ بنو بی کا دل اس بچے کی وجہ سے بہت بہل گیا ورنہ دلبری کے جانے کا غم ان کو ہر وقت نڈھال رکھتا تھا۔ ادھر ستارا کے میاں نے دوسری شادی رچائی۔ قیصر دلہن یہ سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ خوب چیخیں چلائیں۔ مگر ان باتوں کا اثر ستارا کے میاں پر کیا ہو سکتا تھا۔ اب وہ پچھتا رہی تھیں کہ اپنی اتنی اچھی بیٹی کی تقدیر چاہت میں آ کر نالائق بھانجے کے ساتھ پھوڑ دی۔ وہ تو ہمیشہ کا خود سر بدمزاج اور ضدی تھا۔ جان بوجھ کر ستارا کی مٹی انھوں نے پلید کی تھی۔

عطن اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھی کہ اس کی قسمت نے بھی پلٹا کھایا۔ ایک

پلٹا کھایا۔ نواب گلاب باڑی کا دل کی حرکت بند ہو جانے سے ایک دم انتقال ہو گیا۔ ساس ہمیشہ سے عطن کی دشمن تھی۔ میاں ماں کے کہنے میں اور بڑے احمق تھے۔ خسر کے انتقال کے تین مہینے بعد عطن کے یہاں دوسری لڑکی ہوئی اور سوا مہینے کا چلّہ نہا کر وہ پھول پور آئی۔ ہمیشہ ہی آتی تھی مگر اس مرتبہ اس کو آئے سات مہینے گزر گئے اور میاں لینے نہیں آئے۔ دو تین مرتبہ عطن نے لکھا بھی کہ "دونوں بچے تم کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ چھوٹی بچی بھی اب بہت پیاری ہو گئی ہے کب آؤ گے؟"

میاں نے یہ لکھ کر ٹال دیا" ابھی مجھے فرصت نہیں، پھول پور ہی رہو، ریاست کے چند کاموں کی وجہ سے مجھے بمبئی جانا ہے، وہاں نہ جانے کب تک رہنا پڑے؟"

عطن نے بھائی سے کہا۔" ان کو تو آنے کی فرصت نہیں آپ مجھے بھجوا دیں" وہ بولے" تم کو جانے کی ایسی کیا جلدی ہے، وہ کہیں گے بھائی رکھنا نہیں چاہتے جو بھجوا دیا"

یونہی دس مہینے ہو گئے، اب عطن صبر نہ کر سکی۔ بھائی کے لے، ڈی سی کو ساتھ لے کر سسرال چلی گئی۔ میاں کو تار سے اپنی روانگی کی اطلاع دیدی، وہاں پہنچی تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر لینے بجائے میاں کے مجھلی نند آئیں۔ گھر پہنچ کر بھی میاں نے صورت نہ دکھائی، ساس البتہ خلافِ عادت بہت خوش نظر آئیں اور انھوں نے بہو سے مسکرا کر کہا۔"سلطان نے اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کر لی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میری بھی یہی مرضی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے زبردستی تمہارے ساتھ شادی کی، میں ان کو منع کرتی تھی، مگر ان کو نہ جانے کیا ضد مجھ سے ہو گئی

تھی کہ میرا کہنا نہ مانا۔"

عطن غریب ساس کو کہہ کیا سکتی تھی، سوکن آنے کی خبر سن کر دل پر گھونسہ لگا اور اس نے بہ مشکل اتنا کہا "مجھے ان سے یا آپ سے کوئی شکوہ نہیں میری قسمت کا لکھا پورا ہوا۔" اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

دونوں نندوں نے عطن کو دلاسہ دیا، منجھلی نند ہمیشہ سے اس کا بہت خیال کرتی تھیں۔ بھاوج کو گلے لگا کر خود بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ اپنی طرف لیجا کر بہت اصرار کر کے اس کو ناشتہ کرایا۔ شام کو میاں بھی آئے اور کھڑے کھڑے سلام نہ دعا یہ حکم دیا۔ "ہمارے یہاں کا جو زیور تمہارے پاس ہے وہ دیدو۔"

عطن نے صندوقچے سے چڑھاوے کا سب زیور نکال کر خاموشی سے دے دیا۔ اور میاں صاحب مسکرا کر بولے۔ "کہ اماں جان سے تم کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میری اب دوسری شادی ہو گئی ہے۔ تم کو یہاں رہنے کی اب ضرورت نہیں، لڑکا البتہ میرے پاس رہے گا اس کی تعلیم کا زمانہ ہے۔ دونوں لڑکیوں کو تم لے جاؤ۔ کل صبح کی ٹرین سے تمہارے لئے درجہ ریزرو کر دیا ہے۔"

عطن ایسی حیران میاں کا منھ تک رہی تھی کہ وہ ایک کاغذ اس کے ہاتھوں میں دے کر چلتا ہوا۔ بدنصیب عطن کچھ دیر تو بت بنی یہی سوچتی رہی کہ یہ وہی انسان ہے جس نے میرا گھونگھٹ الٹ کر میرے سامنے چاند کو بھی ماند بتایا تھا اور جس نے ساری عمر محبت کرتے رہنے کی قسم کھائی تھی جو میری ذرا سی بیماری سے بے چین ہو جایا کرتا تھا اور دو چار دن کے لئے بھی باہر جاتا تو روزانہ خط بھیجتا رہتا۔ پھر اس نے ایک سرد آہ لے کر کاغذ کھول کر دیکھا تو یہ طلاق نامہ تھا۔ بیچاری رونے کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی۔ دونوں نندوں کو واقعی بھائی اور ماں کی زیادتی پر افسوس تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتیں،

مگر یکایک جو آتنے ظلم عطن پر بلا وجہ ٹوٹے تھے اس کا مداوا کیونکر ہو سکتا تھا۔ کھانا وہ اس جگہ بھلا کیا کھاتی جہاں اس کی اتنی توہین کی گئی تھی۔

ساری رات اس نے رو رو کر گزاری، علی الصباح دونوں بچیوں کو لیکر لڑکے کو پیار کر کے حسرت بھری نظریں اس عالیشان دو منزلہ عمارت پر ڈالی جہاں وہ کبھی دلہن بن کر بہت تزک و احتشام سے آئی تھی اور جہاں اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے آٹھ سال گزارے تھے، رخصت ہوئی، غمگین و پریشان پھول پور پہنچی۔ شاہ رخ مرزا کو بڑی بہن کے آبیٹھنے کا دلی صدمہ تھا۔ اب چھوٹی بچوں والی بہن بھی طلاق پاکر ان کے پاس آگئی، اس کا ان کو اتنا رنج ہوا کہ بہن کے ساتھ خود بھی رو دیئے اور دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ انھوں نے جو برا سلوک اپنی معصوم بیویوں سے کیا تھا، اس کا انتقام قدرت ان کی بہنوں سے لے رہی تھی۔ اور مظلوم بیویوں کی آہوں نے نواب کی دونوں بہنوں کے بنے بنائے گھر اجاڑ دیئے تھے۔

عطن گھنٹوں یہ سوچا کرتی تھی کہ کاش وہ شہاب سے بیاہی جاتی محض روپے کی خاطر اس کی انمول زندگی کو یوں برباد نہ کیا جاتا تو وہ اس طرح ناشاد و نامراد زندگی کیوں بسر کرتی۔

شہاب کو بڑے نواب صاحب نے دوسری جنگ عظیم کے شروع میں ملٹری ٹریننگ کے لئے بھیجدیا تھا۔ اب وہ کیپٹن کے عہدے پر ممتاز تھا۔ شکیل، جمیل، جوان رعنا شہاب پر فوجی وردی خوب زیبا دیتی تھی۔ یہ بھی قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ شہاب کی شادی عطن کو طلاق ملنے سے چند مہینے قبل بڑی پھوپی نے اپنی نند کی اکلوتی لڑکی سے کرادی تھی۔ شہاب دلہن معمولی شکل کی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ہاں اپنے والدین کی ایک ہی اولاد ہونے کے باعث اس کو جہیز

بہت ملا تھا۔ شہاب کے دل کا حال تو خدا جانے، بظاہر وہ اب ہر طرح مطمئن تھا
اور اس کی ازدواجی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔

نجمی میاں تین بچوں کے والد بزرگوار بن گئے تھے۔ مگر ان کی حرکات میں
اب بھی وہی والہانہ لڑکپن کا انداز جھلکتا تھا۔ محاذ جنگ پر نجمی نے ایسی دلیری
دکھائی کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس کو میجر بنا دیا گیا۔ اور وہ شان سے تمغے سجائے
سینہ تانے چلتے تھے۔ اور جب بھی اپنے پرانے ساتھیوں سے ملتے بیرونی ملکوں میں
جو انھوں نے روماں کئے تھے وہ سناتے اور ہنساتے رہتے تھے۔

کون جان سکتا تھا کہ فربہ اندام چھائیوں پڑے چہرے والی معمر بیگم جو
ہر وقت بچے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں وہی انجبلی ہیں جن کے دلآویز حسن نے
نواب سورج گڑھ کو موہ لیا تھا اور ان کے خطوط انجبلی کے دلربا حسن کے
قصیدے ہی ہوتے تھے اور وہ حسین اور نازک اندام عظمیٰ جس کا چنبیلی کے پھول
کی مانند کھلا ہوا رنگ اور سبک جسم کبھی خاندان بھر کے لڑکوں کے لئے موضوع
گفتگو تھا۔ تین بچوں کی ماں بن کر اور اپنے میاں کی سنگدلی کی بدولت زرد
رو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ اور ہر وقت کسی نہ کسی سے باتیں کرتی
رہتی۔ اگر کوئی باتیں کرنے کو نہ ملتا تو اپنے دل سے ہی باتیں کرتی۔ جیسے اس
کو اس کا یقین تھا کہ اگر تھوڑی دیر بھی چپ رہی تو اس کا مغموم دل سینے سے
نکل جائے گا۔ اور ستارہ وہ شوخ چنچل ہر دم گانے اور تھرکنے والی تیتری
جس کی ہر حرکت زندگی سے بھرپور تھی۔ جس کے دلکش نغمے اور ہنسی کے زمزمے
ہمجولیوں کی محفل میں باعث رونق ہوئے اب یا سرد آہیں لیتی رہتی یا کھانستی
رہتی تھی۔ بے حد غموں اور لاانتہا مایوسی کے باعث اس کے سر کے آدھے بال
سفید ہو گئے۔ اور وہ بھری جوانی میں ذہنی کوفت کی بدولت بڑھیا لگنے لگی تھی۔

ہنسی اب ستارہ کے لبوں پر مشکل ہی سے آتی تھی۔ اور بولتی بھی وہ بہت کم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ستارہ نہیں اس کی لاش ہے جو کسی بیرونی طاقت کے زور سے چل پھر لیتی ہے۔

انجو عظمیٰ اور ستارہ اپنی زندگی کی تمام رعنائی اور شگفتگی کھو کر بیتے دنوں کا دھندلا سا عکس ہو کر رہ گئی تھیں۔ چھمو ان تینوں کو عبرت کی نظر سے دیکھتی اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل جاتا۔ "کاش یوں نہ ہوا ہوتا۔"

(۳۱)

جنرل صاحب کے انتقال کے بعد سے جب تک قمر میاں برسرِ روزگار نہ ہوئے چھوٹی بہو صاحب نے کئی سال تک مالی مشکلات برداشت کیں۔

جنرل صاحب کی آمدنی اپنے دونوں بھائیوں سے چوگنی تھی۔ پھر چھوٹی بہو صاحب کو میکے سے بھی کافی جائداد ملی تھی۔ مگر جنرل صاحب فضول خرچی کی حد تک فیاض تھے اور چھوٹی بہو صاحب کا ہاتھ اور دل ضرورت سے زیادہ کھلے ہوئے تھے۔ دونوں میاں بیوی جس قدر بھی روپیہ آتا بے فکری سے اٹھا دیتے۔ جنرل صاحب اگر ڈنر، ٹی پارٹیاں شان سے کرتے اور دوستوں عزیزوں کو موقع بے موقع تحفے دیتے رہتے تو چھوٹی بہو صاحب آئے دن بچوں کی دودھ چھٹائی، سالگرہ، بسم اللہ، ختنوں کی تقاریب میں اندھا دھند روپیہ اٹھاتی رہتیں۔ دونوں لڑکیوں کی شادیاں انھوں نے اتنی دھوم سے کی تھیں کہ شہر بھر میں موضوع گفتگو جینے مہینے تک ان شاندار شادیوں کا تذکرہ رہا تھا۔ نتیجہ ان اللّوں تللّوں کا یہ ہوا کہ کافی جائداد قرض کے بار میں دب کر ہاتھ سے نکل گئی۔ سونے کا تمام زیور انور میاں پار لگا چکے تھے اور جتنی اشرفیاں تھیں وہ ختم ہو گئی تھیں۔ جڑاؤ بیش بہا زیور کا بھی ایک تہائی حصہ اس کشاکش کے زمانے میں چھوٹی بہو صاحب کے ہاتھ

سے نکل گیا۔ مگر اب اللہ نے ان پر فضل کیا تھا۔ جنرل صاحب کی نیکی اور ان کی خدا ترسی کی بدولت مصائب کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ انھوں نے نہ جانے کیا کیا جتن کر کے اپنی آن بان کو ابھی تک قائم رکھا تھا۔

قریبی رشتہ داروں تک کو اس کا علم نہ تھا کہ ان کو کتنی مشکل اس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے اٹھانی پڑتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہمت قابلِ داد تھی، یہ نازک جسم نہ جانے کیسے ان مشکلات کو سہار گیا۔ جو میاں کے بعد ان پر آ پڑی تھیں۔ مگر اپنے معیارِ زندگی میں انھوں نے ایسا فرق نہیں آنے دیا کہ کوئی کچھ محسوس کرتا۔ حسبِ عادت مہمان داری اب بھی وہ کرتی تھیں۔ آئے دن صدقے خیرات نذر نیاز حسبِ دستور اب بھی کرتی رہتیں۔ ان کے اس رکھ رکھاؤ کی بدولت کنبے رشتے والے سب تعریف کرتے تھے۔

اب اللہ رکھے بچے سب سیانے ہو گئے تھے۔ قمر میاں نے ملازمت تو دو سال بعد ہی چھوڑ دی تھی مگر اب ان کی پریکٹس خوب چمک گئی تھی۔ حیدرآباد کے کامیاب اور مشہور بیرسٹروں میں ان کا شمار تھا۔ ان کی ماہانہ آمدنی تین ہزار سے کچھ اوپر ہی تھی۔ انور میاں کو بھی اب بارہ سو روپے ماہوار مل رہے تھے اختر عرف چھٹن صاحب دوسری جنگِ عظیم میں ایف اے کر لینے کے بعد فوجی ٹریننگ کے لئے چلے گئے تھے۔ اور اب لفٹیننٹ کے عہدے پر ممتاز ہوئے ان کو چار مہینے ہو چکے تھے۔ بنن بی، منجو بی اپنے اپنے گھروں میں شاد آباد تھیں۔ پھپھو علمی ادبی مشاغل میں مگن رہتی تھی۔ نسرین جس کو چھوٹی بہو صاحب ابھی تک بے بی کہتی تھیں اب فرسٹ ایئر میں تھی۔

چھوٹی بہو صاحب کو اب قمر کی شادی کا بہت فکر تھا اور ان کا یہ فکر کرنا تھا بھی بجا۔ ان کا ہونہار لائق بیٹا اب اپنی عمر کی پینتیس بہاریں دیکھ چکا

تھا لیکن ان کو اُس کے لئے ابھی تک کوئی موزوں لڑکی نظر نہیں آئی تھی۔ کنبے میں جتنی لڑکیاں تھیں وہ عمر میں بھی چھوٹی تھیں اور تعلیم بھی ان کی مکمل نہ تھی۔ غیروں میں جہاں جہاں نظر ڈالی کوئی نہ کوئی نقص چھوٹی بہو صاحب کو نظر آیا۔ جستجو کرتے کرتے جب تھک گئیں تو اُنھوں نے مایوس ہو کر کہا میں بھی شاید قمر کی شادی کی آرزو لے کر اسی طرح دُنیا سے جاؤں گی، جیسے اس کے باپ سدھارے۔ سکندر زمانی بیگم کو بھی پوتے کا سہرا دیکھنے کا بہت ارمان تھا۔ لیکن ہر بات کا وقت خدا کی جانب سے معین ہوتا ہے۔

بسنت کی مدھ ماتی رُت آ پہنچی تھی۔ دن روشن اور نکیلے تھے۔ چھوٹی بہو صاحب حسبِ معمول بچھو کے اتوار کی صبح ساس کے پاس رنگ محل پہنچ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد سکندر زمانی بیگم کی چھوپی زاد بہن کی پوتی سعیدہ بیگم بھی آئیں۔ ان کے میاں میرٹھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے انھوں نے بہت اصرار سے چھمو اور چھوٹی بہو صاحب کو میرٹھ کی نوچندی میں آنے کی دعوت دی۔ چھمو کو سعیدہ بیگم ہمیشہ سے پسند تھیں بہت نیک خلیق اور سلجھے ہوئے مزاج کی بیوی تھیں۔

چھوٹی بہو صاحب حسبِ عادت سفر کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں۔ لیکن چھمو کو سیر سپاٹوں کا بہت شوق تھا اس نے کہہ سن کر چلنے کے لئے ماں کو رضامند کر لیا۔ دوسرے دن، دن بھر کے لئے سعیدہ بیگم چھوٹی بہو صاحب کے یہاں مہمان آئیں تو انھوں نے پھر نوچندی میں آنے کی بہت تاکید کی۔

چھوٹی بہو صاحب کو لے کر چھمو اپنی کار میں میرٹھ گئیں۔ وہ دور ہی کتنا تھا سوا گھنٹے بعد ان کی شیورلیٹ سعیدہ بیگم کی کوٹھی کے پورچ میں جا کر رک گئی۔ انھوں نے چچی اور بہن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چھوٹی بہو صاحب تو اتنی دیر کے سفر میں ہی تھک گئی تھیں۔ نوچندی میں گئیں تو، لیکن جا کر اس خیمے میں بیٹھ گئیں

جو کلکٹر صاحب کے لئے مخصوص تھا۔ چھمو البتہ پھرتی رہی۔ رات کے دس بجے واپس آ کر کھانا کھا کر سو گئیں۔ صبح ناشتے کے بعد چھمو سعیدہ بیگم کے ہمراہ کوٹھی کے لان میں ٹہل رہی تھی۔ یونہی بات کرنے کی خاطر اس نے سامنے والی سرخ کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"

سعیدہ بیگم نے کہا۔ "میری ماموں زاد بہن رہتی ہیں یہاں۔ اور ان کے میاں سے تو تم بخوبی واقف ہوں گی۔ ریٹائرڈ آفیسر اور مشہور ادیب ہیں۔"

چھمو نے کہا "اچھا! وہ ـــ ہاں میں جانتی ہوں، بہت پرانے لکھنے والے اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ آپ کے بہنوئی ہیں تو میں ان سے ضرور ملوں گی۔"

وہ بولیں۔ "چلو، اچھا ہے، میں بھی تمہارے ساتھ آپا سے مل آؤں گی۔ ان کے یہاں کی ماما کل آئی تھی، کہہ رہی تھی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہارے آنے کی وجہ سے میں نہ جا سکی۔ کوٹھی سامنے تو تھی ہی۔ دونوں ٹہلتی ہوئی چلی گئیں۔ سعیدہ بیگم نے اپنی بہن سے چھمو کا تعارف کرایا وہ طبیعت درست نہ ہونے کی وجہ سے پلنگ پر رضائی اوڑھے لیٹی تھیں، ان کو دیکھ کر بیٹھ گئیں اور اپنی لڑکی کو آواز دے کر کہا۔ "فہمیدہ بیگم! دیکھو تمہاری خالہ آئی ہیں۔"

ایک سہنس مکھ گداز جسم کی نوجوان خاتون چھمو کے سامنے مسکراتی ہوئی آگئیں اور بہت تپاک سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں تھوڑی دیر بعد سعیدہ بیگم نے کہا۔ "ہماری چھمو کو بھی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ دولھا بھائی کی طرح یہ بھی ہر وقت قلم سنبھالے رہتی ہیں، ان سے ملنے کے لئے یہ خاص طور پر آئی ہیں۔"

فہمیدہ بیگم نے کہا، "اے ہے، اماں! یہاں تو بیٹھنے کی جگہ ٹھیک نہیں نشست کے کمرے میں چلئے۔ وہیں میں ابا جان کو بھی بلا لاؤں گی۔"

انھوں نے کہا۔ "ہاں، تم ان کو لے کر چلو، میں بھی ابھی آتی ہوں۔"
فہمیدہ بیگم ان دونوں کو لے کر نشست کے کمرے میں جا بیٹھیں اور آواز دے کر کہا "شاہینہ! ارے کہاں گھسی ہوئی ہو، یہاں آؤ خالہ جان آئی ہیں۔"
چند منٹ بعد ایک لڑکی جس کے چمپئی رنگ میں سرخی جھلک رہی تھی اور ابرو کمانوں کی مانند کھچے ہوئے تھے۔ مخمور آنکھوں کے جام چھلکاتی، سفید سوتی ساڑھی اپنے دلآویز جسم کے گرد لاپرواہی سے لپیٹے ہوئے سامنے آکھڑی ہوئی سعیدہ بیگم کو سلام کر کے وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ چھمو کی نظروں میں اس کی دلکش صورت کھب گئی اور دماغ میں بے ساختہ یہ خیال آیا کہ "یہ میرے پیارے بھائی کے لئے موزوں رفیقۂ حیات ہو سکتی ہے۔"
شاہینہ اب اپنے باپ کو بلانے چلی گئی تھی۔ سعیدہ بیگم کہہ رہی تھیں، بڑی سگھڑ ہے، اپنی شاہینہ بھی۔۔۔ دیکھو چھمو بی! یہ تصویر دولہا بھائی کی اس نے ہی بنائی ہے۔ اور چھمو نے زیرِ لب کہا۔ "اچھا تو یہ فن کار بھی ہے، آرٹ کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ لکھنے کا شوق نہیں تو تصویر کشی کا تو ہے۔ یہ ذوق اس کو اپنے ذہین والد سے ترکے میں ملا ہے۔"
شاہینہ بمع ماں باپ کے کمرے میں داخل ہوئی، چھمو اب باتیں ان دونوں سے کر رہی تھی لیکن نظریں اس کی اب بھی شاہینہ کی جانب تھیں۔ وہ چھمو کے بے موقع گھورنے سے گھبرا کر بھاگ گئی اور چھمو تھوڑی دیر بعد سعیدہ بیگم کے ساتھ اُٹھ آئی اور اس نے ان سے کہا۔ "باجی! آپ کی بھانجی شاہینہ تو مجھ کو بہت اچھی لگی۔"
سعیدہ بیگم نے کہا: "ہاں، وہ ہے بھی بہت پیاری، ہماری آپا نے لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی اور تربیت بھی اچھی دی۔ بڑی سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی ہے،

پچھلے سال ہی تو اس نے بی، اے پاس کیا ہے۔"

پھمو خوش ہو کر بولی۔" مجھے تو بھائی جان کے لئے شاہینہ ہر طرح موزوں معلوم ہوتی ہے۔ کہیں ابھی بات تو نہیں ٹھیری اس کی۔ خدا کرے بھابی، اماں! یہاں کوئی مین میخ نہ نکالیں اور ان کو بھی وہ پسند آجائے۔"

سعیدہ بیگم نے کہا۔" پیغام تو آتے ہی رہتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں ابھی کہیں اس کی نسبت نہیں ٹھیری۔ اور اس کا تو تم اطمینان رکھو، میری اماں جان اصل نسل سیدانی تھیں۔ دولھا بھائی بھی گھرے مغل ہیں۔ ان کے بزرگوں کو شاہی زمانے میں جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ غدر میں یہ جاگیریں تو ضبط ہو گئیں، پھر بھی ان کے یہاں کوئی گر پڑا نہیں۔ سب اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، مجھے پہلے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ بیشک چچی جان کو شاہینہ قمر میاں کے لئے پسند آجائے گی۔ ہر طرح اللہ رکھے یہ جوڑ بہت موزوں رہے گا۔"

پھمو نے ماں سے جا کر کہا۔" انعام دلوائیے میں نے آپ کے لئے بہو ڈھونڈ لی آپا کی ماموں زاد بہن کی لڑکی ہے، مجھے تو بہت اچھی لگی۔ خوبصورت بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ باقی حسب نسب اس کا آپ کو آپا بتا دیں گی، آج شام کو آپ چل کر دیکھ لیں۔"

چھوٹی بہو صاحب مسکرا کر بولیں۔" اللہ وہ دن تو کرے کہ میں بہو بیاہ کر لاؤں، جو مانگو گی دوں گی۔ ان کے ماموں کو کیا میں نہیں جانتی۔ بہت صحیح النسب سید ہیں۔ ہاں ان کی لڑکی کس سے بیاہی گئی یہ مجھے نہیں معلوم۔"

سعیدہ بیگم نے اپنی بہن کے میاں کے خاندان کے متعلق بھی تفصیل پوری چھوٹی بہو صاحب کو بتائی۔ اور انھوں نے ہر طرح اطمینان کرنے کے بعد کہا "یہ لڑکی ہر طرح اچھی ہے۔ سعیدہ بیگم میں بھی تمہارے ساتھ شام کو اس کو

دیکھنے کے لئے چلوں گی۔"

"چھو کے خیالوں میں تو آج بھائی کی شادی کی خوشی میں پریاں ناچ رہی تھیں۔"

دوپہر بھر اس کو نیند نہ آئی۔ تیار ہو کر چار بجے سے اس نے سعیدہ بیگم پر چلنے کا تقاضا شروع کر دیا وہ ہنس کر بولیں "توبہ ذرا تو دم لو، چچی جان عصر کی نماز پڑھ رہی ہیں اور ابھی تمہارے بہنوئی بھی نہیں آئے، وہ چائے پی لیں، پھر چلوں گی۔"

چھو نے بڑی بیتابی سے ادھر ادھر چکر کاٹ کر وقت گزارا، چائے کے ختم ہوتے ہی چھ بجے یہ سب بیویاں سرخ کوٹھی پہنچ گئیں۔ کیونکہ بیگم صاحب کو معلوم تھا کہ ان کی بہن مع مہمان بیگم کے آنے والی ہیں۔ اس لئے وہ ان کے انتظار میں نشست کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے بھی آکر سلام کیا۔ چھوٹی بہو صاحب کو شاہینہ کی شکل بہت اچھی لگی اور انھوں نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کی والدہ سے کہا۔ "آپ بھی دلّی کی ہیں اور میری سسرال بھی دلّی کی ہی ہے اور ہماری اماں جان کی تو آپ کی دادی سمدھن ہی نہیں سہیلی بھی تھیں جب کبھی اللہ بخشے وہ آتیں، اماں جان ان کو آتا دیکھ کر دور سے ہی کھڑی ہو جاتیں اور ہنس کر کہتیں۔ "اے بی، تم سمدھن تو خیر ہو ہی۔ مگر سیدانی اور آلِ رسول ہو، اس لئے تمہارا ادب بھی کرتی ہوں اور محبت بھی۔ تم کیا آئیں کہ عید کا چاند نکل آیا۔ پھر دونوں گھنٹوں سر جوڑ کر باتیں کرتی رہتی تھیں۔

وہ بولیں۔ "جی ہاں میں بھی جب تک چھوٹی رہی، دادی اماں کے ساتھ رنگ محل جاتی تھی اور آپ کی ساس مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔"

چھوٹی بہو صاحب نے ہنس کر کہا۔ "جی چاہتا ہے یہ باسی سمدھیانا

پھر تازہ کیا جائے، آپ کی پھوپی رشتے میں میری جیٹھانی ہوتی ہیں۔ اب میں اپنے بڑے لڑکے قمر میاں کے لئے شاہینہ بی کو مانگتی ہوں۔ قمر بیرسٹر ہیں اور حیدرآباد میں پریکٹس کرتے ہیں، ان کے متعلق جو بھی آپ معلوم کرنا چاہیں وہ سعیدہ بیگم تفصیلی طور پر آپ کو بتا دیں گی۔"

شاہینہ تو شادی کا ذکر چھڑتے ہی اُٹھ کر چلدی، پھر کھیل تو فہمیدہ بیگم کی ننھی بچی کے ساتھ رہی تھی، لیکن اس نے کان ماں کی باتوں پر لگا رکھے تھے۔

شاہینہ کی والدہ مسکرا کر بولیں "آپ کا کہنا سر آنکھوں پر، مگر آپ جانتی ہیں رشتے ناطے کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ہر پہلو سے غور کیا جاتا ہے۔ آپ کے صاحبزادے ماشاءاللہ اپنے باپ ہی کی طرح قابل اور لائق ہوں گے۔ مجھے کچھ وقت سوچنے اور مشورہ کرنے کے لئے دیجئے۔ اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ ذکر شاہینہ کے باپ کے سامنے ابھی ہو تو اچھا ہے۔"

چھوٹی بہو صاحب نے کہا "اے بوا۔ میرا پردہ تو اب کسی سے بھی نہیں ہے قمر چھپو کو ہر کہیں اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں، بالکل پردے کے خلاف ہیں۔ جوان کنواری لڑکی تو باہر پھرے اور میں پردے لگائے بیٹھی رہوں یہ کیسے ممکن ہے؟ اور لحاظ تو آنکھ کا ہوتا ہے، شوق سے آپ بھائی صاحب کو بھی یہاں بلا لیجئے۔"

فہمیدہ بیگم جا کر اپنے باپ کو بلا لائیں۔ بیوی نے میاں سے جو چھوٹی بہو صاحب نے کہا تھا کہہ دیا۔ وہ بولے "بھابی جان! مجھے آپ کے خاندان کے متعلق تو کچھ معلوم کرنا نہیں۔ مگر ہاں، یہ ضرور چاہتا ہوں کہ صاحبزادے سے مل کر باتیں کر دوں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ شادی سے قبل لڑکا لڑکی کی رائے معلوم کر لینی چاہیئے۔ اور قمر میاں تو ماشاءاللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ ان کے خیالات کا اندازہ کرنا بے حد ضروری ہے، آپ کو شاہینہ پسند

آگئی۔ ممکن ہے ان کو آپ کی پسند سے اتفاق نہ ہو، وہ یہاں آئیں، لڑکی کو دیکھیں یہ ان کو دیکھے، ان دونوں کی مرضی ہوگی تو آپ کے حکم کی تعمیل بسر و چشم کروں گا۔

چھوٹی بہو صاحب پرانی روایات کی پابند تھیں۔ مگر قمر کی ضدی طبیعت سے بھی واقف تھیں۔ اور باہر نکلنے کی وجہ سے بھی وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ کو سمجھنے لگی تھیں۔ اس لئے انھوں نے شاہینہ کے والد کی تجویز کو معقول سمجھا اور کہا "مجھے تو اس سے خوشی ہے کہ آپ قمر کے ہمخیال ہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے اور ہمیں اپنے بچوں کے احساسات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ قمر کی شادی میں دیر ہی اس لئے ہوئی کہ خاندان میں ان کے خیالات کے مطابق کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اور غیروں میں کوئی جگہ مجھے موزوں نظر نہ آتی تھی۔ میں ان کو حیدرآباد سے بلاؤں گی اور آپ کے پاس بھیجدوں گی۔"

'کافی' آگئی۔ اور پھر اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ خاصی رات گئے چھوٹی بہو صاحب بہو بیاہ لانے کا خیال لے کر خوشی خوشی واپس آئیں، دوسرے دن دوپہر کو ان کو دلی واپس جانا تھا۔ مگر صبح سویرے ہی سرخ کوٹھی کی ماما دوپہر کے کھانے کا بلاوا لے کر آگئی۔ بھلا جہاں سمدھیانا کرنے کا خیال تھا ان کے یہاں کی دعوت کو کیسے رد کیا جا سکتا تھا۔

گیارہ بجے چھوٹی بہو صاحب مع سعیدہ بیگم اور چھمو کے سُرخ کوٹھی گئیں چھمو اس خیال سے بہت خوش تھی کہ اس کو پھر شاہینہ کو دیکھنے اور اس کے احساسات کے سمجھنے کا موقعہ ملے گا۔ وہ جس وقت سے گئی اور جب تک وہاں رہی شاہینہ کے پاس ہی گھسی رہی اور اس نے ہر طرح یہ اطمینان کر لیا کہ اس کا انتخاب بُرا نہیں۔ اسی روز شام کو دونوں ماں بیٹیاں دلی پہنچ گئیں اور دوسرے روز ہی چھوٹی بہو صاحب نے قمر میاں کو لکھا۔ "جلدی دلی آؤ،

ضروری کام ہے۔"

قمر میاں کے پاس ان دنوں کئی اہم مقدمات تھے، اس لئے ان کا جانا ممکن نہ تھا، انھوں نے لکھا کہ "میں مارچ کے پہلے ہفتے میں آسکوں گا۔"

جب وہ آئے تو ان کو دیکھتے ہی چھمو چہک کر بولی۔ "بھائی جان! مٹھائی کھلائیے۔ آخر آپ کے لئے ہم نے دلہن ڈھونڈ ہی لی۔ بڑی پیاری سی لڑکی ہے۔"

قمر میاں حسب عادت مسکرا کر بولے۔ "خوب، تو یوں کہو، کہ تم نے ہی بھابی اماں کو بہکایا ہے اور کسی اوٹ پٹانگ صاحبزادی کو میرے گلے منڈھنے کی سوچ رہی ہو، نا، بابا معاف کرو، کسی بے وقوف لڑکی کی بے جا ناز برداری کرنے کی مجھے فرصت نہیں۔"

چھمو منہ بنا کر بولی۔ "واہ بھائی جان! بغیر دیکھے ہی آپ شاہینہ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور خواہ مخواہ انکار کر رہے ہیں۔ ایسی لڑکی تو ذرا اس زمانے میں مشکل سے ہی نظر آتی ہے۔ بڑی بڑی مخمور آنکھیں، سرخ و سپید رنگ ہے، کھنچے ہوئے ابرو، سیاہ گھنگریالے بال، پھر گریجویٹ بھی ہے اور اس کے ہاتھ کی پینٹنگ دیکھنے کے قابل ہے۔"

قمر نے ہنس کر کہا۔ "اے بس بھی کرو، یہ تم کسی اپنے افسانے کی ہیروئن کا نقشہ پیش کر رہی ہو، حالانکہ میں نے بارہا کہا ہے کہ میں بے چارہ سیدھا سادہ کاروباری انسان ہوں، مجھ سے افسانوی انداز میں بات نہ کیا کرو۔"

چھمو تنک کر بولی۔ "آخر، آپ مجھ کو جھوٹا کیوں سمجھتے ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ چل کر خود دیکھ لیجئے۔ پھر میری بات کا یقین ہوگا۔"

قمر آئے تو چھوٹی بہو صاحب غسل کر رہی تھیں، ان کے آنے کی خبر پا کر غسل خانے سے نکل کر سیدھی چھمو کے کمرے میں آئیں۔ ماں کو دیکھ کر قمر بالکل سنجیدہ

ہو گئے اور انھوں نے بیٹے کو گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر بولیں۔ "خدا کا شکر ہے، مجھے تمہارے لئے ایک اچھی لڑکی مل گئی ہے اور میں پیغام بھی دے چکی ہوں، لڑکی کے باپ روشن خیال ہیں، خاندان بہت اچھا ہے، لڑکی نک سک سے درست تعلیم یافتہ سگھڑ اور بھولی بھالی ہے، آگے تو خدا جانے، بظاہر اس میں کوئی کمی نہیں۔ تمہارے باپ تمہاری شادی کی حسرت دل میں لے کر گئے میری زندگی بھلا نہ جانے کتنے دن کی اور ہے آئے دن بیمار رہتی ہوں، دادی کو بھی تمہارا سہرا دیکھنے کا ارمان ہے۔ چھمو کے ساتھ تم کو میرٹھ بھیج دوں گی۔ لڑکی خود دیکھ لینا۔ اس کے والدین سے مل لینا۔ یقین ہے کہ تم کو میری پسند پر اعتراض نہ ہوگا۔"

قمر ماں کے سامنے سر جھکائے بیٹھے رہے، مگر جب وہ چلی گئیں، تو چھمو کا خوب مذاق اڑایا۔ میرٹھ جانے سے صاف انکار کیا۔ چھمو نے ماں سے جا کر شکایت کی۔ انھوں نے حکم دیدیا۔ "پرسوں جمعہ کی صبح کو تم کو میرٹھ جانا ہوگا۔"

چھمو بھائی سے خوب لڑی، کبھی روٹھی، کبھی ان کی خوشامد کی۔ غرضیکہ ماں اور بہن کے اصرار سے قمر مجبور ہو گئے اور چھمو نے ماں سے کہا "اگر بھائی جان کو شاہینہ پسند آجائے تو اچھا ہے کہ یہ اپنے ہاتھ سے اس کو انگوٹھی پہنا دیں۔ شادی جلدی کرنے کا ارادہ ہے تو منگنی دھوم سے کرنے اور روپیہ برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

چھوٹی بہو صاحب تو یہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح قمر دلہن بیاہ لائیں اس لئے انھوں نے صندوقچہ کھول اپنی منگنی کی بیش قیمت انگوٹھی جس میں بڑے سے خوش رنگ یاقوت کے گرد ننھے ننھے بے شمار ہیرے جگمگا رہے تھے۔ چھمو کو دے کر تاکید کی "اب شاہینہ کو انگوٹھی پہنا کر ہی واپس آنا۔"

جمعہ کی صبح یہ دونوں میرٹھ پہنچ گئے۔ سعیدہ بیگم کو تار سے اطلاع پہنچ چکی

بھی وہ ان کی منتظر تھیں، دونوں بہن بھائی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے آنے کی اطلاع سرخ کوٹھی کر دی۔ وہاں سے شام کی چائے کا بلاوا آگیا۔

چھمو بن سنور کر سعیدہ بیگم اور ان کے میاں کے ہمراہ بھائی کو ساتھ لے کر پہنچی، چبوترے پر ہی فہمیدہ بیگم نے ان کا استقبال کیا۔ ان کو اندر لے گئیں۔ چھمو نے اپنے بھائی کا تعارف سب سے کرایا۔ شاہینہ بھی ایک کونے میں آسمانی لباس زیب تن کئے دوپٹہ قرینے سے اوڑھے نظر جھکائے بیٹھی تھی۔ قمر کی وجیہہ متین صورت اور شائستہ اطوار شاہینہ کے والدین کو پسند آئے۔

چائے بہت پر تکلف تھی۔ بے شمار کھانے کی چیزیں تھیں۔ لیکن قمر کھانے کے بجائے دزدیدہ نظروں سے شاہینہ کو دیکھ رہے تھے، اور اس کے والدین قمر میاں کو جانچنے میں مصروف تھے۔

سعیدہ بیگم اور ان کے شوہر قمر کی مدح سرائی میں اور فہمیدہ بیگم سب کی خاطر مدارات میں مصروف تھیں۔ چھمو کبھی فخریہ نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھتی۔ کبھی پیار بھری نظر شاہینہ پر ڈالتی اور شاہینہ بے چاری سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی بیٹھی جھینپ رہی تھی اور ایک حیا آمیز تبسم اس کے لبلبیں پر کھل رہا تھا۔

شام کے پانچ بجے کے گئے رات کے ساڑھے آٹھ بجے یہ لوگ واپس آئے۔ مگر قمر نے اپنا دل شاہینہ کے گھنگریالے بالوں میں اٹکا ہوا چھوڑ دیا۔ اور شاہینہ نے بھی اس وجیہہ اور متین انسان کی صورت اپنے خیالوں میں بسالی۔

قمر دل میں تو چھمو کے انتخاب کی داد دے رہے تھے۔ مگر مذاق کرنے سے

اب بھی نہ چوکے۔ واپس آکر جب اس نے پوچھا "دیکھا آپ نے میری پسند لاجواب ہے؟"

تو وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ "بھئی واہ! اس چینی جاپانی شکل کی تم اتنی تعریف کر رہی تھیں۔ ناک تو دیکھو اپنی شاہینہ کی"

چھمّو بولی۔ "اونہہ، ناک ستواں نہ سہی، لیکن چپٹی تو ہرگز نہیں ہے۔ اور بھائی ہمیں تو شاہینہ بہت اچھی لگتی ہے۔ آپ تو یونہی جھوٹ موٹ برا بھلا کہہ رہے ہیں، میں نے تو اس کو اپنی بھابی بنانے کا تہیہ کر لیا"

قمر مسکرا کر خاموش ہو گئے اور سر شرید چھمو سمجھ گئی کہ یہ جان کر بنا رہے ہیں۔

دوسرے دن شام کو قمر نے شاہینہ کو انگوٹھی پہنا دی، چھمو نے ایک بڑا سا موتیا گلاب کا ہار اپنی ہونے والی بھاوج کے گلے میں ڈال کر اس کی حسین پیشانی چوم لی اور کچھ روپے اس پر سے تصدق کئے۔ اس رسم کے بعد سُرخ کوٹھی میں بہت پُر تکلف دعوت کھانے کے بعد شاداں و فرحاں سب واپس آئے اور تیسرے دن صبح ہی دلی قمر اور چھمو واپس آ گئے۔ چھوٹی بہو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ قمر کی دلہن اب آنے والی ہے اس خیال سے باغ باغ ہوئی جا رہی تھیں۔

سکندر زمانی بیگم کو چھوٹی بہو صاحب نے پیغام دینے کے بعد ہی بتایا تھا اور انھوں نے یہاں رشتہ کرنے کی منظوری بہو کو دیدی تھی۔ اس طرح چپ چپاتے منگنی ہو جانے پر انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مگر بڑی بہو صاحب بھلا کیسے خاموش رہ سکتی تھیں۔ "لو، بُوا، اور سُنو، اب منگنیاں بھی نرالے فیشن کی ہونے لگیں۔ نہ اماں گئیں نہ دادی۔ بس صاحب میم کے

ہاتھ میں خود انگوٹھی پہنادی، نہ دلہن کا منہ میٹھا کیا گیا، نہ کنبے میں مٹھائی بٹی۔ قربان کروں اس زمانے کو اور اس موئے فیشن کو۔ سارے ہندوستانی اب تو فرنگی بنے جاتے ہیں۔

بڑی بہو صاحب کی اس بے لاگ تنقید کا دیورانی نے برا مانا نہ چھمو نے۔ بلکہ چھمو تو حسبِ عادت اور بھی اپنی پیاری چچی کو چھیڑ چھیڑ کر فضیحتہ سنتی رہی، اس کو ان کے فضیحتوں میں وہ لطف آتا تھا جو کسی کو پیار بھری باتوں میں بھی نہ آتا ہوگا۔ بڑی بہو صاحب کو جب یہ محسوس ہوتا کہ چھمو جان بوجھ کر شرارت کر رہی ہے تو وہ اس پہ ایک قہر بھری نظر ڈال کر خاموش ہو جاتیں اور پھر شوخ چھمو ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ننھے بچوں کی طرح جھول جاتی اور جب تک ان کو ہنسا نہ لیتی یونہی لٹکی رہتی تھی۔

(۳۲)

چھوٹی بہو صاحب اب بڑے چاؤ سے اپنے لاڈلے بیٹے کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں، جنرل صاحب زندہ ہوتے تو نہ جانے وہ اس موقع پر کیا کچھ کرتیں لیکن مثل مشہور ہے، ہاتھی مرے جب بھی سوا لاکھ کا، ان کے پاس پہلے جیسا پیسہ نہیں رہا تھا۔ لیکن ان کا دل تو وہی تھا۔ پہلے جو کام ہزار میں کرتیں اس کے لئے سو خرچ کرنا ضروری سمجھتی تھیں۔ پہلے لڑکے کی شادی تھی نوکروں کے اور دولہا کی بہنوں، بھانجیوں، بھتیجیوں کے جوڑے تیار کرا رہی تھیں۔ دلہن کو زیور تو ان کو اپنا ہی دینا تھا، لباس دلہن کے لئے بھی تیار ہو رہے تھے۔

قمر بھی یہیں سے تھے۔ ان کے کلاس فیلو دوست فاروقی صاحب ہارڈنگ لائبریری کے سکریٹری تھے، پھوپھو بھی لائبریری کی ممبر تھی۔ لائبریری میں حسب معمول ۱۵ر مارچ کو سالانہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ فاروقی صاحب قمر میاں سے ملنے آئے تو ان کو بہت اصرار کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کے لئے کہا۔

پھوپھو بولی: "بھائی صاحب اگر پردے کا انتظام ٹھیک ہو تو میں بھی مشاعرے میں شرکت کروں گی۔ اتنے بھرے مجمع میں بیٹھنے کی نہ میری ہمت ہے، نہ بھابی اماں اس کی اجازت دیں گی۔"

فاروقی صاحب مسکرا کر بولے۔ "ارے بھائی، تم جیسی شریر لڑکیوں کو زیادہ اچھلنے کا موقعہ نہیں دینا چاہیئے۔ مگر پردے کا انتظام تو ہو گا ہی۔ تمہاری بھابی بھی تو آئیں گی، ان کے ساتھ ہی تم بیٹھ جانا۔"

پھلو نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو میں ضرور آؤں گی۔"

مشاعرے سے ایک دن قبل ہی پھلو نے اپنی دونوں چہیتی سہیلیوں نجمہ اور ناہید کو بھی مشاعرے کی دعوت دیدی۔ نجمہ تو خیر معقول اور سنجیدہ تھی لیکن ناہید شوخی اور شرارت میں پھلو کی بھی استانی تھی۔ بچلا اس سے بیٹھا ہی نہیں جاتا تھا لڑکی تھی کہ شعلہ جوالہ۔ جہاں بھی جاتی رنگین تیتری کی مانند ناچتی تھرکتی پھرتی اور اس کی لطیفہ بنجیاں محفل کو زعفران زار بنائے رکھتی تھیں۔ ناہید شادی شدہ تھی اور پچھلے سال اس کی گود میں پھول سا بچہ بھی آ گیا تھا۔ مگر اس کی صورت پر غضب کی دوشیزگی اور بھولپن تھا۔ شوخ چنچل ناہید اپنی دلربا صورت اور دلنشین اداؤں کی وجہ سے شادی شدہ خاتون نہیں بلکہ کنواری لگتی تھی، جدھر بھی جاتی خوشیاں بکھیر دیتی اور روتوں کو ہنسا دیتی تھی۔ شعر و ادب کا شوق ناہید کو بھی کافی تھا۔ اس لئے جب بھی وہ اور پھلو مل بیٹھتیں تو اس دور کے مشہور شعراء کی شامت آ جاتی، یہ دونوں ہر ایک کے کلام کی پیروڈی کرتیں پڑھنے کے انداز کی نقل اتارتیں، اور شاعری پر مزاحیہ انداز میں تنقید بھی کی جاتی۔

نجمہ اور ناہید جب مشاعرے میں جانے کے لئے پھلو کے یہاں پہنچیں تو وہ ان دونوں کے دیر کرنے کی وجہ سے کافی جھنجلائی ہوئی تھی اور برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ تنک کر بولی "اری کمبختو، اتنی دیر کر دی، ساڑھے آٹھ کا بلاوا تھا، اب تو نو بج رہے ہیں۔

ناہید نے گلے میں ہاتھ ڈال کر دلربایانہ انداز سے کہا۔" تو، چلو خفا نہ ہو، غصہ تھوک دو۔ اس آئی سی ایس کی پھپھتی نے اپنے سنگار پٹار میں اتنی دیر لگادی، ورنہ میں تو پہلے ہی آجاتی۔"

نجمہ نے مسکرا کر کہا۔" چل، جھوٹی! میں تو ٹھیک، آٹھ بجے تجھ کو لینے پہنچ گئی تھی۔"

ناہید آنکھ مار کر بولی۔" اے، چپ بھی رہ، میری ہی خطا سہی، لیکن اب لڑتے رہنے سے کیا فائدہ؟ چلنا چاہیئے۔"

یہ تینوں پہنچیں تو مشاعرہ کچھ دیر پہلے شروع ہو چکا تھا۔ فاروقی صاحب نے ان کو خود لے جا کر اونٹوں کے پیچھے بٹھا دیا۔ ان کی بیوی بچے کی طبیعت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے نہ آسکی تھیں۔ اس لئے مزے سے یہ گاؤ تکیے کے سہارے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ ابھی مبتدی شعرا پڑھ رہے تھے اور یہاں ان تینوں ہی کا راج تھا، اس لئے آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ ناہید نے ڈبیہ کھول کر ایک بڑی سی گلوری کلے میں دبالی۔ اور ادھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگی۔ ایک دم اچھل کر بولی۔" اری چھمو! ایک بڑے میاں اب میکرو فون کے سامنے آئے ہیں۔ مگر ہیں، شوقین مزاج! اس بڑھاپے میں بھی جامہ وار کی شیروانی ڈانٹ رکھی ہے"

فاروقی صاحب نے اعلان کیا۔" اب جناب نیاز دہلوی اپنا کلام سنائیں گے"

شاعر کی لرزتی ہوئی آواز سن کر بھلا ناہید کیسے چپکی بیٹھی رہ سکتی تھی۔ چھمو کے دھپ مار کر بولی۔" اری کمبخت، یہ بے چارا بڈھا تیرے لئے شاعری کرتا کرتا مرا جاتا ہے اور تجھ پہ خاک اثر نہیں ہوتا۔ ہائے عشق بھی بڑی ظالم چیز ہے اس عمر میں غریب کو پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔" شعر میں اتفاقیہ مضمون کا آنا تھا کہ ناہید نے اچھل کر کہا۔" او چھمو کی بچی، اس بے حیا بڈھے کو مار کہ تجھے

کیا ملے گا۔ کیوں تو اس کی جان کی دشمن ہوئی ہے۔ ایسے چاہنے والے تو اس زمانے میں مل بھی نہیں سکتے۔ اب تو سب نگوڑ مارے فرنگی بن گئے ہیں۔ اور کسی جوان کو مارتی تو بات بھی تھی، یہ بے چارا تو خود ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔"

چھمو ہنس کر بولی۔ "ہشت نامعقول! کیوں بے کار بک بک کر رہی ہے۔ خواہ مخواہ بے چارے بڑے میاں کو میرے سر تھوپے دے رہی ہے۔ یہ تو تجھ پر ہی فدا معلوم ہوتے ہیں۔ تو ہی آنچل لٹکائے مٹکتی ہوئی آئی تھی۔"

ناہید بولی۔ "خیر، یہ تو مذاق ہے مگر وہ تین من کا جنادر تو تو نے گرا ہی لیا۔ اور ایسا ویسا بھی نہیں، آئی۔ سی۔ ایس ہے۔"

نجمہ نے چونک کر کہا۔ "اے ناہید، یہ کیا قصہ ہے؟ مجھے بھی بتاؤ، چھمو تو ایسی گھنی ہے کہ اپنی کسی بات کی ہوا بھی نہیں دیتی۔ کون آئی سی ایس ہے یہ؟"

چھمو نے ہنس کر کہا۔ "تم مطمئن رہو، بنّو! تمہارے میاں کا ذکر نہیں ہے اور ناہید تو ہمیشہ کی جھوٹی ہے یونہی واہی تواہی بکتی رہتی ہے۔"

ناہید شوخ لہجے میں۔ "اے ہے، سچ کہنا دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں، اور بیچاری ایسی بھولی بنی جاتی ہیں جیسے ابھی انڈا کھٹک کر نکلی ہیں، اور نجمہ تم کو تو کیا کہوں، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو اور پھر بھی نہیں سمجھیں۔ اے قمر بھائی کی سالگرہ والے دن، ان کے وہ موٹے آئی سی ایس دوست اس کے ارد گرد پھر رہے تھے کہ نہیں۔ جس کو دیکھ کر میں نے تم سے کہا تھا، یہ آدمی ہے یا انجن ــــ"

نجمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہا۔ "مجھے کیا خبر؟ کہ چھمو کی نیت اتنی خراب ہے کہ اس انجن کو ہی پسند کر لیا۔"

چھمو نے بگڑ کر کہا۔ "نیت خراب ہو میرے دشمنوں کی، تم تو بیوقوف ہو، جو اس نالائق کی جھوٹی باتوں پر یقین کر لیتی ہو، وہ بھائی جان کے دوست ہیں، اس لئے ان کی خاطر کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کی تو کترنی موقع بے موقع چلے ہی جاتی ہے، ہماری باتیں کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا؟"

ناہید چٹکی بجا کر بولی۔ "خیر، بی بی بنو اور کسی کو تو کیا غرض کہ مشاعرہ چھوڑ کر ہماری باتیں سُنے۔ ہاں یہ کہو، کہ تم یہ نہیں چاہتیں کہ تمہارے کرتوت نجمہ بھی جان لے۔ ادیب اور شاعر تو تمہارے ہیں ہی، اور ایک آئی سی ایس کو بھی اپنے پیچھے لگا لیا۔"

چھمو کو ناہید کی اس دھاندلی بازی پر واقعی غصہ آگیا اور وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "خدا غارت کرے مجھ نامراد کو۔ اگر میں نے کبھی سیدھے منہ اس آئی سی ایس سے بات بھی کی ہو۔"

اور ناہید نے لمبی سی آہ لے کر کہا۔ "ہائے ہائے یہی تو مار رکھنے کی ادائیں ہیں۔ اس اندازِ تغافل پر ہی تو بہت سے نگوڑے جان دیتے ہیں۔"

چھمو نے ناہید کی جانب سے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔ "اونہہ، کون تیرے منہ لگے۔ تجھ پر تو اس وقت شیطان سوار ہے۔ ناحق جھوٹ طوفان اُٹھا رہی ہے۔"

چونکہ اب اچھے شعراء پڑھ رہے تھے، لہٰذا ان تینوں نے دلچسپی سے سننا شروع کر دیا۔

ایک کالے رنگ کے خوتق صورت شاعر کو مائیکروفون کے سامنے دیکھ کر ناہید نے کہا۔ "اے یہ شاعر ہے، یا چرکٹا۔"

لیکن جب اس کی آواز ہال میں گونجی اور پہلے ہی شعر پر واہ واہ کا شور مچ گیا تو چھمو نے کہا۔ "خیر صورت تو اللہ کی بنائی ہے، مگر یہ شاعر

ہے، اچھا!"

نجمہ نے کہا۔ "لیکن پڑھنے میں لرزتا اس طرح ہے، جیسے لرزے سے بخار اس کو چڑھ رہا ہو، شاعروں کے بھی کیا کیا انداز ہوتے ہیں۔"

اب جو شاعر سامنے آیا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے، آنکھوں کے سرخ ڈورے یہ ظاہر کرتے تھے جیسے ابھی پی کر آیا ہے۔

چھمو نے ہنس کر کہا۔ "لے وہ گرلز کالج کی لاری آگئی۔"

ناہید نے جھانک کر فقرہ چست کیا۔ "موا، قینچی کہیں کا۔ معلوم ہوتا ہے نگوڑے نے منہ بھی صبح نہیں دھویا۔"

نجمہ پھر بولی۔ "لے ہے سننے بھی دو، تم دونوں نے تو آفت مچا رکھی ہے۔"

شاعر باریک سی آواز میں لہرایا۔ اور ناہید نے تال دینی شروع کی چھمو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی، پھر جو پردے سے باہر نظر ڈالی تو میکروفون کے سامنے ایک دبلا پتلا لمبوترے چہرے کا انسان کھڑا تھا، اس کے سر کے آگے پیچھے کے بال اڑے ہوئے تھے، ناہید نے کہا۔

"لے لو چھمو وہ اپنا دمڑی خان آگیا۔"

چھمو بولی۔ "اپنا" کی تعریف ذرا کھل کر بیان کرو میں آج ہی تمہارے والے کو تعزیت کا لوکل تار بھیج دوں گی۔"

ناہید منہ چڑا کر بولی۔ "اوہو مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ تم اور ہم کو بناؤ، اوئے چلو، جلتی کیوں ہو، ہمیں اس سے دلی محبت ہے یہ تو بالکل اسی طرح پڑھتا ہے جیسے ہمارا بوڑھا دربان خدا بخشے، آواز لگاتا تھا۔" بوا

سواری اتروا ــــــــ لو"

نجمہ اور چھمو ناہید کے منہ بنانے اور نقل اتارنے پر بمشکل اپنی ہنسی کو روک سکیں۔ شاعر نے سوز میں ڈوبی ہوئی دھیمی آواز سے کہا ع

اب ایسی شکستہ کشتی پہ ساحل کی تمنا کون کرے

ناہید نے تکونا منہ بنا کر زیر لب کہا "ارے میرے شاعر، کوئی فکر نہ کر، ٹوٹی ہوئی کشتی پر چلا آ، ساحل پر میں تیری منتظر رہوں گی؟"

چھمو کو پھر ہنسی آگئی۔ اور روکنے کی وجہ سے اس کو اچھو ہو گیا، جب وہ سنبھلی تو اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ناہید بہت سنجیدہ بنی بیٹھی ہے، اس کی شرارت اور شگفتگی ایک دم کافور ہو گئی۔ صورت حال کی اس تبدیلی پر وجہ معلوم کرنے کے لئے چھمو نے نظری سے دیکھا۔ ایک نزار و نزار جسم کا سانولے رنگ کا شاعر سامنے کھڑا تھا۔ اس کی صورت پر وحشت برس رہی تھی اور حیران نگاہیں کچھ اس طرح بے چین تھیں جیسے کسی کو پانے کے لئے مضطرب ہوں۔ ایک دم ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ پبلک اپنے نوجوان محبوب شاعر کو خراج عقیدت پیش کر رہی تھی۔ اب چھمو کی باری تھی۔ اس نے ناہید کے چٹکی لے کر کہا "اوہو بڑی معقول بن بیٹھیں۔" ذرا اپنے مجنوں پر ایک نظر تو ڈال لو؟"

ناہید تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ "چل، بک نہیں، منہ توڑ دونگی، تیرا۔ آئی لیلے مجنوں کی سگی کہیں سے؟"

مگر یہ واقعہ تھا کہ اس شاعر کی دلآویز رنگین نظمیں ناہید کے دلربا حسن کا ایک دلکش مرقع تھیں اور اس کا دیوان ایک حسین بتکدہ تھا جس میں ناہید ہی جلوہ ہر طرف نظر آتا تھا۔

شاعر اب جھوم جھوم کر اپنی نظم سنا رہا تھا۔ ع

ایک صیادِ خوش اندام سوادِ مشرق

چھو ہر شعر پر سخن اسمہ بنا کر ناہید کی آنکھوں میں جھانکتی' اور اس کو گدگداتی، وہ اس وقت اپنی ساری شوخی بھول کر بڑی طرح جھینپ رہی تھیں، کھسیانی ہو رہی تھی، اس کے حسین عارض شرم و خفت کے ملے جلے جذبے سے گلابی ہو رہے تھے، نظم کافی طویل تھی۔ مگر سب پر شاعر کی مدھ بھری آواز اور کلام کی دل کشی نے جادو سا کر دیا تھا۔ جب وہ مسکراتا ہوا اسٹیج سے اتر آیا۔ تو سب کو ہوش آیا۔ اور بہت دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

اب نواب سراج الدین خاں سائل اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سائل کو دلی میں کون نہیں جانتا۔ ایک زمانہ تھا کہ اپنی شاندار وجیہ شخصیت اور دلپذیر ترنم کے باعث مشاعروں کی جان سائل صاحب بن جاتے تھے اور شعر پڑھتے ہوئے مجسم شعر لگتے تھے، مگر اب ان کا بڑھاپا تھا۔ ایک سال پہلے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، اس لئے کہیں آنے جانے کے لائق نہ تھے، مگر پرانی وضع کے لوگوں کی عادت تھی کہ جان جائے پر آن نہ جائے۔

سکریٹری ہارڈنگ لائبریری ان کے عزیز دوست کے بیٹے تھے، پھر بھلا وہ ان سے کیسے انکار کرتے، فاروقی صاحب سائل صاحب کو جا کر خود لائے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جہان آباد کا یہ آخری شاعر جو غالب، داغ و میر کی یادگار اور چراغِ سحری ہے اس مشاعرے میں ضرور شریک ہو، باوجود اس بڑھاپے اور نقاہت کے سائل صاحب کی آواز کی دلکشی اب بھی دلوں کو کھینچ رہی تھی اور دلپذیر ترنم کانوں میں رس ٹپکا رہا تھا۔ انھوں نے مقطع حسبِ حال فرمایا ؎

پکڑ لائے سائل کو بزمِ سخن میں
بنی اس کے دم پر یہاں آتے آتے

چھمو اور ناہید دونوں دم بخود بیٹھی سنتی رہیں۔ اس سرزمین شعر و ادب اور مرکز زبان و بیان کا یہ بہترین شاہکار جو آج ان کے سامنے تھا خدا جانے ہوا کا کونسا جھونکا کل اس ٹمٹماتے چراغ کو بھی گل کر دے۔ یہ خیال ان کو بھی افسردہ کئے دیتا تھا۔ اس لئے سائل صاحب کے پڑھ لینے کے بعد دو اور شاعروں نے پڑھا لیکن نہ ناہید نے فقرہ چست کیا نہ چھمو بولی۔ لیکن جیسے ہی ایک گھنگریالے بالوں والے گندمی رنگ کے نوجوان شاعر کو اسٹیج کی طرف ناہید نے آتے دیکھا، چھمو کے دھپ مار کر بولی۔ "لو، وہ تمہارا منظورِ نظر بھی آ ہی گیا۔"

چھمو نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے اس سے کب انکار ہے؟ اس کا کلام بھی مجھے پسند ہے اور پڑھنے کا دلنشیں انداز بھی، داد کی پرواہ کئے بغیر اس طرح اپنے شعر سناتا ہے کہ خود ان میں گم ہو جاتا ہے، اچھا شاعر تو خیر ہے ہی، مگر شائستہ انسان بھی ہے، صورت بھی چڑی ماروں کی سی نہیں۔"

ناہید — "لے ہاں، اس میں تو سب خوبیاں ہیں ہی۔ کیونکہ آپ اس کو پسند فرماتی ہیں۔"

چھمو نے مسکرا کر کہا۔ "کہ خیر میری تمہاری طرح چور ذہنیت نہیں ہے کہ میں بلا وجہ شرماؤں۔ ہر بڑے فن کار کے فنی کمالات کا اعتراف کرنا میری عادت ہے، اور شعر و ادب سے مجھے والہانہ محبت ہے، اس لئے ہر اچھا شاعر مجھے اچھا لگتا ہے۔ غالب بھی تو میرا محبوب شاعر ہے۔"

نجمہ نے تنک کر کہا۔ "اری نامعقولو! سننے بھی دوگی یا نہیں، بے کار بک بک کر کے مغز چاٹ لیا۔"

ناہید کچھ بولنے والی ہی تھی کہ شاعر نے اس طرح اپنی نظم سنانی شروع کی۔

جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو، لیکن کلام کی پختگی اور دلآویزی نے داد حاضرین سے لے ہی لی اور غنیمت ہے کہ ناہید اور چھوٹے بھی خاموشی سے سن لیا۔

اب جو شاعر میکروفون کے سامنے آیا اس کے چہرے پر ایک حزنیہ کیفیت چھائی ہوئی تھی، سفید پتلون اور قمیص میں اکہرے جسم کا یہ شرمیلا سا نوجوان شاعر سے زیادہ کسی کالج کا طالب علم معلوم ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر چھوٹے نے کہا۔ "ارے ناہید، وہ تاج محل والا آ گیا۔"

پبلک نے بھی شاعر کو دیکھتے ہی آواز لگائی۔ "تاج محل" اور شاعر کی مغموم آواز میکروفون پر آئی۔

"مری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھسے"

ناہید نے تنقید کی۔ "تو کیا مرگھٹ پر ملا کرے؟"

شاعر جلدی جلدی اپنی نظم پوری کر کے بیٹھ گیا۔ اب ایک گہرے سانولے رنگ کا دبلا پتلا شاعر سامنے آیا اور اس کو دیکھتے ہی ہال میں تالیاں بہت زور سے بجیں، شاعر مسکرانے لگا۔ اس کی دلنشیں آواز ہال میں گونجی۔ ع

"میرے غمخانے میں بجنے لگی شہنائی سی"

ناہید اور چھوٹے دونوں کا ہی یہ پسندیدہ شاعر تھا، اس لئے انھوں نے پوری دلچسپی سے اس کا کلام سُنا اور کوئی شرارت نہیں کی۔

اس کے بعد ایک سانولی سلونی صورت کا لڑکا براق سفید کھدر کا کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے اسٹیج پر آ گیا۔ میکروفون کے سامنے پہنچ کر اس نے اپنے لانبے بالوں کو پیچھے جھٹک دیا۔ ناہید جلدی سے بولی "لے، آئی، سی، ایس والی کا وہ تیرا پجاری بھی آ گیا۔"

نجمہ نے کہا "ہشت، میرا تو وہ چھوٹا بھائی ہے تیرا ہی پجاری ہو گا۔"

ناہید نے مسخرا منھ بنا کر کہا۔ "دیکھے ہیں، ایسے بہت بھائی"۔

شاعر گھونسہ تان کر بلند آواز سے رجزیہ انداز میں اپنا کلام سنا رہا تھا۔ ایک دم جو وہ کڑکا تو شریر ناہید اچھل کر بولی۔ "اری نجمہ سنبھال اپنے کوڑیالے کو، آج تو یہ بہت بپھر رہا ہے کہیں کسی اور آفت کی ماری کو نہ ڈس لے"۔

چھمو، ناہید کی اس فقرہ بازی پر بے ساختہ ہنس دی اور نجمہ نے بگڑ کر کہا۔ "چپ بھی رہ، کیوں خواہ مخواہ اول فول بک رہی ہے"۔

جیسے ہی اسٹیج پر کالی شیروانی زیب تن کئے ایک خوش وضع شاعر آیا، ناہید آنکھیں نچا کر بولی،۔ "لے چھمو، مبارک ہو، وہ تمہارے عاشق زار تشریف لے آئے"۔

چھمو نے منھ بنا کر کہا۔ "حد ہے، ناہید! تمہاری لغو بیانی کی بھی، بڑی بے ہودہ ہو، تم ——"

ناہید نے اٹھلا کر کہا۔ "لو بنو اتنا برا کیوں مان رہی ہو، کیا یہ جھوٹ ہے کہ تمہارے نازِ بے جا کا یہ شکوہ سچ نہیں ہے، حد ہے تغافل شعاری کی، گھنٹوں غریب لمبی لمبی نظمیں سنا کر اپنا گلا خشک کرتا ہے اور تم اتنی سنگدل کہ اس کان سنا اس کان اڑا دیا"۔

چھمو نے چڑ کر کہا: "تم کیا، اس کی رازدار ہو"۔

ناہید شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔ "خیر، مجھے بیچاری کو رازداری کا فخر تو حاصل نہیں مگر آخر زمانہ تو دیکھا ہی ہے۔ کوئی دھوپ میں تو بال سفید نہیں کئے۔ تم جیسی لڑکیوں کو خوب سمجھتی ہوں"۔

چھمو، ناہید کے ساون کی گھٹاؤں کی طرح کالے بالوں کو ہاتھ میں

لے کر بولی۔ "اری کم بخت، کیوں دادی اماں بن رہی ہے اور تو کیا کہوں بس خدا تجھ کو نیکی دے؟"

نجمہ نے کہا: "ہاں بھائی پھمو، یہاں تو مجھے بھی کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے، یہ شاعر تم سے بہت بُری طرح مرعوب ہے۔"

پھمو نے جھینپ کر کہا: "واہ، نجمہ، تم بھی اس بیہودہ کی باتوں میں آگئیں۔ جانتی تو ہو کہ یہ حضرت فخری کے دوست ہیں، ان کے ہمراہ اکثر آتے تھے، اس لئے اب بھی آتے رہتے ہیں۔ ہاں، ناہید کی مہربانی ان کے حال پر کچھ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت ان کے اشعار پر جھومتی ہے، اس مرتبہ یہاں آئے تو اس کے گھر بھیج دوں گی۔"

ناہید چمک کر بولی۔ "شاعروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنی تم کو ہی مبارک ہو، مجھے بخشو، اس نگوڑی قوم سے میں بہت ڈرتی ہوں، ایک موا مرنا جوگی خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ دنیا بھر میں مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے۔ میرا مردوا بہت شکی ہے، تمہارا کچھ نہیں جائے گا، میاں ناک چوٹی کاٹ مجھے گھر سے نکال دے گا۔"

ناہید کی ایکٹنگ پر نجمہ اور پھمو مسکرانے لگیں اور پھر نجمہ نے کہا۔ "اے بی پھمو! فخری بھائی لندن سے کب واپس آ رہے ہیں؟"

پھمو نے لجا کر جواب دیا: "غالباً ایک سال بعد۔" اور اس کے تصور میں دو شربتی آنکھیں عینک کے شیشوں سے جھانکنے لگیں۔

ناہید مٹک کر بولی: "یوں تو بی بی بنو بنتی ہیں بہت عقلمند، اور ان کو پسند آیا وہ موا ہکلا۔"

پھمو نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "مجھے تو تمہارے میاں پسند تھے مگر ان

پر تو تمہارا جادو چل گیا۔ اس لئے جو انسان بھی سامنے آگیا اس کو مجبوراً پسند کر لیا۔

ناہید منہ چڑا کر بولی۔" اے ہے، بیچاری بڑی سیدھی اور بھولی میرا میاں حاضر ہے شوق سے بدل لو، مگر کہے دیتی ہوں کہ ایک دن بھی تو اس ٹیڑھے مزاج کے انسان سے تمہارا گزر نہ ہوگا۔ میں فائدے میں رہوں گی، اس مٹی کے مادھو کو خوب بے وقوف بناؤں گی۔"

شاعر نے ٹوپی اتار کر رکھی، پانی پیا۔ بیاض کھول کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور گنگنانے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے گونجتی گاتی ہوئی آواز میں کہا:

"نہ پھوٹ پھوٹ کے رو لوٹ آؤں گا اک دن"

صغریٰ ناہید رومال سے چپکو کے آنسو جھوٹ موٹ پونچھنے لگی، نظم بہت لمبی تھی۔ لیکن دلآویز اور "رنگین کلام" میٹھا ہوا۔ ترنم، پھر شاعر کا پینترے بدل کر محفل پر چھا جانے والا انداز ـــــــ"

مشاعرہ اب اپنی دلکشی کے پورے عروج پر تھا۔ شعر کی دیوی نے اپنے دلربا حسن سے سامعین کو مبہوت کر دیا تھا۔

اب اسٹیج پر وہ شاعر کھڑا تھا جو ہندوستان گیر شہرت کا مالک ہے پبلک نے آواز لگائی "مغنیہ" ـــ شاعر کچھ دیر اکڑا کھڑا، مسخری صورت بنائے مسکراتا رہا۔ پھر اس کا رسیلا ترنم، دلکش آواز اور مدھر گیت نشہ بن کر فضا پر چھا گیا، لوگوں نے بار بار تالیاں بجا کر اس کو داد دی۔ گیت کے بعد اس نے سامعین کی فرمائش پر اپنی وجد آفریں نظم "مغنیہ" بھی سنائی اور خوب داد پائی۔

ناہید نے اوٹ سے جھانک کر کہا۔" لو، یہ آگیا، موا بونا۔ رنگ

بزنگی آوازیں نکالنے۔

نجمہ نے کہا۔ "حد ہو گئی، ناہید تمہاری بدمذاقی کی۔ بھلا تم شاعر کو بھانڈ بنا دینا کیوں چاہتی ہو، جو گا کر پڑھے وہی تمہارے خیال میں اچھا شاعر ہے۔ اس کے قد پر نہ جاؤ۔ شاعر اونچے درجے کا ہے۔"

چھمو نے کہا۔ "کلام تو واقعی اس کا پختہ ہے مگر کم بخت پڑھتا اس طرح ہے کہ اچھے شعروں کی بڑی گت بن جاتی ہے۔"

ناہید۔ اب دیکھ لو، نا، نجمہ، اپنے اس چہیتے شاعر کو۔ کچھ ایسا دہشت زدہ سا ہے جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول گیا ہو۔"

شاعر نے لہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ع

"کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے"

اور چھمو نے برجستہ کہا۔ "ارے کملی شاعر، یہ ناہید جھانک رہی ہے" اور ناہید کھلتی کلی کی طرح مسکرا کر بولی۔ "ہشت! اسے میں کیوں جھانکنے لگی۔ ہوگی کوئی بڑ گدستلے کی یا پیپل والی۔"

لیکن نظم کی دلکشی اور والہانہ انداز کلام نے آخر ان دونوں کو خاموش کر دیا اور یہ سکوت ٹوٹا تو ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اب جمالیات کا مجسم روپ کا شاعر سامنے تھا۔ بال پریشان تھے، لباس صاف تھا۔ لیکن کچھ بے ترتیب سا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی، اور انداز مدہوشی کے۔ لیکن اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھما کر اور سر مٹکا کر ہاتھوں کے اشارے سے اس نے ایک بہت اچھی رباعی نہایت بھونڈی آواز سے سنائی تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک دلربا حسن کی تصویر سامنے آگئی۔ پبلک نے جھوم کر داد دی تو چھمو نے کہا۔ "بھئی واہ، اچھا کلام خواہ کیسی ہی بری آواز سے پڑھا جائے دل پر اثر کرتا ہے، کیا کہنے ہیں ظالم نے

غضب کی عکاسی کی ہے۔"

چندا اور رباعیات سُنا کر اور شعر و شاعری سے مسحور کر کے وہ ہٹا تو شاعرِ انقلاب سامنے آ گئے، وہ حسبِ معمول ایسی کڑکتی گونجتی آواز میں اپنا کلام سنا رہے تھے جیسے کوئی جنرل فوج کو لڑائی کا حکم دے رہا ہو۔ ان کے بعد شہنشاہِ تغزل نے دلپذیر ترنّم اور دلکش انداز سے دو غزلیں سُنائیں۔ جوشؔ اور جگرؔ کا احترام غنیمت ہے ناہید اور جھمپو دونوں کرتی تھیں اس لئے کوئی فقرہ چست نہیں کیا۔ سعادت مند بنی خاموش بیٹھی سنتی رہیں۔

رات کے دو بجے یہ یادگار مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ جھمپوؔ، مسرور، شاداں رنگین اور دلآویز خیالوں میں کھوئی ہوئی، ہر شاعر کے اچھے شعر کو گنگناتی واپس ہولی۔

عذرا اپنی شادی کی پانچویں سالگرہ بھی منا چکی تھی، مگر منور دلہن کی یہ آرزو کہ اس کی گود بھر جائے، ہنوز تشنۂ تکمیل رہی تھی۔ حالانکہ جب بھی وہ دلی آتی منور دلہن اس کا خاندانی دائی سے علاج بھی کراتیں اور گنڈے تعویذ بھی اولاد کے لئے پہناتی تھیں۔ ہر پیر ولی کے مزار پر انھوں نے منتیں بھی مانیں، اور ٹونے ٹوٹکے بھی کئے مگر بچہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

مسرت کے یہاں بچہ ہونے کے بعد سے ان کے دل کو اور بھی لگن سی لگی تھی کہ عذرا کے یہاں بھی خوشی ہو، مگر مسرت کے یہاں تو خدا جانے کیسے شادی کے دو سال بعد ہی ولادت ہو گئی۔ بیچاری شریف اور سادہ دل عذرا کیسے چالاک اور فریب کار مسرت کی طرح نواب کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی۔

قدرت کو مسرت کی یہ زبردستی کی دھونس بالکل پسند نہیں آئی، اس کے یہاں اٹھوانسہ بچہ ہوا اور ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی ختم ہو گیا۔ لیکن اس بچے کی ماں بن کر مسرت نے اپنی وقعت میاں کی نظروں میں بہت کر لی تھی، اس کی ماں اور بڑی بہن اکثر اب سورج گڑھ ہی رہتی تھیں اور دیکھو بھالی ایسے

سکول کے بورڈنگ میں تھا جہاں صرف نوابوں اور راجاؤں کے لڑکے پڑھتے ہیں۔

مسرت نے بہت دن تک یہ سلسلہ رکھا کہ جب بھی کوئی بات اپنی نواب سے منوانا چاہتی تو بچے کو یاد کر کے رونا شروع کر دیتی۔

نواب افسردہ بیوی کا دل بہلانے کی خاطر جو وہ کہتی کرتے تھے، اس طرح ڈھونگ رچا کر وہ من مانی کرتی رہتی، بیچاری عذرا اس کی حرکات دیکھکر اور نواب کی نازبرداریوں پر دل ہی دل میں کڑھتی۔ مگر کچھ کہنے کا موقعہ نہ تھا۔ انجوبی کے سورج گڑھ سے جانے کے بعد داماد بیٹی کے بلاوے پر منور دلہن بھی کرمی گزارنے سورج گڑھ چلی گئیں۔ دو مہینے رہ کر انھوں نے مسرت کا رنگ دیکھا اور سمجھ گئیں کہ اپنی چالاکی سے اس طرار لڑکی نے نواب کو بیوقوف بنا رکھا ہے قدرت نے مسرت کو اچھی صورت بھی دی تھی اور سوجھ بوجھ بھی۔ اپنی اسی ذہانت کی بدولت وہ اب نواب پر حکومت کر رہی تھی۔ سورج گڑھ میں ان دنوں اس کی طوطی بول رہی تھی۔

منور دلہن نے اپنی واپسی سے پہلے نواب سے کہا: "عذرا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کو آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے۔ ڈاکٹری علاج سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ میں دلی میں اس کا یونانی علاج کرا دوں گی۔ ایک مہینے کے لئے جانے کی اجازت دیدیں۔"

نواب نے بھی عذرا کو مضمحل سا پاکر کہہ دیا: "ہاں، آپ ضرور ان کو لیجائیں۔"

منور دلہن بڑی سمجھدار تھیں، مسرت سے بہت گھل مل کر رہتی تھیں۔ اس سے بھی انھوں نے دلی چلنے کے لئے کہا۔ اور وہ جھٹ پٹ تیار ہو گئی۔ شادی کے بعد صرف ایک مرتبہ ہی چند دن کے لئے وہ انجوبی کے ساتھ دلی گئی تھی، بھلا وہ جانا بھی کوئی جانا تھا کہ ہر وقت ان کی نظریں دیکھنی پڑتی تھیں۔ نواب دانتی

مسرت کو دل سے چاہتے تھے، اس لئے اس کی مفارقت ان کو گوارا نہ تھی، مگر اس کو اب دلی کی دلچسپیاں یاد آگئی تھیں۔ اس نے رو دھو کر اجازت میاں سے لے ہی لی۔ ماں بہن بھی اس کے ساتھ دلی آئیں، مگر وہ اپنے میکے کے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں جو شہر کے گنجان محلے میں تھا اب بھلا کیسے رہ سکتی تھی، اس لئے منور مرزا کے یہاں ہی ٹھہری۔

تمام رشتہ دار خواتین اور ماں بہن ملنے کے لئے آتی رہتی تھیں، منور دلہن بہ خندہ پیشانی ان سب کی تواضع کرتیں۔ چچا زاد بھائی بھی روزانہ شام کو آتا اور اکثر رات کے کھانے کے بعد واپس جاتا تھا۔ منور دلہن تو اڑتی چڑیا کے پر گننے والی اور ایسے موقع کی تاک میں ہی تھیں۔ انھوں نے اس اہلکار سے جو سورج گڑھ سے دونوں بیگموں کے ساتھ آیا تھا۔ کہہ دیا۔ "بھئی، کچھ اونچ نیچ نہ ہو، اور نواب مجھ سے شکوہ نہ کریں، میرا رشتہ بہت نازک ہے۔ مسرت کا رنگ ڈھنگ کچھ عجب ہے، ان کے چچا کا بیٹا آتا ہے تو رات گئے جاتا ہے تم روک تھام کرو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

اہلکار نے اب مسرت اور اس لڑکے پر نظر رکھی، آخر ایک چاندنی رات میں ان دونوں کو تنہا باغ کی روشوں پر گلے میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے دیکھ لیا، اور نواب کو اس کی اطلاع کر دی، وہاں سے ارجنٹ تار مسرت کے نام بلاوے کا آگیا۔ اس کو یہاں آئے ابھی مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا، اور اپنے نئے رومان میں وہ اتنی مگن تھی، نہ میاں کا خوف تھا نہ ریاستی جاہ و حشم کا خیال۔ مگر نواب کی طلبی ایسی نہ تھی کہ وہ ٹال سکتی۔ مجبوری اس کو سورج گڑھ جانا پڑا وہاں پہنچتے ہی نواب نے مسرت کو اتنا مارا کہ تین دن پلنگ سے نہ اٹھ سکی۔ پھر اس کو نظر بند کر دیا۔ اور ماں کو لکھوا دیا" پچاس روپے ماہوار

آپ کو دلی میں لٹا رہے گا۔ سورج گڑھ آپ کو آنے کی ضرورت نہیں۔"

خط بھی جو ماں بہن کے آتے وہ نواب دیکھ کر مسرت کو دے دیتے تھے۔

منور دلہن کی خدا نے سن لی تھی۔ انجو بی میکے جا بیٹھی تھیں۔ اور مسرت اپنے کرتوت کے باعث نواب کی نظروں سے گر گئی، اس لئے اب عذرا ہی ان کی چہیتی بیوی بنی ہوئی تھیں۔ وہ ہر وقت "اجن اجن" کرتے رہتے تھے۔

انجو بی نے چھوٹے دیور جمشید کی منگنی عظمیٰ کی شادی کے ساتھ ہی ساتھ ملکہ جہاں بیگم کی نواسی نور جہاں سے کر دی تھی۔ لیکن جمشید نے ولایت سے آنے کے بعد پینا شروع کر دیا اور رنگ رلیاں بھی خوب منائیں۔ اس کی خبر ملکہ جہاں بیگم کو پہنچ گئی۔ نواب کی دو شادیاں کرنے سے بھی وہ گھبرا گئی تھیں، انہیں ڈر تھا کہ کہیں چھوٹا بھائی بھی بڑے کے نقش قدم پر نہ چلے اس لئے انھوں نے انجو بی سے کہا۔ "بی بی، سورج گڑھ والوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ میں تو نور جہاں کی شادی اب جب کروں گی جب اس کے لئے تم کوٹھی دلی میں بنوا دو گی۔"

انجو بی نے ہر طرح ان کو اطمینان دلایا۔ نواب نے بھی خط بھیجے جمشید نے خود آ کر بہت منت سماجت کی۔ مگر وہ بہت جہاندیدہ بیوی تھیں۔ انھوں نے صاف کہدیا۔ "بس اب تو شادی نور جہاں کی کوٹھی بن جانے پر ہی ہو سکتی ہے۔"

بھلا نواب کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بیکار دلی میں کوٹھی خریدنے کے لئے اپنا روپیہ صرف کرتے۔ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ ملکہ جہاں بیگم نے جلد ہی دلی کے ایک خاندانی اعلیٰ تعلیم یافتہ برسر روزگار نوجوان سے اپنی نواسی کی شادی کر دی۔ جمشید ابھی تک آس لگائے بیٹھا تھا۔ جب نور جہاں کی شادی ہونے کی خبر اس کو ملی تو کئی دن تک روتا رہا اور ہر وقت مضمحل سا رہنے لگا۔

نواب نے بھائی کو رنجیدہ دیکھ کر اس کی نسبت پاس کی ایک چھوٹی سی

ریاست کے رئیس کی چچازاد بہن سے کردی اور دو مہینے بعد شادی بھی۔ جمشید کی دلہن خوبصورت بھی تھی اور تعلیم یافتہ بھی۔ جمشید اب دو بچوں کا باپ تھا اور سینٹ گرلز کی فوج کا کماندار بھی۔ اس کی زندگی اچھی خاصی خوش گزر رہی تھی۔

ریاست کے کسی کام سے نواب نے بھائی کو دلی بھیجا۔ ٹھیرا جمشید ہوٹل میں۔ مگر دوسرے روز منور مرزا سے ملنے گیا تو منور دلہن نے اس سے شکوہ کیا۔ "اپنا گھر ہوتے تم ہوٹل میں کیوں ٹھیرے؟"

منور مرزا نے بھی بہت اصرار کیا۔ اور اس کا اسباب ہوٹل سے فیروز کو بھیج کر منگوالیا۔

اتفاق کی بات کہ دو دن بعد جمشید کو زکام ہوا اس نے اس کی پروا نہیں کی اور حسب معمول غسل کیا۔ کپڑے پہنتے پہنتے ہی طبیعت زیادہ گرستہ گی اور دو گھنٹے بعد ہی خاصا بخار ہو گیا۔ منور دلہن نے جمشید کا اتنا خیال کیا اور ایسی تیمارداری کی کہ وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ان کی محبت میں ماں کے پیار کا انداز تھا۔ جمشید کو قدرت نے تین سال کی عمر میں ہی شفقت مادری سے محروم کردیا تھا۔ شادی ہوئی تو ساس بھی نہیں ملیں۔ منور دلہن کے برتاؤ میں اس کو ماں کا رنگ نظر آیا۔ وہ اس لئے وہ آیا چند دن کے لئے تھا، لیکن دن گزرتے رہے اور اس نے جانے کا نام نہیں لیا۔

منور مرزا کی چھوٹی لڑکی عباسہ پندرہ سال کی گندمی رنگ اور معمولی ناک نقشے والی لڑکی تھی اس کی صورت میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ مگر سمجھ دار سگھڑ ماں کی بیٹی تھی، اس کے رکھ رکھاؤ اور شائستگی پر رنگین مزاج جمشید فریفتہ ہو گیا۔

دلی آئے اسے پورا مہینہ گزر گیا اور وہ نہ گیا تو نواب نے ارجنٹ تار

بھیج کر بلایا۔ جمشید نے سورج گڑھ پہنچتے ہی بھاوج سے کہا۔ "میری شادی آپ عباسہ سے کرا دیجئے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

عذرا حیران ہو کر بولی۔ "ہوش کی باتیں کرو جمشید! تمہاری بیوی اور بچے موجود ہیں، میری بہن کا نام لینے کی تم کو جرأت کیسے ہوئی؟"

جمشید نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بھابی خدارا میرا دل نہ توڑیئے۔ آپ ہی اس طرح بے رخی کریں گی تو پھر کون میری سُنے گا۔ یہ شادی تو میں نے سرکار کی خوشی کے لئے کر لی ورنہ مجھے اس پھوہڑ عورت سے کبھی بھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

عذرا نے کہا۔ "تم نے اپنے بھائی سے بھی ذکر کیا؟"

جمشید اس کے قدموں پر جھک کر بولا۔ "اے میری بھابی، میں بھلا سرکار کے سامنے کیسے یہ کہوں، اسی لئے تو میں آپ کو اپنا وکیل بنا رہا ہوں۔"

عذرا۔ "واہ بھئی، میری بہن کا ذکر اور میں ہی کروں، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔"

جمشید نے کہا۔ "اچھا یہ تو آپ کر سکتی ہیں کہ میرا خط سرکار کو پہنچا دیں۔ اور وہ آپ سے صلاح لیں تو آپ میری حمایت میں بولیں۔"

عذرا نے روکھے منہ سے جواب دیا۔ "تم خط دیدو، خیر، میں دے دوں گی اور جیسا موقع ہوگا ایسی ہی بات کر دوں گی۔ تمہاری مدد کرنے کا میں وعدہ نہیں کرتی۔"

جمشید نے خط بہت طویل لکھ کر بھاوج کو دیدیا۔ عذرا نے نواب کو بھجوا دیا۔ وہ شام کو مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئے اور مسرور لہجے میں کہا:-

"اجن ڈارلنگ جمشید عباسہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟"

عذرا نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "کیا بتاؤں میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ بچوں والی بیوی کے ہوتے جمشید اور شادی کریں یہ بالکل مناسب نہیں ہے اور پھر میری بہن سوکن پر آئے، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

نواب چند منٹ سکوت کے بعد بولے۔ "میرے خیال میں تو اس میں کوئی برائی نہیں، عباسہ یہاں آجائے گی تو تمہارا دل بھی بہلا رہے گا اور اس کے یہاں جو اولاد ہوگی وہ تمہارے لئے اپنی اولاد جیسی ہوگی۔"

عذرا نے کہا۔ "اگر آپ ایسا خیال کرتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کرسکتی لیکن ابا میاں شاید ہی شادی عباسہ کی جمشید سے کریں، خیر آپ پیغام بھیج دیجئے۔"

نواب نے باقاعدہ عباسہ کی خواستگاری کا خط منور مرزا کو بھیجا۔ عذرا سے بھی جمشید نے منت خوشامد کرکے منور دلہن کو خط لکھوا دیا۔ پیغام جانے کے دو دن بعد خود بھی تحفے تحائف سے لدے پھندے دلی جا پہنچے۔

منور مرزا عباسہ کو جمشید سے بیاہنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ مگر بیوی نے یہ مشورہ دیا کہ" انجو بی میکے میں ہیں تو کیا ہوا، منصور علی خاں کی دلہن ان کی لائی ہوئی ہیں، اس لئے ان کا خیال بھی زیادہ کرتی ہیں اور نند تو شمیم کی دلہن اور ان کی بھاوج ہے۔ اس لئے بھلا بڑی نند کا خیال کیسے نہ کرے، عذرا کا ساتھ دینے کے لئے سسرال میں کوئی بھی نہیں۔ اگر عباسہ کی شادی جمشید سے ہوجائے گی تو وہ عذرا کا طرفدار رہے گا اور عباسہ کو خدا اولاد دے گا تو عذرا کا پلہ بھی بھاری ہوجائے گا۔"

منور مرزا کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ خاموش ہو گئے۔ مگر منور دلہن ایسی بے وقوف نہ تھیں کہ اتنی جلدی حامی بھر لیتیں۔ انھوں نے جمشید کی خاطر و مدارات تو خوب کی لیکن نواب کو میاں سے یہ کہلوا دیا: "یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اچھی طرح سوچنے کے بعد جواب دوں گا۔"

جمشید دھونی رمائے منور مرزا کے یہاں جمے رہے، ان کو یہاں آئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا، بیوی خطوں کا جواب نہ پا کر پریشان ہوئی تو میکے سے دلی آگئی۔ منور دلہن نے اس سے بھی بہت اچھا برتاؤ کیا اور وہ ان کی محبت سے متاثر ہو کر ان کو اماں اور فیروز کو بھائی کہنے لگی۔ ایک ہفتے دلی رہ کر میاں کو ساتھ لے کر سورج گڑھ گئی۔ پورے دنوں تو تھی ہی، سورج گڑھ پہنچنے کے پانچویں دن اس کے یہاں لڑکا ہو گیا۔ جمشید کو بیوی کا خیال تھا اور نہ بچوں کا۔ اس پر تو عباسہ سے شادی کرنے کی دھن سوار تھی۔ منور مرزا نے چلتے وقت اس سے کہدیا تھا۔ "بھائی تمہاری بیوی بھی ہے اور بچے بھی۔ پہلے مہر کا چالیس ہزار بنک میں جمع کردو۔ پھر میری بیٹی کا نام لینا۔"

جمشید نے بمبئی جا کر جو جائداد ماں کے یہاں سے ترکے میں ملی تھی اس میں سے آدھی پچاس ہزار میں فروخت کر کے بیس روز بعد پھر دلی جا دھمکا۔ چالیس ہزار بنک میں عباسہ کے نام جمع کر کے پاس بک منور مرزا کے حوالے کی۔ ساڑھے چھ ہزار میں کار خرید کر عباسہ کو دی۔

عباسہ اور جمشید کی منگنی ہونے کی خبر کیا کہ سب نے سُنی۔ جو بھی سُنتا حیران رہ جاتا۔ مگر جب ماں باپ شادی کرنے پر تلے ہوئے تھے تو اور لوگ کیا کر سکتے تھے۔ منجھلے صاحب بیٹے پر بہت ناراض ہوئے اور بگڑ کر جودھ پور چلے گئے، چچیوں اور دادی کو منور مرزا بہت خوشامد کر کے لے گئے۔

عذرا نے بہن کی شادی خوب دھوم سے رچائی اور بہت بھاری جوڑے اور قیمتی زیور لے کر آئیں۔ پندرہ دن دلی رہ کر بہن کو بیاہ کر سورج گڑھ لے گئیں۔ نواب نے نئی دلہن کے پہنچنے سے پہلے ہی جمشید کے بیوی بچوں کو میکے بھجوا دیا۔

جمشید نے عذرا کے کہنے پر کچھ دن بعد ہی پہلی بیوی کو طلاق دیدی۔ اس کا مہر بھی کچھ زیادہ نہیں بیس ہزار ہی کا تھا۔ اس کی قسط ریاست سے پانچ ہزار روپے سال مقرر ہوگئی۔ بچوں کو نواب ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بھیج دیتے تھے۔

اب عباسہ کی ازدواجی زندگی میں کوئی خلش باقی نہ تھی۔ وہ میاں کی ناز برداریوں اور بہن کی محبت کی بدولت عیش و آرام کی زندگی گزار رہی تھی۔

مسرت جہاں بھی عذرا کے ساتھ پہلے کی طرح رہتی تھی۔ لیکن نواب کی نظروں میں اب اس پہلی سی وقعت نہیں رہی تھی اور وہ اس کی شوخی اور چلبلے پن پر اکثر اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے، اپنے بے تکلف دوستوں کے علاوہ مسرت کو ہر ایک کے سامنے نہ آنے دیتے تھے اور سیر و تفریح کو بھی وہ عذرا کے ساتھ ہی جاتی یا نواب کے ساتھ ... ریاستی ضیافتوں میں بھی وہ بہت کم شریک ہوتی، مگر تھی وہ بھی آفت کی پرکالہ اس کمسن لڑکی کی چالاکی سے نواب سورج گڑھ جیسے شاطر انسان کی ایک نہ چلتی تھی۔ اس کے تیر بہدف تدابیر ایسے ہوتے کہ وہ مجبور ہو کر رہ جاتے۔ سال بھر سورج گڑھ میں مسرت نے قید و بند کا کسی نہ کسی طرح گزار دیا۔ لیکن جیسے ہی اس نے نواب کی کرسمس پر بمبئی جانے کی خبر سنی اپنے کو بیمار بنا لیا پیٹ کو پکڑ کر وہ گھنٹوں مچھلی کی طرح تڑپتی اور ہائے ہائے کرتی رہتی۔ نواب نے سمجھا کہ معمولی ریاحی درد ہے۔ ریاست کے ڈاکٹر نے ایک ہفتے

تک علاج کیا۔ مگر مسرت کو ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا۔ اور اس نے چیخ پکار سے پورا محل سر پر اٹھا لیا۔ نواب نے جب یہ دیکھا کہ مسرت واقعی کافی علیل ہے تو اس کی چاہت پھر اس کے دل میں اُجاگر ہو گئی اور وہ اس کو علاج کے لئے اپنے ہمراہ بمبئی لے گئے۔ یہی وہ چاہتی تھی۔ عذرا میاں کے ساتھ اس لئے نہیں جا سکیں کہ عباسہ کی طبیعت مہینہ بھر سے ناساز تھی کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا اور اس کو طاقت کے انجکشن دئے جاتے تھے بھلا اس حالت میں بہن کو چھوڑ کر عذرا کیسے جاتی۔ اس نے تو گھبرا کر ماں کو بھی بلا لیا تھا۔

بمبئی پہنچ کر مسرت نے آزادی کا سانس لیا۔ درد کا ڈھونگ تو چار دن بعد ہی اس نے ختم کر دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی اور نواب کے ساتھ سیر سپاٹوں کے لئے ادھر ادھر جانے لگی۔

صورت کی تو تھی ہی اچھی۔ اس پر موزوں بناؤ سنگھار۔ خوبصورت اور اچھے سلے ہوئے زرکار لباس اس کے سبک جسم کی دلآویزی اور صورت کی دلکشی میں اضافہ کر دیتے تھے۔ وہ اپنے سحر کار حسن اور دلربایانہ اداؤں کی وجہ سے بمبئی کی اعلےٰ سوسائٹی میں کافی دلچسپی کا سامان بنی ہوئی تھی۔

ریس میں ہر ہفتے نواب سورج گڑھ جاتے، مسرت بھی ساتھ ہوتی تھی، خدا جانے کیسے اور کس طرح میاں کی نظر بچا کر فریب کار مسرت نے اپنے عشوۂ دلبرانہ سے ایک لکھ پتی سیٹھ کو دیوانہ بنا لیا۔ نہ جانے اس ظالم نے کیا جادو کیا تھا کہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ اس کا شیدا ہو گیا نہ اس کو بیوی یاد رہی نہ بچے۔

نواب سورج گڑھ روز رات کو اس قدر پی لیتے تھے کہ دن چڑھے تک

ان کے حواس درست نہیں ہوتے تھے۔

مسرت کو لاڈ میں آکر انھوں نے ڈرائیو کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ وہ صبح ہی روزانہ بن سنور کر سیٹھ سے ملنے چلی جاتی اور دس بجے کے بعد ہوٹل واپس آتی تھی۔ نواب اس وقت تک بیدار بھی نہ ہوتے تھے۔

اے۔ڈی۔سی کو اتنا حوصلہ نہ تھا کہ چہیتی بیوی کی شکایت نواب سے کرتا۔ اور جتنے نوکر ساتھ آئے تھے، سب کو انعام دے کر اس چالاک لڑکی نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

ایک شام نواب کسی بڑے راجہ کے یہاں ڈرنک پارٹی میں گئے۔ مسرت طبیعت درست نہ ہونے کا بہانہ کئے پلنگ پر لیٹی رہی اور ان کے ساتھ نہیں گئی۔ سیٹھ کے ساتھ کئی دن قبل آج شام کو جانے کا وہ پروگرام بنا چکی تھی۔ نواب کے جاتے ہی ٹیلیفون پر اس کو اطلاع دی۔ وہ آیا تو مسرت اپنے تمام زیورات اور چند اچھی ساڑھیاں سوٹ کیس میں بھر کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی۔

نواب سورج گڑھ رات کے ۹ بجے نشے میں چور واپس آئے۔ انھوں نے آج اس قدر پی لی تھی کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ بہ مشکل اے۔ڈی۔سی اور دونوں خدمتگاروں نے موٹر سے پکڑ کر اتارا۔ شیروانی اور صافہ اتار کر مسہری پر لٹایا۔

صبح حسب معمول وہ گیارہ بجے جاگے۔ لیکن رات کا خمار ابھی باقی تھا۔ نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ ان کے منہ کا مزا بہت خراب تھا اور جسم کسل مند۔ اس لئے بستر پر لیٹے انگڑائیاں جمائیاں لے رہے تھے۔ صبح کا تازہ اخبار اور چائے کی کشتی خدمتگار لے آیا۔ انھوں نے پوچھا بیگم

کہاں ہیں ؟"

وہ ہاتھ باندھ کر بولا ۔" سرکار ! بیگم صاحبہ تو رات کو آپ کے جانے کے ایک گھنٹے بعد اپنے کسی دوست کے ساتھ چلی گئی تھیں ۔ اے ۔ ڈی ۔ سی صاحب سے بول گئی تھیں " ہم اپنی ایک سہیلی کی شادی میں جا رہے ہیں، دیر سے واپس آئیں گے ۔" لیکن جب وہ صبح تک واپس نہیں آئیں تو اے ۔ ڈی ۔ سی ۔ صاحب نے جتنے حضور کے دوست اور ان کے جاننے والے ہیں ، سب جگہ ٹیلیفون کر کے پوچھا ۔ ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ " یہاں وہ نہیں آئیں ۔" اس کے بعد اے ۔ ڈی ۔ سی صاحب کار میں ان کو دیکھنے گئے ہیں ۔ شاید رات شادی والے گھر میں دیر ہو جانے کی وجہ سے رک گئی ہونگی اب تشریف لے آئیں گی ۔"

خدمتگار نے اپنی بات ختم کی تھی کہ اے ۔ ڈی ۔ سی ۔ کمرے میں داخل ہوا ۔ نواب نے گھبرا کر سوال کیا ۔ " بیگم ملیں ؟"

وہ سر جھکا کر بولا ۔ " جی ، وہ کہیں بھی نہیں ہیں ۔"

بیوی کے لاپتہ ہونے سے نواب کا سب نشہ ہرن ہو گیا ۔ تھوڑی دیر تو وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے رہے ۔ پھر خود ان سب جگہ ٹیلیفون کیا ۔ جہاں اس کے جانے کا امکان ہو سکتا تھا ۔ آخر میں ان کو سیٹھ کا خیال آیا ۔ انھوں نے دو دن پہلے اس کو مسرت سے کلب میں سرگوشی کرتے دیکھا تھا اور نواب کے قریب آتے ہی وہ خاموش ہو گیا تھا اور مسرت گھبرا گئی تھی ۔ اس لئے اس کے یہاں بھی فون کر کے پوچھا کہ " سیٹھ صاحب ہیں ؟"

سیٹھ کے سیکریٹری نے جواب دیا ۔ " جی نہیں ، وہ کل رات دو بجے

تجارت کے سلسلے میں امریکہ گئے۔"

نواب نے سمجھ لیا کہ مسرت اس لکھ پتی انسان کے ساتھ ہی فرار ہو گئی۔ اور غصے میں ریسیور پٹخ دیا۔ رنج کے باعث ہونٹ چبانے لگے لیکن خوبصورت چڑیا سنہرے قفس سے نکل گئی تھی۔ اب پچھتانے کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔

قیصر مرزا اسدا کے لااُبالی تھے، بچپن نازونعم لاڈ اور پیار میں گزرا اور جوانی اللّوں تللّوں میں۔

اب ان کی عمر پچپن سال سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ مگر بے راہ روی کا وہی عالم تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی اصول تھا نہ مقصد۔

بیوی سے ان کو کبھی بھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ اور بنو بی کی شادی کے بعد سے تو میاں بیوی مہینوں ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھتے تھے۔ قیصر مرزا کی خوش باش زندگی میں دلبری کے فرار ہونے سے فرق آگیا۔ ان کو نواسی کی اس بے ہودہ حرکت نے بہت رنج پہنچایا۔ جب یہ بُری خبر انھوں نے سُنی تو سر پر ہاتھ مار کر بولے "سارا قصور میری نامعقول بیوی کا ہے۔ اس نے لڑکی کو تربیت بالکل نہیں دی اور بالکل دو کوڑی کا کر دیا۔

بنو بیچاری کی زندگی کیسی اجیرن ہوگئی۔ خدا مجھے اب اس ناہنجار عورت کی صورت نہ دکھائے۔"

یہ کہہ کر وہ مالیر کوٹلے چلے گئے۔

پینے کی لت نوعمری سے ہی ان کو تھی۔ عمر کے ساتھ اس میں اضافہ

ہوتا گیا اور اب رنج اور غصے کی حالت میں انھوں نے بے تحاشا پینا شروع کر دیا۔ نواب مالیر کوٹلہ ان کے کلاس فیلو اور لڑکپن کے ساتھی تھے۔ نواب کی سالگرہ اور شکار کے لئے سردی میں سال میں دو مرتبہ تو مالیر کوٹلے ان کا جانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بھی کوئی تقریب ہوتی یا ان کا جی چاہتا تو بیچ میں بھی مہینے دو مہینے مالیر کوٹلہ رہ آتے۔ اب بھی تین مہینے سے وہ وہیں تھے۔

منجھلے صاحب کو ایک دم نواب کا تار ملا۔ "بھائی قیصر مرزا کو دل کا دورہ ہوا ہے، ان کی حالت نازک ہے، فوراً پہنچئے۔"

منجھلے صاحب پریشان حال ماں کے پاس آئے ان کو بیٹے کی بیماری کی خبر سنائی اور اسی شام مالیر کوٹلہ چلے گئے۔

سکندر زمانی بیگم پوتے کے نام کی دیوانی تھیں۔ قیصر مرزا پیدا ہوئے تو منجھلی بہو پندرہ سال کی الہڑ لڑکی تھیں۔ بھلا کمسن ماں نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال کیا کر سکتی تھیں۔ اس کے تو اپنے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ اس لئے سکندر زمانی بیگم نے چلّے کے بعد سے ہی قیصر مرزا کو اپنے پاس رکھا دودھ تو انا پلاتی تھی، لیکن بچہ رہتا ہر وقت دادی کی نظروں کے سامنے تھا۔ ماں باپ کی مجال نہ تھی کہ قیصر مرزا کو کچھ کہہ سکیں۔ بے انتہا لاڈ پیار کی وجہ سے ہی ان کی عادتیں بگڑ گئیں۔ جو چاہتے کرتے اور جتنا جیب خرچ بھی ملتا سب خرچ کر ڈالتے تھے۔ دادی چہیتے پوتے کے ناز ہر وقت اٹھاتی رہتیں اور کبھی بھی تنبیہہ نہ کرتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر مرزا اوائل شباب میں ہی کھل کھیلے۔ ان کی بے راہ روی کا علاج سکندر زمانی بیگم نے یہ کیا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کی شادی اپنی ماموں زاد بہن کی

اکلوتی لڑکی سے کر دی۔ مگر قیصر مرزا کو جو حسنِ لب بام اور عشوۂ دلبرانہ کے اسیر ہو چکے تھے، بھلا یہ کمسن سشرمیلی سیدھی سادی شکل والی دلہن کیا پسند آتی۔

شادی کے دو چار مہینے بعد ہی وہ حسبِ معمول پھر رنگ رلیاں منانے لگے۔ سکندر زمانی بیگم کو جب بھی معلوم ہوتا کہ پوتے صاحب نئی نویلی دلہن کو تنہا چھوڑ کر رات بھر غائب رہے ہیں بہت کچھ برا بھلا کہتیں۔ کبھی غصّے میں آکر تھپڑ بھی مار بیٹھتیں۔ مگر قیصر مرزا کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ دادی کی تمام ڈانٹ ڈپٹ اس کان سنتے اس کان اڑا دیتے۔

منجھلے صاحب کو بیٹے کی آوارگی پر اگر کبھی غصّہ آتا اور وہ قیصر مرزا پر ناراض ہوتے تو سکندر زمانی بیگم ہمیشہ پوتے کی حمایت لیتیں۔ اور وہ دادی کی چاہت سے مطمئن ہو کر ماں باپ سے لاپرواہ ہوتے چلے گئے۔ اور ان کی زندگی یونہی گزرتی گئی۔ مثل مشہور ہے۔ "پالے کی محبت اولاد سے زیادہ ہوتی ہے۔"

قیصر مرزا کی علالت کی خبر پا کر سکندر زمانی بیگم کے دل کو پنکھے لگ گئے۔ تمام رات وہ سجدے میں پڑی پوتے کی صحت اور سلامتی کی دعائیں کرتی رہیں، صبح ہوتے ہی ان کی آنکھ لگی تو نہ جانے کیا پریشان خواب دیکھا کہ توبہ استغفار کرتی اٹھ بیٹھیں اور وضو کر پھر جانماز پر جا بیٹھیں، دوپہر کو منجھلے صاحب کا تار ملا۔ "رات کو دس بجے ڈیپو سے لیکر میں قیصر مرزا کو پہنچ رہا ہوں۔ اسٹیشن پر پالکی بھیج دی جائے۔"

چھوٹی بہو صاحب صبح ہی رنگ محل آگئی تھیں۔ منور مرزا بھی بمعہ بیوی کے سہ پہر میں آگئے، قیصر دلہن کو لینے کے لئے گلزار کو سکندر زمانی بیگم نے منھ اندھیرے ہی پھلواری بھیج دیا تھا۔

اب پوتے کے انتظار میں سب بے چین تھیں اور "یا حفیظ" کا وِرد کر رہی

تھیں ۔ منور مرزا نو بجے ہی پالکی لے کر اسٹیشن پر چلے گئے تھے ۔ ساڑھے دس بجے خدا خدا کر کے ان کی صورت دکھائی دی ۔ لیکن وہ بہت پریشان سے تھے۔ سب سے کہا ، " آپ لوگ جلدی پردے میں ہو جائیں ۔ پالکی کہار اندر لائیں گے ، آپ کا بھائی بہت کمزور ہیں ۔"

سکندر زمانی بیگم ۔" اللہ میرے بچے کی خیر " کہتی ہوئی اندر گئیں اور بیویاں بھی جلدی جلدی ادھر ادھر ہو گئیں ۔

کہاروں نے بسم اللہ کہہ کر پالکی چبوترے پر پلنگ کے پاس لگا دی ۔ بیہوش قیصر مرزا کو فیروز اور منور مرزا نے پلنگ پر لٹایا ۔ منجھلے صاحب بھی ہانپتے کانپتے جریب کا سہارا لئے کر پکڑے پہنچے ۔ اور بیٹے کے پاس بیٹھ گئے کہار باہر گئے تو بیگمات باہر نکلیں ، سکندر زمانی بیگم نے پوتے کی بلائیں لیں اور ان کے سر پر ہی " یا حفیظ یا سلامتی " کا ورد کرنے لگیں ۔

قیصر مرزا کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا اور دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا ۔ سانس کی خفیف آمد و شد کے علاوہ ان میں زندگی کی کوئی علامت نہ تھی ۔ اس تشویشناک صورتِ حال پہ سب ہی پریشان تھے ، پورے محل پر غم آگیں سکوت چھایا ہوا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد فیروز ڈاکٹر کو لے کر آگیا ۔ ڈاکٹر نے آلہ لگا کر دل اور پھیپھڑوں کا معائنہ کیا ۔ نبض دیکھی اور چند منٹ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا ۔ پھر انجکشن دیا اور کہا ۔" دوسرا صبح دوں گا ۔ مریض بے حد کمزور ہے اور دل کی حالت ٹھیک نہیں ۔ پورے سکون کی ان کو ضرورت ہے ۔ ریل کا سفر ایسی نازک حالت میں بہت نقصان کا باعث ہوا ۔

منور مرزا دروازے تک ڈاکٹر کو پہنچانے گئے ۔ ان سے اس نے کہا :

"میں نے صرف گلوکوز کا انجکشن فرحت پہنچانے کے لئے دیدیا ہے، ورنہ اب مریض میں کچھ باقی نہیں ہے۔ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔" شراب کے بے انتہا استعمال کی وجہ سے پھیپھڑے دونوں بالکل ختم ہو گئے ہیں اور دل بھی کمزور ہو گیا ہے۔ کوئی دوا بھی قبول کرنے کی ان کے جسم میں صلاحیت باقی نہیں رہی، صبح تک بھی شاید ہی وہ لے سکیں۔"

منور مرزا آبدیدہ واپس آئے۔ باپ سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش بھائی کے قریب بیٹھ گئے۔

سکندر زمانی بیگم نے گلاب کے عرق میں خمیرہ مرواریدگھول کر بہ مشکل چند چمچے قیصر مرزا کے حلق میں ڈالے۔ کچھ دیر بعد خدا جانے انجکشن کے اثر سے یا خمیرۂ مروارید کی وجہ سے قیصر مرزا کو ہوش آ گیا۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں تو اپنی پیاری دادی کو اپنے سامنے پایا۔ اور داہنا ہاتھ اُٹھا کر دادی کی گود میں رکھ دیا۔ وہ پیار بھرے لہجے میں بولیں۔" میں صدقے اماں اب جی کیسا ہے؟"

قیصر مرزا نے نحیف آواز میں آہستہ سے کہا۔ اس وقت تو طبیعت بحال ہے۔"

منور مرزا نے تھوڑے سے دودھ میں گلوکوز ملا کر فیڈنگ کپ سے پلایا۔ قیصر مرزا نے یہ پی لیا۔ اور تھوڑی دیر بعد سو گئے۔ سکندر زمانی بیگم نے بیٹے سے کہا۔" منجھلے اب تم بھی آرام کرو، دو دن سے تھک رہے ہو۔ اللہ فضل کرے گا۔ قیصر کی طبیعت انشاء اللہ سنبھل گئی ہے، آرام ملے گا تو حالت اور بہتر ہو گی۔

منور مرزا بولے۔" ہاں اماں جان۔ آپ لیٹ جائیے۔ آغا بھائی کے

سرہانے میں بیٹھا ہوں۔"

منجھلے صاحب قریب ہی پلنگ بچھوا کر لیٹ گئے۔ تکیئے پر سر رکھتے ہی وہ نیند سے غافل ہو گئے۔ سکندر زمانی بیگم بھی آرام کرسی پہ بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

منور مرزا کو معلوم تھا کہ بھائی اس دنیا میں کچھ دیر کا مہمان ہے۔ وہ حسرت سے ان کی صورت تک رہے تھے۔ اپنی بیوی کو انھوں نے بتا دیا تھا کہ "آپ کا بھائی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ چھالیہ کا کٹنا لئے تختوں پہ بیٹھی تھیں۔

قیصر مرزا اپنے آخری سانس پورے کر رہے تھے۔ صبح چار بجے ان کا سانس تیزی سے چلنے لگا اور گلے میں خرخر ہونے لگی۔ منور مرزا تمام رات جاگتے رہے تھے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نے ابھی ان کو غافل کیا تھا، بیوی نے ان کو ہوشیار کیا تو وہ گھبرا کر بھائی پہ جھکے، نبض دیکھی تو غائب۔ دادی کو آواز دی۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھیں۔ اور پوتے کو دیکھنے لگیں۔ منور مرزا اب با آواز بلند لیٰس شریف پڑھ رہے تھے۔ لیٰس کے ختم ہوتے ہی قیصر مرزا نے ایک گہرا لمبا سانس لیکر اس دنیا سے منھ موڑ لیا۔

سکندر زمانی بیگم دیکھتی ہی رہ گئیں اور ظالم موت نے اس پوتے کو بھی جو ان کے شکستہ دل کے لئے بہت بڑا سہارا تھا چھین لیا۔ ان کا سارا ضبط اور صبر ان کو جواب دے گیا۔ وہ مرغِ بسمل کی طرح قیصر مرزا کی لاش کے سامنے لوٹ رہی تھیں۔ ان کے رونے کی آواز سے منجھلے صاحب اور سب بھی جاگ گئے۔

قیصر دلہن معہ ستارا کے چھ بجے صبح پہنچ گئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے روٹھے ہوئے شوہر کی لاش ہی دیکھی۔ اور رنگین دوپٹہ میاں پر ڈال کر وہ

بین کرنے لگیں۔

قیصر دلہن کو زیور اتارتے اور چوڑیاں توڑتے دیکھ کر سکندر زمانی بیگم بے ہوش ہوگئیں۔ ان جیسا بدنصیب بھی خدا کسی کو نہ کرے۔ پیدا نواب کے گھر ہوئیں۔ مگر بیوہ ہونے کے بعد دل کا سکون غارت ہوگیا۔ بچے جوان ہوئے بال بچے والے ہوئے تو ان کا خیال ذرا بٹا تھا۔ لیکن دو بیٹے اللہ کے یہاں سدھارے، منجھلے کا گھر اجڑا۔ دکھیا بیگم نے یہ غم بھی سہار لیا۔ اب پوتے کی موت نے ان کا کام تمام کر دیا۔ آخر تو انسان تھیں ان کا دل پتھر تو نہیں تھا طبیعت اتنی بگڑی کہ سب مرنے والے کو بھول کر سکندر زمانی بیگم کی جانب متوجہ ہوگئے۔ حکیم صاحب کو بلا کر دکھایا انھوں نے کہا کہ "دل پر سخت صدمہ ہے اس لئے ان کا یہ حال ہے۔ ضعیفی میں اتنے بڑے غم کو ان کا کمزور دل برداشت نہیں کر سکتا۔

قیصر مرزا کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر سب واپس آ گئے۔ مگر سکندر زمانی بیگم کی طبیعت نہیں سنبھلی، وہ کچھ دیر کے لئے ہوش میں آتیں اور پھر بے ہوش ہوجاتیں۔ حکیم اور ڈاکٹر کی متفقہ رائے تھی کہ ان کے دل کی حالت نازک ہے چھمو عظمن بڑی دلسوزی سے ان کی تیمار داری کر رہی تھیں۔ منور دلہن بھی دادیا ساس کے قریب ہی بیٹھی رہتیں۔ بڑی بہو صاحب اور چھوٹی بہو صاحب پر دوہری ذمہ داری تھی۔ قیصر مرزا کی تعزیت کو آنے والیوں سے پُرسا بھی لیتیں، قیصر دلہن کی دلدہی بھی کرتیں اور ساس کا خیال بھی۔ ہر وقت کی دیکھ بھال اور اچھے علاج کے باعث سکندر زمانی بیگم کی طبیعت دو دن بعد ذرا سنبھلی۔ مگر دل کے غم کا علاج کیا ہوتا۔ حواس درست ہوتے ہی انھوں نے پھر پوتے کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ اپنی زندگی اب مجھے اجیرن

ہوگئی ہے، قیصر کی موت سے میرے سارے زخم ہرے ہوگئے۔ کس کس کو صبر
کروں اور کب تک زندہ رہوں۔ اے اللہ، ساتھ ایمان کے تو مجھ کو
اب اُٹھالے۔ اب اور کوئی غم دیکھنے کی میرے دل میں بالکل طاقت نہیں،

خدا نے اس نیک غمزدہ بیوی کی دُعا سُن لی۔ قیصر مرزا کے بیسویں
فاتحہ کے دن ان کو دل کا دورہ پھر پڑا اور دو گھنٹے بعد ہی وہ ختم ہوگئیں
ادھر سورج ڈھلا۔ ادھر رنگ محل کا چاند ڈوب گیا۔